یادگار حضرت مولانا مفتی عتیق الرحمن عثمانی

ہماری مطبوعات
عثمان ذوالنورین
ترجمان السنۃ
ندوۃ المصنفین دہلی

سرپرست اعلیٰ

عالیجناب حکیم عبدالحمید
چانسلر
جامعہ ہمدرد

نگران اعلیٰ

حضرت مولانا حکیم محمد زماں حسینی

مدیر اعزازی

قاضی اطہر مبارکپوری

جنوری تا مارچ سنہ ۱۹۹۶ء

برہان

جلد ۱۱۸ شمارہ ۱،۲،۳

اس شمارے میں

دفتر رابطہ
Nadwatul-Musannefeen
4136, Urdu Bazar, Jama Masjid, Delhi-110006

نظرات

پارلیمنٹری انتخابات کی آمد آمد ہے اور لیڈروں و پارٹیوں کے عوام کو لبھانے والے وعدوں نعروں، پروگراموں اور ملک و قوم کی فلاح و بہبودگی پر مبنی منصوبوں کا شور گونجنے لگا ہے کوئی لیڈر و پارٹی تو مذہبی نعروں کے ساتھ میدانِ سیاست میں کودنے کے لئے پر تول رہی ہے اور کوئی لیڈر و پارٹی عوام الناس کی غریبی و بے روزگاری کا خاتمہ کرنے کے لئے میدانِ عمل میں کودنے کے لئے بے قابو ہے۔ لیکن عوام ابھی خاموش ہیں اور وہ تماش بین کی حیثیت سے اس بات کا جائزہ لینے پر آمادہ ہے کہ کون سی پارٹی یا لیڈر ایسا ہے جو عوام کی فلاح و بہبودگی کے لئے حقیقتاً اپنے دل میں درد لئے ہوئے ہے اور سنجیدگی کے ساتھ اسے عوام الناس کے مسائل حل کرنے کا جذبہ ہے۔

ہم سمجھتے ہیں کہ ۱۹۹۶ء کا پارلیمنٹری انتخاب کئی معنوں میں اہم ہوگا سب سے بڑی [illegible] بات اس انتخاب سے پہلے یہ سامنے آئی ہے کہ سپریم کورٹ نے "ہندوتو" کے کارڈ کھیلنے پر ایک طرح سے چھوٹ دیدی ہے۔ مہاراشٹر کے چیف منسٹر کے خلاف ایک انتخابی عذر داری پر اس نے یہ فیصلہ دیا ہے کہ لفظ "ہندوتو" کا استعمال الیکشن کے موقع پر قطعاً خلاف ورزی نہیں ہے۔ جس سے اب لفظ "ہندوتا" کو الیکشن کے موقع پر خوب زور و شور کے ساتھ استعمال کو کوئی روک نہیں سکتا ہے۔ اور مہاراشٹر کے وزیر اعلیٰ کے انتخاب کو اس بنیاد پر کہ انہوں نے اپنے انتخابی پروپیگنڈہ میں اس لفظ کا بہت ہی زیادہ استعمال کیا تھا، رد کرنے سے انکار کر کے ایک طرح سے اس لفظ "ہندوتو" کی حوصلہ افزائی ہی کی ہے۔ جس پر کمیونسٹ پارٹیوں نے بُرا منایا ہے لیکن ان کے بُرا ماننے سے کیا ہوتا ہے جب کہ خود عدلیہ نے اس پر اپنی پسندیدگی کا اظہار کر دیا ہے تو پھر اب کسی کے چاہنے نہ چاہنے سے ہوتا کیا ہے اور جہاں تک ہمارے اظہار خیال کا تعلق ہے تو ہم اس موقع پر عدلیہ کو سراہیں گے کہ اس نے اس پر

ہندوا ٹھا دیا ہے کہ جو کرو کھلم کھلا کرو اگر بھارتیہ جنتا پارٹی یا کوئی دوسری ہندو جماعت اس ہندوتو کی دہائی دیتی ہے تو اس میں بُرا ماننے کی بات کیا ہے اور کیا یہ حقیقت نہیں ہے کہ اب تک ہندوستان پر جس پارٹی نے بھی حکمرانی کی ہے اس نے پردہ کی اوٹ میں ہندوتو کی عملاً خدمت کی ہے اور اس نے منہ سے تو سیکولرازم کا ڈھنڈورہ پیٹا مگر پس پردہ وہ سب کچھ کیا جس سے ہندوتو کی ہر طرح مدد ہوتی ہے۔ چاہے آپ نصابی کتابوں کا مطالعہ کریں چاہے تاریخی دستاویزات کی ورق گردانی کریں۔ سب ہی جگہ "ہندوتو" کی خدمت ہوتی دکھائی دیتی ہے۔ شاہراہ عام پر بھی "ہندوتو" ہی کا پرچم بلند رکھا گیا۔ سرکاری تقریبات بھی "ہندوتو" ہی کے نظریہ سے منعقد ہوتی رہی ہیں۔ ریزرو بینک کے مین گیٹ پر دونوں طرف جو بھاری بھرکم مورتیاں نصب ہیں وہ کیا "ہندوتو" کے نظریہ کی عکاسی نہیں کرتی ہیں؟ زبان سے کچھ کہو اور عملاً کچھ اور ہی کرو یہ کب تک ہوتا اچھا ہوا کہ سپریم کورٹ نے لفظ "ہندوتو" پر اپنا فیصلہ سنا کر اس پر سے شک و شبہ کے سارے ہی غلاف اتار پھینک دیئے۔

۱۹۹۶ء کا پارلیمنٹری انتخاب کے پیش نظر اب کچھ جماعتیں، بابری مسجد کا اشو لیکر سامنے آ رہی ہیں۔ کچھ ناعاقبت اندیش مسلمانوں نے ۶ر دسمبر کو بابری مسجد میں نماز ادا کرنے کا شوشہ چھوڑا۔ ان کی طرف سے اعلان کیا گیا کہ ۶ر دسمبر کو بابری مسجد میں نماز ادا کی جائے گی۔ انھیں معلوم ہے کہ وہاں مسجد ہے ہی نہیں اب وہاں پر مندر بنا ہوا ہے۔ پھر کوئی ان سے پوچھے کہ آپ نماز کہاں ادا کریں گے؟ اور جب انھیں یہ بھی معلوم ہے کہ اعلان کرکے وہ وہاں تک پہونچ ہی نہیں سکتے ہیں تمام راستے سیل کرکے انھیں راستے ہی میں روک کر واپس کر دیا جائے گا پھر اس قسم کے اعلانات سے انھیں کیا حاصل ہوگا۔ سوائے اس کے کہ سادہ لوح مسلمانوں کے دل میں انھیں کسی قدر مقبولیت حاصل ہو جائے گی، مگر اس سے نہ تو بابری مسجد کا کوئی مسئلہ ہی حل ہوگا بلکہ الٹا بابری مسجد کے کاز کو نقصان پہنچے گا اور ان لوگوں کو تقویت حاصل ہوگی جو بابری مسجد کے انہدام کے ذمہ دار ہیں۔ اور جو وہاں ایک عظیم الشان رام مندر بنانے پر تلے ہوئے ہیں۔ پنجاب میں کتنی ہی ایسی مساجد ہیں جو یا تو تباہ حال ہیں یا گوردوارہ میں تبدیل ہو چکی ہیں اور یا جو رہائش گاہ کے طور پر استعمال میں لائی جا رہی ہیں۔ دہلی میں ایسی کئی مساجد اب بھی ہیں جہاں نماز نہیں ہوتی ہے، ان کم بخت لیڈروں نے

کبھی ان مساجد کی طرف بھی اپنی توجہ مرکوز کی۔ ان مساجد کی بازیابی کے لئے انہوں نے اب تک کوششیں کیوں نہیں کیں۔ صاف ہے کہ ان مساجد سے انھیں وہ "فوائد" حاصل نہیں ہو سکتے جو صرف ایک بابری مسجد کے نام پر حاصل ہو جائیں گے۔ یہ کس قدر افسوس کا مقام ہے کہ کچھ لوگوں نے بابری مسجد کی آڑ میں اپنی لیڈری کو چلانے یا قائم کرنے کا ذریعہ بنایا ہوا ہے۔ عام مسلمانوں کو ایسے لیڈروں سے ہوشیار رہنا ہوگا کیونکہ اس سے بابری مسجد کی حصولیابی کے بجائے ملت اسلامیہ کے لئے نقصانات ہی نقصانات زیادہ دکھائی دے رہے ہیں۔

تازہ حالات و واقعات اس بات کا اشارہ کر رہے ہیں کہ ۱۹۹۶ء کے پارلیمنٹری انتخابات میں جو جماعتیں سیکولرزم کی دہائی دے رہی ہیں ان میں اتحاد و اتفاق کا فقدان ہے جس کی وجہ سے "ہندوتو" کی دہائی دینے والی جماعتیں ہی فائدہ میں رہیں گی۔ ابھی حال ہی میں یوپی کے بلدیاتی انتخابات میں رائے دہندگان نے جس نئے سیاسی رجحان کا اظہار کیا ہے وہ واقعی سوچنے کی بات ہے۔ اور اس سے مستقبل کے پارلیمنٹری انتخابات کے رجحان کا اندازہ لگانا کوئی مشکل بات نہیں ہے۔ بھارتیہ جنتا پارٹی نے میئر کی ۱۱ سیٹوں میں سے ۸ پر اپنا قبضہ جما کر یہ بات صاف کر دی ہے کہ وہ ہی یوپی میں آئندہ انتخابات میں بازی مارے گی۔ جنتادل، سماج وادی پارٹی، بہوجن سماج پارٹی کانگریس (آئی) کانگریس (تیواری) سب الگ الگ خیموں میں بٹی ہوئی ہیں۔ جسکی وجہ سے سیکولر ووٹوں کی تقسیم پر تقسیم ہوگی اور ہندوتو کے نام پر ووٹ مانگنے والی جماعت اپنے غیر منقسم ووٹ کے بل بوتے پر کامیابی حاصل کر کے اقتدار کی دہلیز پر پہنچ ہی جائے گی اس وقت یہ ساری جماعتیں جو سیکولرزم کی رٹ لگا رہی ہیں اپنی قسمت پر ماتم پرسی کرنے کے علاوہ کچھ نہ کر پائیں گی۔ ہمارے خیال میں یہ یوپی کے بلدیاتی الیکشن ایک طرح سے ان جماعتوں کے لئے آنکھیں کھولنے کے لئے ایک نیک شگون بھی ہو سکتے ہیں یہ جو انھیں اپنی کامیابی کا زعم تھا کہ سیکولرزم کے نام پر ہم کو اقتدار کی دہلیز پر پہنچنے میں کوئی پریشانی نہیں اٹھانی پڑے گی یوپی کا بلدیاتی الیکشن ان کے اس زعم غرور و تکبر کو چکنا چور کر دے تو ہم یوپی کے بلدیاتی الیکشن پر اپنی خوشی و مسرت کا اظہار کئے بغیر نہ رہیں گے کہ اس سے یہ تو فائدہ ہوا کہ سیکولرزم والی جماعتیں خواب غفلت سے بیدار ہو گئیں اور اچھی تدبیر و...

کوششوں کے ساتھ ۱۹۹۶ء کے پارلیمنٹری انتخابات میں اتریں گی لیکن اگر خدانخواستہ یوپی کا ضمنی اسمبلی الیکشن بھی ان کے زعم غرور و تکبر کا خاتمہ نہ کر سکا اور اس کے معنی انہوں نے دوسرے ہی طریقے سے کرنے چاہے تو پھر یہ بات یقینی ہے کہ ۱۹۹۶ء کا پارلیمنٹری انتخاب بھارت کی تمام سیکولر جماعتوں کو ہمیشہ کے لئے موت کی نیند سلا دیگا۔

اس وقت ہندوستان میں عوام کے سامنے سب سے اہم مسئلہ بے روزگاری مہنگائی اور تعلیم ہے مگر کوئی بھی جماعت ان اہم مسائل پر ابھی توجہ مبذول نہیں کرتی ہے۔ مہنگائی بے روزگاری اور ناخواندگی کو ختم کرنے کے لئے کون سی جماعت ہے جو کہ لنگوٹ کس کر میدانِ عمل میں اترے گی ہمیں تو دور دور تک ایسی کوئی جماعت دکھائی نہیں دیتی ہے سب ہی جماعتیں مندر مسجد کے نام پر ووٹ مانگتی دکھائی دیتی ہیں کوئی بابری مسجد کی تعمیر نو کا وعدہ کرے گی اور کوئی رام مندر کو ہر قیمت پر وہیں پر بنانے کا عہد کرتی نظر آئے گی۔ اور اب متھرا اور کاشی بھی انتخابی مینوفیسٹو میں نمایاں نظر آئے گا کوئی متھرا اور کاشی کی بازیابی کے لئے دہائی دے گی اور کوئی متھرا کاشی کی مخالفت کرتی دکھائی دے گی۔ یہ بیچاری اقلیت بھی کیسی قسمت لیکر ہندوستان میں پیدا ہوئی ہے جو ہے اسی پر مشق ستم روا رکھے ہوئے ہے۔ کوئی اس کی ہمدردی کا دعویٰ کرتی ہے اور کوئی اسکی منہ بھرائی پر ناک بھنویں چڑھاتی دکھائی دیتی ہے۔ یہاں بھی اور وہاں بھی سب ہی جگہ یہ چکی کے دو پاٹوں میں پسی ہوئی ہے۔ خدا ہی اس پر رحم کرے گا۔ کیا ہی اچھا ہو ہندوستان کی یہ سیاسی جماعتیں جذباتی و مذہبی کھوکھلے نعروں و وعدوں کے بجائے عوام کے بنیادی و حقیقی مسائل بے روزگاری مہنگائی اور ناخواندگی کی طرف ہی اپنی تمام تر توجہ لگا کر ان کا سدّباب کرنیکی کوششیں کریں۔

معذرت و اپیل قارئین کرام و ہمدردان برہان بڑے افسوس کے ساتھ ادارہ آپ سے معذرت خواہ ہے کہ دفتر برہان میں پچھلے مہینوں اچانک آگ لگ جانے سے ضروری ریکارڈ اور رسالہ برہان کے مسودے جل کر راکھ ہو گئے۔ جسکی وجہ سے متواتر کئی شمارے آپ تک نہ پہونچ سکے۔ جس کے لئے ادارہ معذرت خواہ ہے۔ اور خصوصاً اہل قلم حضرات سے درخواست ہے کہ جلد از جلد مضامین ارسال کر کے ادارہ کے ساتھ تعاون فرمائیں تاکہ رسالہ مستقل طریقے سے وقت پر شائع ہونے لگے۔ —— (ادارہ)

فقہی اور فروعی اختلافات کے اسباب

افادات

حضرت شاہ ولی اللہ محدث دہلوی

مترجمہ

(مولوی ضیاء الدین صاحب اصلاحی)

فقہ اسلامی کے دورِ اول ہی سے جو اختلافات چلے آرہے ہیں ان کو دیکھ کر ہمارا روشن خیال اور تجدد پسند طبقہ اسلام پر نہایت ہی رکیک قسم کے الزامات عائد کرنے کی کوشش کر رہا ہے حالانکہ یہ جزئی اختلافات ایک بالکل فطری اور ضروری امر ہے اور یہ اختلافات درحقیقت مذموم نہیں ہیں بلکہ وہ رقابت اور آپس کی چشمک مذموم ہے جس کا ابتدائی دور میں کہیں نام و نشان بھی نہ تھا اور جس نے چوتھی اور پانچویں صدی ہجری میں جنم لے کر امتِ مرحومہ کو گھن کی طرح کھانا شروع کر دیا اس لئے ہم نے مناسب سمجھا کہ اسبابِ اختلافات پر تفصیل کے ساتھ بحث کریں اور چوں کہ حضرت شاہ ولی اللہ دہلویؒ کو تمام علومِ اسلامیہ میں درک و مہارت حاصل ہے اور وہ اسرارِ شریعت کے بہت بڑے عالم اور نکتہ داں ہیں اور یہی وجہ ہے کہ انھوں نے اپنی کتابوں میں ہر ہر موضوع پر قلم اٹھایا ہے اور یہ واقعہ ہے کہ ان کا قلم ہر ہر مسئلہ پر جس خوبی و صفائی کے ساتھ روشنی ڈال سکتا ہے وہ کسی اور کے بس کی بات نہیں اس لئے ہم انھیں کے افکار و خیالات ان کی مشہور اور معرکۃ الآرا کتاب "حجۃ اللہ البالغہ" سے درج کر رہے ہیں ۔

داستانِ عہدِ گل را از نظیری باز پرس ۔۔۔ عندلیب آشفتہ تر گوید ازیں افسانہ را

اور یہ فقہی اختلافات چوں کہ صحابہ اور تابعین ہی کے زمانہ سے چلے آرہے ہیں اس لئے اس مضمون میں انھیں کے اسباب اختلاف کا تذکرہ کیا جا رہا ہے اس کے بعد شاہ صاحب

فقہاء کے اختلافات بھی بیان فرماتے ہیں۔ سردست ہم اسی فصل کے ترجمہ پر اکتفا کر رہے ہیں کیوں کہ اس سے اختلافات کے اصلی وجوہ کا بخوبی سراغ لگایا جا سکتا ہے۔

یہ تو معلوم ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے عہدِ مبارک میں فقہ آج کی طرح مدون نہ تھی اور نہ فروعی احکام و مسائل میں فقہاء کے طریقہ بحث و نظر کی طرح وہاں بحثیں ہوتی تھیں اس لئے کہ فقہاء ارکان، شروط اور آداب وغیرہ کو دلائل کے ساتھ بیان کرتے ہیں اور مختلف صورتیں فرض کر کے ان مفروضہ صورتوں پر مسائل کا استخراج و استنباط کرتے ہیں، حالانکہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ میں جب آپ وضو کرتے تو صحابہ بھی بغیر رکن و ادب کو معلوم کئے ہوئے اسی طریقہ کو اختیار کر لیتے، آپ کو جس طرح نماز پڑھتے اور حج کرتے ہوئے دیکھتے اسی طرح خود بھی پڑھتے اور کرنے لگتے۔ اکثر یہی حال دوسرے معاملات میں بھی ہوتا تھا چنانچہ آپ نے وضو میں چار یا چھ فرائض ہونے کی کوئی تعیین نہیں فرمائی ہے اور نہ بغیر موالاۃ کے وضو کرنے کے متعلق وضو کی صحت یا فساد کا فیصلہ صادر فرمایا ہے الا ماشاء اللہ۔

اور خود صحابہ کرام بہت کم رسول اکرمؐ سے سوالات کیا کرتے تھے، عبداللہ بن عباسؓ سے روایت ہے کہ انھوں نے فرمایا:-

مارأیت قوماً خیراً من اصحاب رسول اللہ، سألوہ عن ثلاث عشرۃ مسألۃ حتی قبض کلھن فی القرآن منھن (یسألونک عن الشھر الحرام قتال فیہ الخ) و (یسألونک عن المحیض) قال ماکانوا یسألون الا عما ینفعھم

میں نے رسول اللہ کے ساتھیوں سے زیادہ بہتر لوگ نہ دیکھے انھوں نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے صرف تیرہ سوالات کئے تھے کہ آپ کا انتقال ہو گیا جن میں سے سب کا ذکر قرآن میں موجود ہے مثلاً (یسألونک عن الشھر الحرام) اور (یسألونک عن المحیض)۔ ابن عباس فرماتے ہیں کہ صحابہ آنحضرت سے

صرف ضروری اور مفید باتوں کے متعلق سوال کرتے تھے۔

حضرت عبداللہ بن عمرؓ کا ارشاد ہے :-

"تم لوگ ایسی باتوں کے متعلق سوالات نہ کرو جو ابھی پیش نہ آئی ہوں، کیوں کہ میرے باپ (حضرت عمر) اس طرح کے لوگوں کو لعنت ملامت کیا کرتے تھے جو ان باتوں کو پوچھتے تھے جو ابھی تک نہ ہوئی ہوں"

قاسم فرماتے ہیں :-

"تم لوگ ایسی باتیں پوچھا کرتے ہو جن کے متعلق ہم لوگ نہیں پوچھا کرتے تھے اور تم لوگ ان باتوں کی کرید کرتے ہو جن کی ہم کرید نہیں کرتے تھے، تم لوگ ایسی چیزیں پوچھتے ہو جن کا مجھے کوئی علم نہیں اور اگر علم ہوتا تو میرے لئے ان کا کتمان جائز نہ ہوتا"

عمر بن اسحاق کا بیان ہے :-

"جن صحابہ کو میں نے دیکھا وہ ان سے کہیں زیادہ ہیں جنہیں میں نے نہیں دیکھا (یعنی جو مجھ سے پہلے مرگئے) تو میں نے صحابہ سے زیادہ آسان سیرت اور کم شدت پسند کسی کو نہیں دیکھا"

اور جب بن اسحاق سے ایک ایسی عورت کے بارہ میں سوال کیا گیا جس کی موت ایسی جماعت کے اندر ہوئی جہاں اس کا کوئی ولی نہ تھا تو فرمایا کہ :-

"میری آنکھوں نے ان لوگوں (صحابہ) کو دیکھا ہے جو تمھاری طرح شدت پسند نہ تھے اور نہ تمھاری طرح سوالات کرتے تھے"[1]

غرض دورِ نبوی کا حال فقہاء کے زمانہ سے بالکل مختلف تھا، آپ کے زمانہ میں مسائل سے واقفیت کی کم وبیش یہ صورتیں تھیں :-

(۱) پیش آنے والے واقعات میں لوگ آنحضرتؐ سے فتویٰ طلب کرتے اور

---

[1] ان آثار کی تخریج دارمی نے کی ہے۔

آپ ان کو جواب دیتے۔

(۲) کوئی نزاعی معاملہ آنحضرت کی بارگاہ میں بشکل مقدمہ دائر کیا جاتا اور آپ اس کا فیصلہ فرما دیتے۔

(۳) آپ صحابہ کو کوئی بہتر کام کرتے دیکھتے تو اس کی مدح وستائش کرتے اور اگر کوئی ناگوار غلط کام کرتے ہوئے پاتے تو اس پر اظہار ناپسندیدگی فرماتے۔ اور اگر یہ سارے باتیں عام لوگوں کے اجتماعات میں ہوا کرتی تھیں اس لئے سب کو واقفیت ہو جاتی۔

ٹھیک یہی حال شیخین (حضرت ابوبکر وعمر رضی اللہ عنہما) کا بھی تھا کہ انھیں جب کسی مسئلہ میں واقفیت نہ ہوتی تو لوگوں سے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی حدیث معلوم کرنے کی سعی کرتے چنانچہ جب حضرت ابوبکرؓ سے جدہ کے حصہ کے متعلق سوال کیا گیا تو انھوں نے اپنی دعلمی ظاہر کی اور ظہر کی نماز کے بعد صحابہ کو جمع کر کے رسول اکرمؐ کا فرمان معلوم کرنا چاہا۔ تو مغیرہ بن شعبہ رضی اللہ عنہ نے بتلایا کہ رسول اللہؐ نے جدہ کو سُدس (چھٹا حصہ) دیا ہے، حضرت ابوبکرؓ نے مزید اطمینان کے لئے لوگوں سے تصدیق کرانی چاہی تو محمد بن سلمہ نے تصدیق فرمائی۔

اسی طرح حضرت عمرؓ نے غرۃ کے متعلق حضرت مغیرہؓ کی خبر کی طرف اور وباء کے بارے میں حضرت عبدالرحمن بن عوف کی خبر کی طرف رجوع کیا اور جب حضرت ابوموسیٰ اشعریؓ نے ان کے دروازہ پر آ کر اجازت طلب کی اور جواب نہ پا کر چل دئے تو پھر حضرت عمرؓ نے جب ان سے اس کا سبب معلوم کیا تو انھوں نے رسول اللہؐ کی حدیث سنائی لیکن حضرت عمرؓ نے مزید تحقیق کے لئے ایک شہادت طلب کی اور حضرت ابوسعیدؓ نے گواہی دی۔

حضرت عبداللہ ابن مسعود رضی اللہ عنہ نے ایک مسئلہ میں اجتہاد کیا اور حضرت معقل بن یسارؓ نے انھیں بتایا کہ یہی فیصلہ رسول کریمؐ کا بھی ہے تو وہ بہت مسرور ہوئے اور تلاش کیا جائے تو اس طرح کے بہت سے واقعات اور مثالیں صحیحین، اور دوسری کتب

حدیث میں ملتے ہیں۔ اور معلوم ہوتا ہے کہ نبیؐ اور صحابہ کا یہی معمول تھا۔

اب دیکھو کہ ہر صحابی کے لئے جہاں تک ممکن ہوتا وہ آں حضرت صلعم کے عبادت، عادات اور فیصلے دیکھتا، سنتا اور محفوظ کر لیتا اور ہر چیز کی قرائن سے کوئی نہ کوئی توجیہ کرتا مثلاً کسی کو اباحت پر محمول کیا اور کسی کو اپنی عقل کے مطابق قوی دلائل و قرائن سے نسخ پر محمول کیا اس طرح رسول کریمؐ کا مبارک اور مسعود زمانہ ختم ہو گیا اور صحابہ کا یہی طرز رہا لیکن جب وہ ادھر ادھر شہروں میں پھیلے اور مختلف مقامات میں پھیل گئے اور ہر شخص اپنے خطہ کا امام اور مقتدی تسلیم کیا جانے لگا نیز کثرت سے واقعات و حوادث رونما ہونے لگے، مسائل کا دور دورہ ہوا اور صحابہ کے پاس کثرت سے استفسار آنے لگے تو انھوں نے اپنے حافظہ کے بھروسہ پر یا استنباط کے ذریعہ لوگوں کو جوابات دئے لیکن جب کسی مسئلہ میں آنحضرتؐ کی رائے معلوم نہ ہوتی اور کوئی موزوں استنباط بھی نہیں کر پاتے تو اپنی رائے سے اجتہاد کرتے لیکن ان علل و اغراض کو معلوم کرنے میں کوئی دقیقہ باقی نہ رکھ چھوڑتے جس طرح کی علت کو سامنے رکھ کر نبیؐ اسی طرح کے کسی دوسرے مسئلہ میں کوئی حکم صادر فرماتے تھے۔ اس طرح صحابہ کے اندر اختلاف پیدا ہوا جس کی بعض صورتیں یہ ہیں:-

(۱) پہلی شکل یہ ہے کہ کسی صحابی نے رسول اللہ کے کسی فیصلہ یا فتوی کو سنا جسے دوسرے صحابہ نے نہیں سنا تھا تو اس نے اپنی رائے سے اجتہاد کیا، لیکن اس اجتہاد کی کئی صورتیں ہو سکتی ہیں۔

(الف) اجتہاد کرنے والے صحابی کا اجتہاد بالکل فرمان نبوی کے مطابق ہو جائے جیسا کہ نسائی وغیرہ نے روایت کیا ہے کہ ابن مسعودؓ سے ایک ایسی عورت کے متعلق سوال کیا گیا جس کا شوہر مہر کی تعیین سے پہلے ہی مرچکا تھا، مگر انھوں نے یہ کہہ کر ٹال دینا چاہا کہ مجھے اس سلسلہ میں سرور کائنات صلی اللہ علیہ وسلم کا کوئی حکم نہیں معلوم ہے، لیکن لوگ مہینوں آپس میں جھگڑتے رہے اور ان سے اصرار کرتے رہے تو بتایا کہ اسے مہر مثل دی جائے گی

اور حدیث کا ان کے اور روایت میں بھی اس کا حصول ہوا۔ بعد میں حضرت معقل بن یسار نے بتایا کہ خود رسول اکرم نے اسی طرح کے مسئلہ میں ان کے قبیلہ کی ایک عورت کے ساتھ بھی فیصلہ کیا تھا۔ معلوم کر کے عبداللہ بن مسعودؓ کو بے انتہا خوشی ہوئی۔

(ب) دو صحابیوں میں مناظرہ ہو اور حدیث بھی اس فریق کے ساتھ ہو جس کی آ غلبۂ ظن کے موافق ہو تو دوسرا صحابی اپنے اجتہاد کو ترک کر کے سامعی فیصلہ کو اختیار کرے مثلاً ائمہ حدیث نے روایت کیا ہے کہ حضرت ابوہریرہؓ کا مسلک یہ تھا کہ جو صبح کو جنبی ہو کر اٹھے اس کا روزہ معتبر نہ ہوگا، لیکن ازواج مطہرات میں سے کسی نے بتایا کہ حدیث ان کے متبادر مسلک کے خلاف ہے تو انھوں نے اپنے مسلک سے رجوع کر لیا۔

(ج) دو صحابیوں میں مناظرہ ہو اور حدیث غلبۂ ظن کے خلاف ہو تو دوسرا صحابی اپنے اجتہاد کو ترک کرنے کے بجائے حدیث ہی میں اظہار قدح کرنے لگے جیسا کہ اصحاب اصول نے روایت کیا ہے کہ فاطمہ بنت قیس نے حضرت عمرؓ کو بتلایا کہ انھیں تین طلاقیں دی گئیں مگر رسول اللہ نے ان کے لئے کوئی نفقہ اور سکنی نہیں مقرر فرمایا تو حضرت عمرؓ نے ان کی شہادت کو رد کرتے ہوئے فرمایا کہ

لا نترك كتاب الله بقول امرأة	میں ایک عورت کی بات کی وجہ سے خدا کی کتاب
لا ندري أصدقت أم كذبت	کو نہیں چھوڑ سکتا مجھے کیا معلوم کہ اس نے سچ کہا یا
لها النفقة والسكنى	جھوٹ مطلقہ ثلاثہ کو نفقہ اور سکنی ملے گا۔

اور حضرت عائشہؓ نے فاطمہ بنت قیس سے کہا: الا تتقی اللہ (کیا تمہیں اللہ کا ڈر نہیں ہے؟)

اسی طرح کی ایک دوسری مثال کی تخریج شیخین نے کی ہے کہ حضرت عمرؓ کے نزدیک پانی نہ ملنے کی صورت میں بھی جنبی کے لئے تیمم جائز نہیں ہے اور حضرت عمار نے انھیں اپنے ایک واقعہ سے آگاہ کیا اور بتایا کہ وہ رسول اللہ صلعم کے ساتھ ایک سفر میں تھے اور انھیں جنابت لاحق ہو گئی اور پانی نہ ملا تو وہ خاک میں لت پت ہو گئے اور پھر آنحضورؐ کو اپنے واقعہ کی خبر دی

تو آپ نے فرمایا کہ:-

انما کان یکفیک ان تفعل ھکذا	تمہارے لئے تو صرف اتنا کافی تھا کہ اس طرح کرتے
وضرب بیدیہ الارض فمسح	اور آپ نے اپنے دونوں ہاتھوں کو زمین پر مارا اور
بھما وجھہ ویدیہ	ان کو چہرہ اور ہاتھوں پر پھیر دیا۔

لیکن حضرت عمرؓ نے اس حدیث کو قبول نہیں کیا اور ایک مخفی قدح کی وجہ سے ان کے نزدیک اس حدیث سے کوئی حجت نہیں قائم ہو سکتی لیکن یہی حدیث بعد میں متعدد طرق سے مروی ہونے کی وجہ سے مشہور اور مستفیض کے درجہ میں ہو گئی اور لوگوں نے حضرت عمرؓ کے قدح کی پرواہ کئے بغیر حدیث کو اختیار کر لیا۔

(۱) سرے سے کسی صحابی کو حدیث ہی نہ معلوم ہو چنانچہ امام مسلم نے روایت کیا ہے کہ حضرت عبداللہ ابن عمرؓ عورتوں کو حکم دیتے تھے کہ وہ غسل کے وقت اپنی چوٹیاں کھول دیں لیکن حضرت عائشہؓ نے فرمایا کہ ابن عمرؓ کتنی مضحکہ خیز بات فرما رہے ہیں کیوں نہیں وہ عورتوں کو سر ہی منڈانے کا حکم دیتے ہیں تو رسول اللہؐ کے ساتھ ایک ہی برتن سے غسل کرتی تھی مگر تین مرتبہ سے زائد سر پر پانی نہ ڈالتی۔

اس کی ایک دوسری مثال یہ بھی ہے کہ جمہور کے نزدیک طواف میں رمل مسنون ہے اور عبداللہ ابن عباسؓ فرماتے ہیں کہ رسول کریمؐ نے اسے بر سبیل اتفاق ایک عارضی ضرورت کی بنا پر کیا تھا اور وہ عارضی ضرورت یہ تھی کہ مشرکین نے مسلمانوں کو طواف کرتے ہوئے دیکھ کر طنزاً کہا تھا کہ یثرب کی آب و ہوا نے مسلمانوں کو نحیف و زار بنا دیا اور اب جب کہ یہ عارضی ضرورت ختم ہو گئی تو رمل مسنون نہیں رہا۔

(۲) وہم کی وجہ سے بھی اختلاف ہو سکتا ہے مثلاً آنحضرتؐ نے جب حج کیا تو بعض لوگوں نے سمجھا کہ آپ نے تمتع کیا اور بعض نے سمجھا کہ قران یا افراد کیا ہے اس کی دوسری مثال ابو داؤد کی وہ روایت ہے کہ حضرت سعید بن جبیر نے ابن عباس رضی اللہ عنہ سے عرض کیا

کہ مجھے صحابہ کے موقعہ احرام کی تعیین میں اختلافات پر سخت حیرت ہوتی ہے، ابن عباسؓ نے جواب دیا کہ مجھے اس معاملہ میں خوب معلوم ہے چونکہ آپ نے ایک ہی حج کیا تھا اور یہیں سے لوگوں کا اختلاف ہوا ہے کہ جب رسول اللہ حج کرنے چلے تو مسجد ذی الحلیفہ میں نماز پڑھی اور اسی مجلس میں احرام باندھا اور جب دونوں رکعتوں سے فارغ ہوئے تو تلبیہ کہنا شروع کیا یہ واقعہ جن لوگوں کو معلوم ہوا انھوں نے محفوظ کر لیا پھر آپ اونٹنی پر سوار ہو کر چلے اور تلبیہ کہا تو بعض لوگوں نے اس واقعہ کو اخذ کر لیا اور یہ اس لئے کہ لوگ آگے پیچھے ایک دوسرے کے بعد آتے تھے اس لئے انھوں نے موقعہ احرام اسی کو کہا پھر جب آپ شرف بیداء پر چڑھے اور وہاں تلبیہ کہا تو کچھ لوگوں نے یہ سمجھا کہ آپ نے احرام اور تلبیہ یہیں سے شروع کیا ہے حالانکہ بخدا آپ نے احرام مسجد ذی الحلیفہ ہی میں باندھا تھا اور تلبیہ سوار ہوتے وقت اور بیداء پر چڑھتے ہوئے بھی کہا تھا۔

(۳) سہو اور نسیان کی وجہ سے اختلاف پیدا ہو جائے اس کی مثال یہ ہے کہ ابن عمرؓ فرماتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک عمرہ ماہ رجب میں بھی کیا تھا حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کو جب یہ معلوم ہوا تو انھوں نے فرمایا کہ ابن عمرؓ کو سہو ہو گیا ہے۔

(۴) ضبط وحفظ کی وجہ سے اختلاف ہو جائے جیسا کہ ابن عمرؓ یا خود حضرت عمرؓ سے روایت ہے کہ:۔

ان المیت یعذب ببکاء اھلہ علیہ　　یقیناً میت کو گھر والوں کے رونے سے عذاب دیا جاتا ہے۔

حضرت عائشہؓ کو جب معلوم ہوا تو انھوں نے کہا کہ ابن عمرؓ حدیث کو بعینہٖ اخذ نہ کر سکے حالانکہ اصل واقعہ یہ ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم ایک یہودی عورت کی قبر کے پاس سے گذرے جس کے اہل وعیال اس پر گریہ وزاری کر رہے تھے تو آپ نے فرمایا۔

انھم لیبکون علیھا وانھا تعذب　　یہ لوگ اس پر رو رہے ہیں حالانکہ اسے قبر میں

فی قبرھا عذاب دیا جا رہا ہے۔

یہاں ابن عمرؓ کو دو باتوں میں دھوکہ ہو گیا اول یہ کہ وہ عذاب کی علت بکاء کو سمجھ بیٹھے اور دوسرے وہ اس حکم کو ہر میت کے لئے عام قرار دے رہے ہیں۔

(۵) حکم کی علت میں اختلاف واقع ہو مثلاً قیام جنازہ کی علت کچھ لوگ تعظیم ملائکہ کو سمجھتے ہیں اس لئے مومن و کافر ہر ایک کے جنازہ پر قیام کو ضروری مانتے ہیں اور کچھ لوگوں کے نزدیک اس کی علت موت کی ہولناکی ہے اس لئے وہ بھی مومن و مسلم سب کے جنازہ کے لئے عام قرار دیتے ہیں اور حسن بن علی رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ آنحضورؐ ایک یہودی کے جنازہ سے گذرے تو اس کراہیت کی وجہ سے کھڑے ہو گئے کہ جاشا وہ آپ کے سر سے گذر جائے اس لئے ان کے نزدیک یہ قیام صرف کافر ہی کے جنازہ کے ساتھ مخصوص ہے۔

(۶) دو مختلف باتوں کے درمیان جمع و تطبیق کی وجہ سے اختلاف واقع ہو مثلاً آں حضور کریم صلعم نے خیبر کے سال متعہ کی رخصت دی پھر عام اوطاس میں اجازت دی اور پھر اس سے روک دیا لیکن ابن عباسؓ فرماتے ہیں کہ آپ نے رخصت ضرورت کی بناء پر دی تھی اور ممانعت ضرورت کے ختم ہونے کی وجہ سے کی تھی اس لئے حکم رخصت ضرورتاً برقرار رہے گا مگر جمہور کے نزدیک رخصت اباحت کے لئے تھی۔ اور نہی اس اباحت کو منسوخ قرار دے رہی ہے۔

یہ صحابہ کے اختلافات کی مختصر سی تفصیل تھی اور یہیں سے تابعین کے اختلافات کا بھی پتہ لگایا جا سکتا ہے کہ انھوں نے بھی امکان بھر صحابہ سے مسائل سیکھے آں حضرت صلعم کی حدیثوں کو سنا اور مختلف باتوں کے درمیان جمع و تطبیق دی اور بعض اقوال کو بعض پر ترجیح دی، بعض کبار صحابہ کے مسلک کو مشہور حدیثوں کی وجہ سے مرجوح قرار دے دیا کہ جنبی کے تیمم کے مسئلہ میں حضرت عمرؓ اور ابن مسعودؓ کا مسلک اس لئے ان کے نزدیک مرجوح ہے کہ حضرت عمار بن یاسر اور عمران بن حصین کی مشہور حدیثوں کے خلاف ہے۔

——— اس طرح گویا علمائے تابعین میں سے ہر ایک نے اپنی جگہ پر ایک مستقل حیثیت
حاصل کر لی اور ہر مقام پر کچھ لوگ امام و مقتدی مانے جاتے تھے مثلاً مدینہ میں سعید بن مسیب
اور سالم بن عبد اللہ اور ان کے بعد زہری، یحییٰ بن سعید اور ربیعہ بن عبد الرحمٰن۔ مکہ میں عطا
بن ابی رباح، کوفہ میں ابراہیم نخعی اور شعبی، بصرہ میں حسن بصری، یمن میں طاؤس بن کیسان
اور شام میں مکحول امام اور مقتدی تسلیم کئے جاتے تھے، ان لوگوں کے اندر اللہ تعالیٰ نے ان کے
علم کی پیاس اور تڑپ پیدا کر دی اور انھوں نے ان آثار سے حدیثیں، صحابہ کے اقوال اور فتاوے
اور خود ان کی ذاتی تحقیقات جمع کر کے محفوظ کر لیا اور جب مسائل پیش آتے تو خود ان بزرگوں کی
خدمت میں استفتاء پیش کر کے جواب طلب کرتے۔

سعید بن مسیب اور ابراہیم نخعی نے فقہ اسلامی کے تمام ابواب کی جمع و تدوین کی اور
ہر ہر باب میں سلف سے اصول مستنبط کئے۔

یہاں پہنچ کر یہ بھی سمجھ لینا چاہیے کہ فقہ کے کئی اسکول اس وقت قائم ہو گئے تھے سعید
اور ان کے اصحاب کا خیال تھا کہ فقہائے مکہ اور مدینہ کا مسلک زیادہ قوی اور مستند ہے اور ان لوگوں
کے فقہی مسالک کا دار و مدار زیادہ تر عبد اللہ ابن عمرؓ، حضرت عائشہؓ اور ابن عباسؓ کے فتووں اور
مدینہ کے قاضیوں کے فیصلوں پر تھا، ان لوگوں سے جہاں تک ممکن ہوا ان بزرگوں کی باتوں کو جمع
کیا اور پوری تحقیق و تفتیش کے ساتھ ہر مسئلہ کو پرکھا اور جس پر علمائے مدینہ کا اتفاق نظر آیا اسے
پوری مضبوطی کے ساتھ اختیار کر لیا اور جس میں ان کا اختلاف ہوتا تھا اس میں سب سے قوی
اور راجح مسلک کو اختیار کر لیتے اور کسی مسلک کے قوی ہونے کی وجہیں ان کے نزدیک یہ تھیں کہ:۔

(الف) کثرت سے علماء کی یہی رائے ہو
(ب) یا وہ مسلک قوی قیاس کے مطابق ہو۔
(ج) کتاب و سنت کی صریح نصوص سے اس کی تائید اور ترجیح ہوتی ہو۔

اور جب کوئی ایسا معاملہ پیش آ جاتا جس میں انھیں اپنے اسلاف کا مسلک معلوم نہ ہوتا

تو وہ اس صورت میں خود ان کے کلام کی روشنی میں استنباط اور تخریج کرتے، ابراہیم نخعی اور ان کے اصحاب کا خیال تھا کہ عبد اللہ بن مسعود کا فقہ میں کوئی مد مقابل نہیں جیسا کہ علقمہ نے مسروق سے کہا تھا :-

هل احد منهم اثبت من عبد الله ؟ کیا ابن مسعود سے بھی کوئی اثبت ہو سکتا ہے ؟

اور امام ابوحنیفہ نے امام اوزاعی کو جواب دیتے ہوئے فرمایا تھا کہ ابراہیم سالم سے افقہ ہیں اور اگر صحابہ کی فضیلت مسلم نہ ہوتی تو میں کہتا کہ علقمہ عبد اللہ بن عمرؓ سے افقہ ہیں اور عبد اللہ بن مسعود کا تو کہنا ہی کیا۔

اہل کوفہ کے مسلک کا دار و مدار اکثر ابن مسعود کے فتوے، حضرت علیؓ کے فتوے اور فیصلے اور قاضی شریح وغیرہ کے قضایا ہیں اور کوفہ والوں نے بھی اپنے ائمہ کے مسالک کو پوری کوشش اور تندہی کے ساتھ محفوظ اور جمع کیا اور جمع و تطبیق، ترجیح اور تفریع مسائل کے سلسلہ میں ان کا طرز عمل بھی مدینہ والوں کی طرح ہے، اس طرح ان کے یہاں بھی مسائل کی بہتات اور فراوانی ہوئی۔ اور سعید بن مسیب کی طرح ابراہیم نخعی فقہاء کوفہ کے ترجمان سمجھے جاتے ہیں۔

مولانا ابوالکلام آزاد کی فکری بصیرت

اجمالی جائزہ

ڈاکٹر محمد اقبال سینیئر لکچرار شعبۂ فارسی جامعہ ملیہ اسلامیہ نئی دہلی ۲۵-۱۱۰۰

مولانا ابوالکلام آزاد جیسی شخصیتیں، مدتوں بعد معرض وجود میں آتی ہیں قدیم و جدید تہذیب کے امتزاج، تاریخ، ادب، شاعری اور فنون لطیفہ میں مہارت، سیاسی بصیرت اور تہذیبی وراثت اور عقلی فراست کا سراپا مولانا کی ذات تھی

جمال الدین افغانی، علامہ رشید رضا اور مفتی محمد بن عبدہ نے جو فکری کارنامے افغانستان مصر اور دنیائے عرب میں انجام دیئے وہ ابوالکلام نے الہلال اور البلاغ کے ہزار ہا صفحات پر نقش کر دیئے۔ خلافت ترکی، بلقان، سمرنا، تھریس، جنگ جہان اول، استعماریت انگریز سامراج، ہٹلر کی عسکریت، مولانا کی نظروں سے کوئی چیز نہ بچ سکی۔ وہ ہندوستانی مسلمانوں میں ان واقعات پر قلم اٹھا کر ایک طرف ان کو اپنی عظمت رفتہ کو یاد دلاتے تھے اور دوسری جانب انگریز کے خلاف علم بغاوت بلند کرنے کی دعوت دے کر عالم اسلام کو اور ہندوستانی مسلمانوں کو ایک نئی دنیا کی تعمیر کا سنگ بنیاد رکھنے میں مدد دے رہے تھے۔

مولانا نے جب شعور اور سمجھ کی دنیا میں قدم رکھا تو وہ ان کا عنفوان شباب تھا اور انہیں ہندوستان ہی نہیں عالم اسلام میں سیاسی تاریخی اور ثقافتی بے چینی کا ہنگامہ خیز منظر دیکھنے کو ملا چنانچہ اگر یہ کہا جائے تو غلط نہ ہوگا کہ مولانا آزاد کی ذہنی افق پر صرف محدود ہندوستان کے حالات ہی نہیں تھے بلکہ پوری اسلامی دنیا اور ایشیا و افریقہ کی عظیم ناگفتہ بہ حالت بھی تھی اور یہی وجہ تھی کہ مولانا کی نظریں بہت دور بیں تھیں۔ پیشانی کشادہ تھی اور قلب بہت وسیع تھا وہ اسی وجہ سے کسی محدود دنیا کے اور کسی مخصوص طبقہ کے رہنے والے اور نمائندہ نہیں تھے۔ اگر غور

سے دیکھا جائے تو ہم صحیح طور پر یہ اندازہ کر سکیں گے کہ انہوں نے وقت کی نبض کو پہچانا اور اس کا علاج کرنے میں اپنی پوری توانائی خواہ وہ قلم سے ہو خواہ زبان سے صرف کر دی۔

ہم کو اس بیسویں صدی کے آغاز کے ہندوستان کا حال معلوم ہے غدر کے بعد مسلمانوں کی زوال پذیر زندگی، تعلیمی، تہذیبی اور معاشی حیثیت سے ان کی بدحالی کی تصویر ابھی بہت زیادہ دھندلی نہیں ہوئی۔ سرسید اور ان کے رفقاء کار نے جو قدم اٹھایا مولانا اس سے متاثر ہوئے اور انہوں نے تعلیمی اور فکری طور پر مسلمانوں کو اس نہج پر لے جانے کی کوشش کی۔ لیکن ان کی کوششوں میں بڑا نمایاں فرق یہ تھا کہ وہ نئی انگریزی تہذیب و سیاست کے بجائے مسلمانوں کو ان کی اپنی اسلامی تہذیب اور ہندوستان میں رہ کر اپنا مشترکہ تمدن کو فروغ دینا چاہتے تھے۔ یہی وجہ تھی کہ وہ ہندوستان کے آزادی خواہوں، انقلابیوں کے حلقہ میں بھی جانے پہچانے جاتے تھے اور دوسری طرف مسلمانوں کی اکثریت انکی تعدیر اُن کی تحریر جو البلاغ، الہلال ترجمان القرآن اور دوسرے انکے رسائل میں موجود تھے۔ اس سے متاثر ہوئی اور بہت دنوں انکے اس اعلان کا ڈنکا بجتا رہا۔

مولانا ابوالکلام آزاد کی جامع شخصیت ایسی مجمع الاوصاف تھی کہ وہ بیک وقت ممتاز سیاست داں، ماہر ادیب و انشاء پرداز، بے باک صحافی، عالم دین متین، شعلہ بیان خطیب صاحب فکر و نظر، پیکر اخلاق و شرافت، انسان دوست، محب وطن اور ماہر تعلیم تھے۔ مولانا ہندوستان کی جنگ آزادی کے صف اول کی ان نادر سیاسی شخصیتوں میں سے تھے جن کا دامن سیاست کی آلودگیوں سے کثیف نہیں ہوا۔ انہوں نے اپنی فکری و ذہنی صلاحیتوں سے خلوص نیت کے ساتھ ایک نئے معاشرے کی بنیادیں استوار کرنے کی سعی محکم کی اور دیگر بڑے رہنماؤں کے شانہ بشانہ ایک جمہوری قومی تشخص کی داغ بیل ڈالی۔ اس طرح انھوں نے ایک نئے معاشرے کی تشکیل اور متحدہ قومیت کی ذمہ داری قبول کی۔ اور اپنی زندگی کا نصب العین ایک خاص مقصد پر مرکوز رکھا۔ جس کا اظہار انہوں نے خود غبار خاطر میں کیا ہے۔

"زندگی بغیر کسی مقصد کے بسر نہیں کی جا سکتی، کوئی اٹکاؤ، کوئی لگاؤ، کوئی بندھن ہونا چاہیئے۔ جس کی خاطر زندگی کے دن کاٹے جا سکیں یہ مقصد مختلف طبیعتوں کے سامنے

خفتہ شکوں میں اکا جھتا ہے

زاہد بہ نماز و روزہ ضبطی دارد
سرمد بہ مے و پیالہ ربطی دارد [1]

مولانا کے افکار و نظریات جدید سائنسی فکر سے مطابقت رکھتے تھے۔ وہ عصری فکری میلانات اور سائنسی رجحانات اور افکار سے ہندوستانی معاشرہ کی اور خاص کر مسلم معاشرہ کی از سر نو تعمیر سے اس کے مستقبل کو سنوارنا اور سجانا چاہتے تھے۔ مولانا کی ذات میں علم و عرفان کی ایک وسیع دنیا آباد تھی ایک طرف انہیں عربی، فارسی اور اسلامی علوم پر دسترس حاصل تھی تو دوسری طرف مغربی زبانوں اور اس کے ادب سے گہری واقفیت رکھتے تھے۔ مولانا کی فکری بصیرت اس درجہ عمیق و وسیع تھی کہ سیاسی تحریکیں ہوں یا فکری رجحانات، ادبی نظریات ہوں یا مذہبی تنازعے وہ اس کا مطالعہ گہرائی و گیرائی سے کرتے تھے۔ ان کی بلند فکر طبیعت دنیا کے تقاضوں کو وسیع پس منظر میں دیکھتی تھی اور حالات کا صحیح تجزیہ کرتی تھی۔ وہ ایک مذہب پرست جدید مفکر کے آدمی تھے۔

بعض اعتبار سے ان کی طرز فکر بنیادی طور پر جدید تھی اور بعض دوسری باتوں میں ان کا ماضی سے بڑا گہرا رشتہ تھا اور وہ اس دور کے شعور کا ایک عکس تھے جسے روشن خیالی کا دور کہا جاتا ہے۔ مجموعی طور پر وہ ایک ایسے غیر معمولی فرد تھے جنہوں نے اس مقصد کو جس کے لئے وہ عمر بھر کوشاں رہے ایک امتیازی شان بخشی اور وہ بھی کچھ اس ڈھنگ سے جس کی کوئی ہمسری نہیں کر سکتا۔ پرانا نظام بدلتا ہے اور ہم اسے واپس نہیں لا سکتے۔ لیکن ہم اس سے بہت کچھ سیکھ سکتے ہیں اس طرح ہم مولانا آزاد کی یاد دلوں میں تازہ کرتے ہوئے ان کی زندگی اور ان کی تعلیمات سے ایک بڑا سبق سیکھتے ہیں۔ [2]

مولانا عربی زبان و ادب، فارسی شاعری کے رموز، اسلامی تاریخ، عالم اسلام کی جزوی اور کلی خوبیوں اور خامیوں سے واقف تھے وہ ان علماء میں سے تھے جن کو وقت کی رفتار کا اندازہ رہتا ہے۔ جو تولیا

---

[1] غبار خاطر، ص، ۷۰

[2] بحوالہ۔ مولانا ابوالکلام آزاد۔ رشید الدین خاں

سے دیکھا جائے تو ہم صحیح طور پر یہ اندازہ کرسکیں گے کہ انہوں نے وقت کی نبض کو پہچانا اور اس کا علاج کرنے میں اپنی پوری توانائی خواہ وہ قلم سے ہو خواہ زبان سے صرف کردی۔

ہم کو اس بیسویں صدی کے آغاز سے ہندوستان کا حال معلوم ہے غدر کے بعد مسلمانوں کی زوال پذیر زندگی، تعلیمی، تہذیبی اور معاشی حیثیت سے ان کی بدحالی کی تصویر ابھی بہت زیادہ دھندلی نہیں ہوئی۔ سرسید اور ان کے رفقاء کار نے جو قدم اٹھایا مولانا اس سے متاثر ہوئے اور انہوں نے تعلیمی اور فکری طور پر مسلمانوں کو اس نہج پر لے جانے کی کوشش کی۔ لیکن ان کی کوششوں میں بڑا نمایاں فرق یہ تھا کہ وہ نئی انگریزی تہذیب و سیاست کے بجائے مسلمانوں کو ان کی اپنی اسلامی تہذیب اور ہندوستان میں رہ کر اپنا مشترکہ تمدن کو فروغ دینا چاہتے تھے۔ یہی وجہ تھی کہ وہ ہندوستان کے آزادی خواہوں، انقلابیوں کے قلعہ میں بھی جانے پہچانے جاتے تھے اور دوسری طرف مسلمانوں کی اکثریت انکی تقدیراُن کی تحریر جو البلاغ، الہلال ترجمان القرآن اور دوسرے انکے رسائل میں موجود تھے۔ اس سے متاثر ہوئی اور بہت دنوں انکے اس اعلان کا ڈنکا بجتا رہا۔

مولانا ابوالکلام آزاد کی جامع شخصیت ایسی مجمع الاوصاف تھی کہ وہ بیک وقت ممتاز سیاست داں، ماہر ادیب وانشاء پرداز، بے باک صحافی، عالم دین متین، شعلہ بیان خطیب صاحب فکر ونظر، پیکر اخلاق وشرافت، انسان دوست، محب وطن اور ماہر تعلیم تھے۔ مولانا ہندوستان کی جنگ آزادی کے صف اول کی ان نادر سیاسی شخصیتوں میں سے تھے جن کا دامن سیاست کی آلودگیوں سے کثیف نہیں ہوا۔ انہوں نے اپنی فکری و ذہنی صلاحیتوں سے خلوص نیت کے ساتھ ایک نئے معاشرے کی بنیاد رس استوار کرنے کی سعی محکم کی اور دیگر بڑے رہنماؤں کے شانہ بشانہ ایک جمہوری قومی تشخص کی داغ بیل ڈالی۔ اس طرح انھوں نے ایک نئے معاشرے کی تشکیل اور متحدہ قومیت کی ذمہ داری قبول کی۔ اور اپنی زندگی کا نصب العین ایک خاص مقصد پر مرکوز رکھا۔ جس کا اظہار انہوں نے خود غبار خاطر میں کیا ہے۔

"زندگی بغیر کسی مقصد کے بسر نہیں کی جاسکتی، کوئی اٹکاؤ، کوئی لگاؤ، کوئی بندھن ہونا چاہیئے۔ جس کی خاطر زندگی کے دن کاٹے جاسکیں یہ مقصد مختلف طبیعتوں کے سامنے

مختلف شکلوں میں آتا ہے! ؎

زاہد بہ نماز و روزہ ضبطی دارد
سرمد بہ مئے و پیالہ ربطی دارد [1]

مولانا کے افکار و نظریات جدید سائنسی فکر سے مطابقت رکھتے تھے۔ وہ عصری فکری میلانات اور سائنسی رجحانات اور افکار سے ہندوستانی معاشرہ کی اور خاص کر مسلم معاشرہ کی از سر نو تعمیر سے اس کے مستقبل کو سنوارنا اور سجانا چاہتے تھے۔ مولانا کی ذات میں علم و عرفان کی ایک وسیع دنیا آباد تھی۔ ایک طرف انہیں عربی و فارسی اور اسلامی علوم پر دسترس حاصل تھی تو دوسری طرف مغربی زبانوں اور اس کے ادب سے گہری واقفیت رکھتے تھے۔ مولانا کی فکری بصیرت اس درجہ عمیق و وسیع تھی کہ سیاسی تحریکیں ہوں یا فکری رجحانات، ادبی نظریات ہوں یا مذہبی زاویے وہ اس کا مطالعہ گہرائی و گیرائی سے کرتے تھے۔ ان کی بلند فکر طبیعت دنیا کے تقاضوں کو وسیع پس منظر میں دیکھتی تھی اور حالات کا صحیح تجزیہ کرتی تھی۔ وہ ایک مذہب پرست جدید فکر کے آدمی تھے۔

> بعض اعتبار سے ان کی طرز فکر بنیادی طور پر جدید تھی اور بعض دوسری باتوں میں ان کا ماضی سے بڑا گہرا رشتہ تھا اور وہ اس دور کے شعور کا ایک عکس تھے جسے روشن خیالی کا دور کہا جاتا ہے۔ مجموعی طور پر وہ ایک ایسے غیر معمولی فرد تھے جنہوں نے اس مقصد کو جس کے لئے وہ عمر بھر کوشاں رہے ایک امتیازی شان بخشی اور وہ بھی کچھ اس ڈھنگ سے جس کی کوئی ہمسری نہیں کرسکتا۔ پرانا نظام بدلتا ہے اور ہم اسے واپس نہیں لاسکتے۔ لیکن ہم اس سے بہت کچھ سیکھ سکتے ہیں اس طرح ہم مولانا آزاد کی یاد دلوں میں تازہ کرتے ہوئے ان کی زندگی اور ان کی تعلیمات سے ایک بڑا سبق سیکھتے ہیں۔ [2]

مولانا عربی زبان و ادب، فارسی شاعری کے رموز، اسلامی تاریخ، عالم اسلام کی جزوی اور کلی خوبیوں اور خامیوں سے واقف تھے وہ ان علماء میں سے تھے جن کو وقت کی رفتار کا اندازہ رہتا ہے۔ جو لوگ

---

[1] غبار خاطر۔ ص، ۷۰

[2] بحوالہ۔ مولانا ابوالکلام آزاد۔ رشید الدین خاں

اور ملکوں کو واقعات اور حادثات سے پہلے ان کا اندازہ کر لیتے ہیں۔ اگرچہ عوام و خواص خواب خرگوش میں مبتلا رہتے ہیں مگر ان جیسے لوگ اپنی چشم بینا سے وہ سب کچھ دیکھتے ہیں۔ اس کا سدباب کرتے ہیں اور مجموعی حیثیت سے مسیحائی کرتے ہیں۔

مولانا کی جدت پسند، دوراندیش اور دوربین طبیعت نے سرسید کے ایک قومی نظریہ کو قبول نہیں کیا۔ جبکہ وہ سرسید کے خیالات و افکار سے متاثر تھے اور ان کی عظیم الشان علمی اصلاحی اور سماجی خدمات کے بھی معترف تھے۔ اپنے اس موقف کا اظہار وہ اس طرح کرتے ہیں۔

"میں سرسید مرحوم کی سیاسی رہنمائی کو ان کی زندگی کی سب سے بڑی غلطی یقین کرتا ہوں مگر ساتھ ہی ساتھ یہ بھی یقین کرتا ہوں کہ وہ انیسویں صدی کے ایک بڑے ہندوستانی مصلح تھے، اور انہوں نے ملک کے لئے شاندار اصلاحی اور تعلیمی خدمات انجام دیں"

(کانوکیشن ایڈریس ص۳)

ہندو مسلم اتحاد مولانا کا مقصد حیات تھا۔ ایک قومی نظریہ ان کے دل و دماغ پر چھایا ہوا تھا۔ اور اس کا شرعی جواز انہوں نے قرآن کریم اور احادیث رسول ؐ سے پیش کیا، مولانا سمجھتے تھے کہ مذہب اور شریعت کا معاملہ مسلمان کے لئے اس کا دین اور ایمان ہے اور وہ کسی بھی حال میں اس سے دستبردار نہیں ہو سکتا۔ ان حالات کے پیش نظر مولانا اپنی سیاسی بصیرت کا اظہار پُرخلوص الفاظ میں اس طرح کرتے ہیں۔

"ہندوستان کے مسلمانوں کا فرض ہے کہ وہ احکام شرع کو سامنے رکھ کر حضور پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم کے اس اسوۂ حسنہ کو پیش نظر رکھ کر، جو انہوں نے اہل مدینہ اور بت پرست لوگوں سے مصالحت کرتے ہوئے دکھایا۔ وہ نمونہ جو خود جناب سرور کائنات نے عملاً پیش کیا ہے اور عملاً اور حکماً جو تعلیم قرآن نے دی ہے، ہندوستان کے مسلمانوں کا یہ فرض شرعی ہے کہ وہ ہندوستان کے ہندوؤں سے کامل سچائی کے ساتھ عہد محبت کا پیمان باندھ لیں۔ اور ان کے ساتھ مل کر ایک قوم ہو جائیں۔ . . اب میں مسلمان بھائیوں کو سنانا چاہتا ہوں کہ خدائی آواز کے بعد سب سے بڑی آواز جو ہو سکتی ہے وہ محمدؐ کی آواز تھی۔ اس وجود مقدس نے عہد نامہ لکھا۔ یہ اس کے الفاظ ہیں۔ اِنَّھُمْ اُمَّۃٌ

و جدیدہ: "ہم ان تمام قبیلوں سے جو مدینہ کے اطراف میں بستے ہیں، صلح کرتے ہیں اتفاق کرتے ہیں۔ اُمّت کے معنی ہیں قوم اور نیشن اور واحدہ کے معنی ہیں ایک" [۱]

ہم مولانا کی عربی دانی کا بہترین مظاہرہ ان کی قرآنی تفسیر میں دیکھتے ہیں سورۂ فاتحہ کی تفسیر میں انہوں نے مسئلہ ربوبیت کو جس طرح دنیا کے سامنے پیش کیا اور رب العالمین کا جو تصور پیش کیا وہ تفسیر کی دنیا میں ایک عظیم انقلاب تھا۔ خدا سب کا ہے سب کا پروردگار عالم اور معبود ہر دو عالم ہے اور ہر ذی روح بلا فرق مذہب و ملت اس کا بندہ ہے۔ قرآن فہمی کا جو تصور مولانا نے دنیا کے سامنے رکھا وہ بالکل انوکھا اور نیا تھا۔ مولانا کی تصنیف ترجمان القرآن کے بارے میں علماء دین کا مختلف ردعمل ہوا اور سب نے اپنی اپنی فکری بصیرت سے اس پر اظہار خیال فرمایا۔ ذیل میں حضرت مولانا سید سلیمان ندوی کے تبصرہ کا ایک اقتباس پیش خدمت ہے:

"اس میں سورۂ فاتحہ کے ایک ایک لفظ کی ایسی دل نشین اور بصیرت افروز تفسیر ہے کہ اس سے سورہ کے ام الکتاب (اصل قرآن) ہونے کا مسئلہ مشاہدہ معلوم ہونے لگتا ہے اور اسلام کے تمام مہات مسائل اور اصول دین پر ایک تبصرہ ہو جاتا ہے خصوصاً قرآن پاک کے طرز استدلال خالق کائنات کی ربوبیت و رحمت کے آثار و دلائل اتنی تفصیل سے لکھے ہیں کہ مصنف کی وسعت علم و نظر کی داد بے اختیار دینی پڑتی ہے۔" [۳]

اسی تفسیر میں سکندر ذوالقرنین کے بارہ میں مولانا کا نظریہ جس قدر علمی، تحقیقی اور فکری تھا اس کا اعتراف خود ایرانیوں نے کیا اور وہاں کے ہخا منشی بادشاہ سے سکندر کی مطابقت اور مشابہت کو حقیقت کا درجہ دینا مولانا کا تحقیقی اور تاریخی کارنامہ ہے۔

مولانا نے ادبی اور صحافتی دنیا میں وہ کارہائے نمایاں انجام دیئے ہیں۔ جس کی نظیر نہیں ملتی۔ ان کی تحریروں میں تذکرہ اور غبار خاطر، زبان و بیان کے لحاظ سے انشاء پردازی کے بہترین نمونوں

---

[۱] بحوالہ مآثر مولانا ابوالکلام آزاد ص ۷۵،۷۴ پروفیسر خلیق احمد نظامی۔

[۲] مولانا ابوالکلام آزاد ص ۴۷ پروفیسر رشید الدین خاں۔

[۳] معارف اکتوبر ۱۹۳۲ء (بحوالہ مضمون صباح الدین عبدالرحمٰن ص ۳۰۹)

میں سے ایک ہے۔ الہلال اور البلاغ کے پُرزور دینی و سیاسی مضامین اور اسلوب تحریر صحافت کی دنیا میں سنگ میل کی حیثیت رکھتے ہیں۔

تذکرہ پڑھیے اور زبان و بیان کا انداز دیکھیے۔ الفاظ کی شان و شوکت جملوں کی نشست و برخاست اور تراکیب و اصطلاحات کا وہ عربی فارسی امتزاج اردو زبان کو کیا شان اور طمطراق بخشتا ہے مولانا ایک دریائے پرموج اور بیکراں جوش و خروش میں قاری کو بہالے جاتے ہیں اور ساحل پر پہونچکر اسے ہوش کی دنیا میں آکر جو عظمت، حوصلہ، عزم اور رفعت ملی ہے وہ بھی مولانا کے فکر کا اعجاز ہے

غبار خاطر بیان و اسلوب نگارش کے لحاظ سے شاہکار ادبی شہ پارہ ہے اور فارسی کے بہترین برگذیدہ اشعار کا مجموعہ ہے جو مولانا نے لکھتے وقت اپنے حافظہ سے بے تکلف سپرد قلم کردئے۔ وہ ان کی فارسی دانی کا بین ثبوت ہے۔

مولانا کی سب سے بڑھ کر قابل ذکر خوبی یہ ہے کہ ان کی تحریریں اور تقریریں خواہ وہ ادبی موضوع پر ہوں یا سیاسی موضوع پر، ان میں الفاظ کی بندش و چستی اور زبان و بیان میں ذرہ برابر بھی فرق نہیں ہے۔ جس طرح ان کی تحریریں شگفتہ و شائستہ اور دلکش ہیں اسی طرح انھوں نے تقریر میں بھی گل افشانیاں کی ہیں۔

یہ کمال بہت کم لوگوں کو حاصل ہوتا ہے کہ ان کی تحریر و تقریر میں یکسانیت ہو عام طور پر جذبات کی رو میں تقریر میں وہ الفاظ ادا نہیں ہو پاتے جو تحریر میں مؤثر طور پر آجاتے ہیں لیکن یہ مولانا کا ہی طرہ امتیاز ہے کہ جامع مسجد کی وہ تاریخی تقریر جو انہوں نے آزادی کے بعد کی تھی، ایک طرف وہ انکے زخم خوردہ دل کی دردناک پکار، ایک ہمدرد، غمخوار دل کی صدائے بازگشت تھی تو دوسری جانب ان کے طرز خطابت کا بہترین نمونہ ہے جس میں گرفتہ دل کے باوجود ان کے انداز خطابت، طرز تکلم اور جملوں کی بندش و چستی میں ان کی تحریروں سے مختلف نہیں ہے۔ وہ فرماتے ہیں۔

تمہیں یاد ہے میں نے تمہیں پکارا تم نے میری زبان کاٹ لی میں نے قلم اٹھایا اور تم نے میرے ہاتھ قلم کردیئے، میں نے چلنا چاہا تم نے میرے پاؤں کاٹ دیئے، میں نے کروٹ لینی چاہی تم نے میری کمر توڑ دی ــــ میں نے تمہیں خطرے کی شاہراہ پہ جھنجوڑا لیکن تم نے میری صدا سے نہ صرف احتراز کیا بلکہ غفلت و انکار کی ساری سنتیں تازہ کردیں۔ نتیجہ معلوم ہے کہ آج ان ہی خطروں نے

تمہیں گھیر لیا ہے۔ جس کا اندیشہ تمہیں صراط مستقیم سے دور لے گیا تھا۔ سچ پوچھو تو میں ایک جمود ہوں یا ایک دور افتادہ صدا جس نے وطن میں رہ کر بھی غریب الوطنی کی زندگی گذاری ہے۔

ابھی کچھ زیادہ عرصہ نہیں بیتا جب میں نے تم سے کہا تھا کہ دو قوموں کا نظریہ حیات معنوی کے لئے۔ مرض الموت کا درجہ رکھتا ہے اس کو چھوڑ دو۔ یہ ستون جن پر تم نے بھروسہ کیا ہے نہایت تیزی سے ٹوٹ رہے ہیں، لیکن تم نے سنی ان سنی برابر کر دی۔ ۔ ۔ تم دیکھ رہے ہو کہ جن سہاروں پر تمہیں بھروسہ تھا تمہیں لاوارث سمجھ کر تقدیر کے حوالے کر گئے۔

میرے بھائی! میں نے ہمیشہ سیاست کو ذاتیات سے الگ رکھنے کی کوشش کی ہے یہی وجہ ہے کہ میری بہت سی باتیں کنایوں کا پہلو لئے ہوتی ہیں، لیکن مجھے جو کچھ کہنا ہے اسے بے روک کہو تو کہنا چاہتا ہوں، متحدہ ہندوستان کا بٹوارہ بنیادی طور پر غلط تھا مذہبی اختلاف کو جس ڈھب سے ہوا دی گئی اس کا لازمی نتیجہ یہی آثار و مظاہر تھے۔

یہ فرار کی زندگی جو تم نے ہجرت کے مقدس نام پر اختیار کی ہے اس پر غور کرو اپنے دلوں کو مضبوط بناؤ، اور اپنے دماغوں کو سوچنے کی عادت ڈالو اور پھر دیکھو کہ تمہارے لئے فیصلے کتنے عاجلانہ ہیں آخر کہاں جا رہے ہو اور کیوں جا رہے ہو۔

یہ دیکھو جامع مسجد کے بلند مینار تم سے جھک کر سوال کرتے ہیں کہ تم نے اپنی تاریخ کے صفحات کو کہاں گم کر دیا ہے ابھی کل کی بات ہے کہ جمنا کے کنارے تمہارے قافلوں نے وضو کیا تھا، اور آج تم ہو کہ تمہیں رہتے ہوئے خوف محسوس ہوتا ہے حالانکہ دہلی تمہارے خون سے سینچی ہوئی ہے۔

عزیزو! تبدیلیوں کے ساتھ چلو یہ نہ کہو کہ ہم اس تغیر کے لئے تیار نہ تھے بلکہ اب تیار ہو جاؤ ستارے ٹوٹ گئے مگر سورج تو چمک رہا ہے۔

مولانا کی تحریریں، تقریریں، افکار و خیالات اور ان کا عمل سب ایک بڑے دانشور کی شخصیت کا جز تھا جو الہلال، البلاغ اور ترجمان القرآن کی تحریروں اور کانگریس کے سیاسی پلیٹ فارم پر بحیثیت صدر، بحیثیت ممبر ورکنگ کمیٹی اور ایک فعال ترین وزیر تعلیم ہونے کی حیثیت سے ہر جگہ نمایاں اور واضح فکر و کردار کی نمائندگی کرتی ہیں۔ آزاد ہندوستان کی فائن آرٹ اکادمی، للت کلا

اکادمی [illegible] ترقی گرانٹس کمیشن، سہ لسانی فارمولا اور ادیبوں، شاعروں اور ہنروروں کی حوصلہ افزائی کے انعامات کی تجویز اور عمل میں مولانا کی تمام تر کوششوں کو دخل رہا ہے۔

ادبی حیثیت سے مبارز خاطر ادب، شاعری، تاریخ اور اردو و فارسی کی انشاپردازی کا بہترین نمونہ ہے۔ اور اگر مولانا کی فکری بصیرت کا صحیح اندازہ کرنا ہو تو ۱۹۴۲ء کے ہندوستان کو دیکھا جائے کس سے وہ لوگوں کو کام کرنے کا، جینے کا، اللہ پر بھروسہ رکھنے کا، دین و ایمان پر قائم رہنے کا صائب مشورہ دیتے رہے۔ ان کے یہاں زور زبردستی نہیں تھی۔ بلکہ ان کی شیریں بیانی، انکا انداز گفتار اس قدر دلنشیں ہوتا تھا کہ سامعین کو مسحور و مسرور کر دیتا تھا۔ مولانا کے قلم کی سیاہی اتنی روشن تھی جس میں گذشتہ تاریخ کے شاندار ماضی کا بھی ذکر تھا، حال کی غلطیوں اور خامیوں کا عکس بھی تھا اور آئندہ آنے والی زندگی کے روشن مستقبل کی پیشین گوئی بھی تھی۔

بقیہ: عربی شاعری و خیالات کا اثر بر و فنسا و اطالیہ کی شاعری پر

(Toulouse) میں ۱۳۲۳ء میں جو طولوز میں academy of the Jeux-Floraux قائم کیا تھا اور جس میں عمدہ شعراء کو انعام میں سونے چاندی کے ڈھلے ہوئے پھول دئے جاتے تھے اور جس کا ابتدائی نام مدرسۃ العلم المفرح "College du gai savoir" تھا۔ ایک قصیدہ "عذاری فیردون" Vierges of Verdun اور دوسرا قصیدہ "ہنری رابع کی تعریف میں" بھیج کر انعام حاصل کیا تھا اور حقیقت تو یہ ہے کہ جب شہر مون پلیہ (Mont Pellier) میں تیرھویں صدی میں طب کا مدرسہ قائم کیا گیا جو طبیہ مدرسہ سالیرن Salerno کے بعد سب سے قدیم طبی درسگاہ تھی تو یہاں معلمین اور مدرسین عرب اور مستعربین یہودی کو بلایا تھا کیوں کہ اس وقت اندلس اوج کمال پر تھا عرب کے اس علم و فضل سے بے حد متاثر ہو کر طولوز میں یہ ادبی ادارہ قائم کیا گیا تھا جس سے فیکتور ہوگو نے انعام حاصل کیا انھیں سب تاثرات کی وجہ سے فیکتور ہوگو

عربی شاعری و خیالات کا اثر پروفنسا و اطالیہ کی شاعری پر

از
جناب ڈاکٹر محمد احمد صاحب صدیقی
(پروفیسر یونیورسٹی الہ آباد)

آٹھویں صدی عیسوی کے وسط سے تیرہویں صدی عیسوی کے آغاز تک عربوں کی شاندار فتوحات اور علم نوازی روز روشن کی طرح نمایاں ہے کیمیا، Chemistry فلسفہ، Philosophy طب، Medicine ریاضیات، Mathematics نجوم و تنجیم، Astronomy and astrology موسیقی Music زراعت Agriculture جغرافیہ، Geography کے عرب محسنین کو مثلاً ابن جبیر، Ibn Jaber رازی، Razes فارابی، Farabi زریاب، Zaryab ابن سینا، Avicenna ابن رشد، Averroes عمر خیام Omar Khayyam ابن الہیثم Ibnal Haitham المعری، Almarri الغزالی، Alghazali ابن باجہ، Avempace الکندی، Alkindi ابن طفیل، Ibn Tufail البیرونی، Alberuni ابن خلدون، Ibn Khaldun ابن البیطار، Ibnal Baitar ادریسی، Idrisi وغیرہم کو تاریخ فراموش نہیں کرسکتی بغداد و شام میں یونانی سریانی علوم کے ترجمے ہو رہے تھے۔ نصرانی، یہود بھی عرب کے اس چشمہ فیض سے سیراب ہو رہے تھے پھر یہ علوم انھیں یہود، نصاریٰ اور مسلمانوں کے ذریعہ اندلس پہنچے جس کی موافق سرزمین نے اس میں چار چاند لگا دئے دوسری طرف یورپ میں جہل، لغو و فاسد عقائد کی ترقی ہو رہی تھی کلیسا کی حالت بھی دگرگوں اور ناگفتہ بہ تھی۔ مسیحی کلیسا بہت سے ایسے علوم و آداب کا مخالف تھا جن سے

وہ مسیحیت کے خلاف دہریوں اور بت پرستوں کی پیدا وار سمجھتا تھا بعض راہب اپنے عبادت خانوں میں اور بعض علماء اپنے گوشوں میں کسی پرانی نحو یا تاریخ کی کتاب کا درس دیتے تھے یہ نجی عمل ایک انفرادی حیثیت رکھتا تھا۔ شارلیمان Charlemagne المتوفی ۸۱۴ء نے اپنے محل میں امیر زادوں کے لئے ایک مدرسہ قائم کیا تھا لیکن اس کی وفات کے بعد امراء اور کلیسا بلکہ خود باہم امراء میں نزاعات پیدا ہو گئے جنہوں نے پرانی آبادیوں کے نشانات مٹا دئے اور جو علوم حاصل کئے تھے انھیں معدوم کر دیا۔ یورپ کی ان دنوں یہ حالت تھی جس کو طلیطلہ (Toledo) کے ایک عالم صاعد ابن احمد المتوفی ۴۶۲ھ نے یوں بیان کیا ہے "چوں کہ ان لوگوں کے سروں پر آفتاب کی شعاعیں بالکل سیدھی نہیں پڑتیں اس لئے ان کی آب و ہوا سرد اور ماحول ابر آلود رہتا ہے اس لئے ان لوگوں کے مزاج ٹھنڈے اور ان کی طبیعتیں اجڈ ہیں۔ . . ان میں جودت طبع اور بصیرت نام کو نہیں بلکہ اس کے بجائے ان پر بے وقوفی اور کند ذہنی مسلط ہے۔" لیون Leon اور نبرہ Navarre اور بارسلونا Barcelona کے حکمراں اپنی ضرورت میں قرطبہ سے رجوع کرتے تھے اس اسلامی حکومت کی یہ شہرت تھی کہ اگر ایک طرف جرمنی کی ایک ساکزن راہبہ نے اس کو "نگینۂ عالم" کا لقب دیا تو دوسری طرف ایک مصنف نے اس کو "دلہن"[1] سے تشبیہ دی اور اس کے علوم و فنون کو اس کا زیور قرار دیا۔ پروفیسر ڈوزی اپنی کتاب "تاریخ مسلمانان اندلس" میں لکھتے ہیں کہ "اس شہر میں ہر قسم کے علوم و فنون کی تعلیم دی جاتی تھی ابتدائی مدارس اعلیٰ درجہ کے موجود تھے اور بکثرت تھے یہ وہ زمانہ تھا کہ عیسوی یورپ میں سوائے پادریوں یا ایسے لوگوں کے جو حکومت کے بڑے عہدے رکھتے تھے سب ناخواندہ ہوتے تھے لیکن اندلس کے مسلمانوں میں تقریباً ہر متنفس پڑھا لکھا ہوتا تھا۔"[2] اسی اندلس میں عربی شاعری میں "معنویت" مصوری اور تاثیر کی وجہ سے بڑی دل کشی پیدا ہو گئی تھی گویا اشعار محض زبان سے نہیں بلکہ

---

[1] پروفیسر حتی "عرب اور اسلام" [2] "اندلس کا تاریخی جغرافیہ" مرتبہ محمد عنایت اللہ

دل سے نکلتے تھے۔ شاعری ہی سے لوگوں کا درجہ بلند ہوتا تھا تعلیم کی عام اشاعت کی وجہ سے اندلس کی عورتوں تک نے بڑی ترقی کی اور شلب Silves اور وادی آش Guadix میں شعر و شاعری کا اتنا عام مذاق تھا کہ شاید ہی کوئی ایسا آدمی تھا جو شاعر نہ تھا حتیٰ کہ ایک کاشتکار بھی برجستہ شعر کہہ سکتا تھا۔ اندلس میں علوم و فنون کا سیلاب آگیا اور شائقین علم ان سرچشموں سے جو قرطبہ Cordova، طلیطلہ Toledo، اشبیلیہ Seville اور غرناطہ Granada، میں عربی شاعری میں سے پھوٹے تھے فیض یاب ہوتے تھے یعنی ان یونیورسٹیوں میں عیسائیوں کی تعلیم اور صقلیہ Sicily میں مسلمانوں کے علوم و فنون سے متأثر ہونا اور باہمی تجارت نے نصاریٰ کو عربوں سے ملنے جلنے کا کافی موقع دیا صلیبی لڑائیوں نے بھی Crusades نے بھی ان کے باہمی تعلق و ارتباط کو منقطع نہیں کیا بلکہ دونوں میں اور زیادہ ارتباط ہوگیا عرب جب سرزمین فرانس میں داخل ہوا اور ان کے جنوب میں متوطن ہوکر کاشت میں مصروف ہوا تو ان کی لڑکیوں سے شادیاں کیں ان کے یہاں سے باہمی تجارت کا سلسلہ بھی رہا اور بہت سے شہر مثلاً نربون Narbonne اور قرقشون Carcassone کو آباد کیا اور ان کے قیدیوں کو پکڑ کر جامعہ قرطبہ University of Cordova کی تعمیر میں اور دوسری عمدہ عمارتوں کی تعمیر میں مشغول کیا (مثلاً قصر الزہراء ۔ الحمراء ۔ القنطرہ وغیرہ) تو آپس میں خلط و ملط میں اور اضافہ ہوگیا اس طرح دونوں قوموں میں تبادلۂ خیالات ہوتے تھے مسلمان اس وقت بڑی ترقی پر تھے تمدن و تہذیب دونوں ہی لحاظ سے اپنے مسیحی پڑوسی سے بہت سبقت لے گئے تھے یورپ والے مسلمانوں کی یونیورسٹیوں سے استفادہ کرتے تھے جس کی ایک روشن مثال سلسفتر ثانی Sylvester II کی ذات گرامی ہے اس کا نام جربر Gerbert تھا (۹۳۰ - ۱۰۰۴ م) لاتینی زبان میں علوم لاہوتیہ حاصل کرکے طلب علم میں اندلس آیا اس نے نہ صرف صقلیہ Sicily میں قرطبہ Cordova میں اس قدر عربی ادب حاصل کیا کہ عربی وزن و قافیے میں عربی زبان میں متعدد قصائد کہے تھے

اور اسی علم کی وجہ سے فرانس اور اٹلی میں اتنا تفوق حاصل کیا کہ مسند پوپ پر "المرتبۃ البابویۃ" ۹۹۹ سے ۱۰۰۳ تک سلفسٹر دوم Silvester II کے نام سے فائز رہا۔ جب اندلس سے ایک متبحر عالم ہو کر واپس ہوا اس کے علم و فضل کو دیکھ کر لوگوں نے اس کو جادوگر سمجھا بادشاہوں نے اپنے لڑکوں کی تعلیم کے لئے ان کو منتخب کیا یہی وہ شخص ہے جس نے ارقام عربی کو جس کو ہم ارقام ہندی کہتے ہیں یورپ میں رائج کیا۔ ورنہ وہ لوگ لاطینی زبان کو بمنزلہ حروف ابجد یہ استعمال کرتے تھے۔ طلبہ اس کے پیچھے پیچھے دوڑے اور شعراء عرب اور ان کے ادیبوں کی تقلید کرنے لگے فرانس کے لوگ جو عرب کے پڑوسی تھے لاطینی زبان سے اعراض کرنے لگے اور عربی اشعار اور ان کے ازجال سیکھنے کی طرف مائل ہو گئے اسپین کی شاعری نے رسمیاتی قیود سے آزادی حاصل کر کے نئی نئی بحریں اور دلکش طرز اختیار کر لیا تھا جو جدید شاعری میں نمایاں ہے رزمیہ نظمیں اور عشقیہ غزلوں میں روحانی احساسات کو ظاہر کیا جانے لگا تھا نغمہ و موسیقی اور حسن ترنم شاعری کی جان تھی اسی طرز شاعری سے نصاریٰ بہت متاثر ہوئے اور عربی تغزل کے دونوں طریقوں موشحات اور ازجال کو قشتالیہ cantica کی مقبول طرز Villancica کی صورت میں فروغ ہوا اس طرز کو مسیائی گیتوں اور میلاد مسیح کی نظموں میں استعمال کرتے تھے اسپین نے اس خاص طریقہ کی ترقی کی جس کو strophic measures کہتے ہیں جس کی ایک قسم موشح Muwashshah (Muwashshaha) ہے اور اسی کا ایک جز زجل Zajal یا Zajal ہے جو ولانسیکو Villancico کے بالکل مماثل و مشابہ ہے ان کے باہمی تماثل و انطباق میں شک و شبہ کی گنجائش نہیں یہ کسی طرح قرین قیاس نہیں کہ ایسا انطباق صرف مصطلحات تک محدود رہے یا صرف ایک قسم کی شاعری میں رہے اگرچہ Romance افسانوی نظم میں مستند عربی عنصر کم ہی کیوں نہ ہو اس نے بروفنسا کی شاعری پر بہت اثر کیا۔ بروفنسا کی زبان اٹلی وغیرہ میں بھی بولی جاتی تھی عربی زبان سسلی۔ بروفنسا۔ اٹلی میں

سعر و شاعری کی عام زبان ہوگئی تھی عربی فوج اور ان کے سپہ سالار قیس قوافی کا ذکر دلوں پر اثر کرتے تھے اس کی اشاعت میں وہ لوگ بہت سرگرم تھے ان مقامات کے پرانے طبقوں کے گیتوں کا بڑا حصہ اور ولایت جوالکین کے شعرا کے بہت سے گانے صرف اندلس کے عربی شعرا کے قصائد پر مشتمل تھے عربی شاعری جہاں گئی وہاں شعر گوئی کا مذاق بڑے زور و شور کے ساتھ فروغ پاتا رہا بے شمار اشعار ایک دوسرے تک منتقل ہوتے تھے ادنیٰ اعلیٰ سب ہی اس کے مداح نظر آتے تھے لفظوں کے اُتار چڑھاؤ اور ترنم سے محظوظ ہوتے تھے اس زمانے میں فرانسیسی زبان اور اس کے ادب کو ایسی صورتِ حال پیش آئی جو ان حالات میں قدرتاً زبانوں کو پیش آتی ہے اس زمانہ میں مسلمہ طور پر عرب اور یونان بہت زیادہ متمدن تھے اس لئے فرانسیسی زبان قدرتاً عربی زبان سے متاثر ہوئی سڈلیو [illegible] لکھتا ہے کہ فرانسیسی زبان میں لاطینی زبان سے زیادہ عربی زبان کی نادر تعبیریں داخل ہوئیں لامنس [illegible] کے بیان کے مطابق فرانسیسیوں نے اپنی زبان میں تو سو عربی الفاظ داخل کئے[1] عربوں نے شاعری کی جو روح مغرب میں موشح اور زجل کی صورت میں پھونکی تو ان لوگوں کو جو عربی میں ماہر ہو رہے تھے اس سے حد درجہ شغف ہوا یورپ میں شاعری کی ترقی ابھی نہیں ہوئی تھی صرف کچھ گانے اور گیتیں اس کی شاعری تھی "عربوں کے اختلاط نے یورپ کو لاطینی اقوام کے شعر کے معنی بتلائے اور جو چیز پسند آئی اسکو عربوں سے سیکھا اور عربوں کی شاعری کے دوسرے اصناف رزم، بزم، عشق و محبت کو کام میں لائے۔" (تمدنِ عرب از لیبان) ابو عبد اللہ نے جب سے اپنا درد انگیز موشحہ اپنی محبوبہ مریم کی قبر پر پڑھا تھا اس وقت سے شاید ہی کوئی امیر ہوگا جس کے نام کو عاشقانہ قصیدوں یا رزمیہ نظموں نے زندہ نہ رکھا ہو اس میں اشبیلیہ [illegible] کا آخری بادشاہ معتمد نا قابل فراموش ہے پادری حضرات بھی تاثرات سے خالی نہ تھے بلکہ تقریباً عربی تمدن کے نمائندے نظر آنے لگے تھے ان میں شاعری کا شوق پیدا ہو گیا تھا قرطبہ [illegible] طلیطلہ [illegible] اشبیلیہ [illegible] اور غرناطہ [illegible] کے

---

[1] فرانسیسی عربی مشتق الفاظ پر ایک نظر از لامنس

اور اسی علم کی وجہ سے فرانس اور اٹلی میں اتنا تفوق حاصل کیا کہ مسند پوپ پر "المرتبۃ البابویۃ"
۹۹۹ سے ۱۰۰۳ تک سلفستر دوم Silvester II کے نام سے فائز رہا۔ جب اندلس سے
ایک متبحر عالم ہو کر واپس ہوا اس کے علم و فضل کو دیکھ کر لوگوں نے اس کو جادوگر سمجھا
بادشاہوں نے اپنے لڑکوں کی تعلیم کے لئے ان کو منتخب کیا یہی وہ شخص ہے جس نے ارقام
عربی کو جس کو ہم ارقام ہندسی کہتے ہیں یورپ میں رائج کیا۔ ورنہ وہ لوگ لاطینی زبان کو
بمنزلہ حروف ابجد یہ استعمال کرتے تھے۔ طلبہ اس کے پیچھے پیچھے دوڑے اور شعراء عرب اور
ان کے ادیبوں کی تقلید کرنے لگے فرانس کے لوگ جو عرب کے پڑوسی تھے لاطینی زبان سے
اعراض کرنے لگے اور عربی اشعار اور ان کے ازجال سیکھنے کی طرف مائل ہو گئے اسپین کی
شاعری نے رسمیاتی قیود سے آزادی حاصل کر کے نئی نئی بحریں اور دلکش طرز اختیار کر لیا
تھا جو جدید شاعری میں نمایاں ہے رزمیہ نظمیں اور عشقیہ غزلوں میں روحانی احساسات کو
ظاہر کیا جانے لگا تھا نغمہ و موسیقی اور حسن ترنم شاعری کی جان تھی اسی طرز شاعری سے نصاریٰ
بہت متاثر ہوئے اور عربی تغزل کے دونوں طریقوں موشحات اور ازجال کو قشتالیہ
castilian کی مقبول طرز Villancica کی صورت میں فروغ ہوا اس طرز کو عیسائی
گیتوں اور میلاد مسیح کی نظموں میں استعمال کرتے تھے اسپین نے اس خاص طریقہ کی ترقی کی
جس کو Muwash shah strophic measures کہتے ہیں جس کی ایک قسم موشح
(Kharja) ہے اور اسی کا ایک جز زجل Zazal یا Estribillo ہے
جو ولانسیکو Villancico کے بالکل مماثل و مشابہ ہے ان کے باہمی مماثل و
انطباق میں شک و شبہ کی گنجائش نہیں یہ کسی طرح قرین قیاس نہیں کہ ایسا انطباق صرف
مصطلحات تک محدود رہے یا صرف ایک قسم کی شاعری میں رہے اگرچہ Romance
افسانوی نظم میں مستند عربی عنصر کم ہی کیوں نہ ہو اس نے بروفنسا کی شاعری پر بہت اثر
کیا۔ بروفنسا کی زبان اٹلی وغیرہ میں بھی بولی جاتی تھی عربی زبان سے ملی۔ بروفنسا۔ اٹلی میں

سعر و شاعری کی عام زبان ہوگئی تھی عربی فوج اور ان کے سپہ سالار قیس قوانی کا ذکر دلوں پر اثر کرتے تھے اس کی اشاعت میں وہ لوگ بہت سرگرم تھے ان خطابات کے پرانے طبقوں کے گیتوں کا بڑا حصہ اور ولایت جو الکین کے شعرا کے بہت سے گانے صرف اندلس کے عربی شعرا کے قصائد پر مشتمل تھے عربی شاعری جہاں گئی وہاں شعر گوئی کا مذاق بڑے زور و شور کے ساتھ پھیلتا رہا بے شمار اشعار ایک دوسرے تک منتقل ہوتے تھے ادنیٰ اعلیٰ سب ہی اس کے مداح نظر آتے تھے لفظوں کے اتار چڑھاؤ اور ترنم سے محظوظ ہوتے تھے اس زمانے میں فرانسیسی زبان اور اس کے ادب کو ایسی صورت حال پیش آئی جو ان حالات میں قدرتاً زبانوں کو پیش آتی ہے اس زمانہ میں مسلم طور پر عرب اور یونان بہت زیادہ متمدن تھے اس لئے فرانسیسی زبان قدرتاً عربی زبان سے متاثر ہوئی سڈ یلیو Sedelaat لکھتا ہے کہ فرانسیسی زبان میں لاطینی زبان سے زیادہ عربی زبان کی نادر تعبیریں داخل ہوئیں لامنس Lammens کے بیان کے مطابق فرانسیسیوں نے اپنی زبان میں تو سو عربی الفاظ داخل کئے عربوں نے شاعری کی جو روح مغرب میں موشح اور زجل کی صورت میں پھونکی تو ان لوگوں کو جو عربی میں ماہر ہو رہے تھے اس سے حد درجہ شغف ہوا یورپ میں شاعری کی ترقی ابھی نہیں ہوئی تھی صرف کچھ گانے اور گیتیں اس کی شاعری تھی "عربوں کے اختلاط نے یورپ کو لاطینی اقوام کے شعر کے معنی بتلائے اور جو چیز پسند آئی اسکو عربوں سے سیکھا اور عربوں کی شاعری کے دوسرے اصناف رزم، بزم، عشق و محبت کو کام میں لائے۔" (تمدن عرب از لیبان) ابو عبداللہ نے جب سے اپنا درد انگیز موشحہ اپنی محبوبہ مریم کی قبر پر پڑھا تھا اس وقت سے شاید ہی کوئی امیر ہوگا جس کے نام کو عاشقانہ قصیدوں یا رزمیہ نظموں نے زندہ نہ رکھا ہو اس میں اشبیلہ Seville کا آخری بادشاہ معتمد ناقابل فراموش ہے پادری حضرات بھی تاثرات سے خالی نہ تھے بلکہ تقریباً عربی تمدن کے نمائندے نظر آنے لگے تھے ان میں شاعری کا شوق پیدا ہوگیا تھا قرطبہ Cordova طلیطلہ Toledo اشبیلیہ Seville اور غرناطہ Granada کے

لے فرانسیسی عربی مشتق الفاظ پر ایک نظر از لامنس

سرچشموں سے تشنگان علوم اپنی پیاس بجھانے دور دراز ممالک سے آتے تھے اس طرح درمیانی تبدیلی کا ایک آلہ medium of transmission یہی زجل اور اس کا مقابل و مماثل [illegible] تھا خوش قسمتی سے اس خاص قسم کے ادب کا قیمتی حصہ زمانہ کے دست برد سے محفوظ رہ گیا تھا تقریباً ۱۵۰ قطعات ہیں جن کو ایک اندلسی شاعر ابن قزمان[1] نے بارہویں صدی کے ابتداء میں مخلوط محاورہ میں لکھا تھا ابن قزمان تروبادور troubadour کا ہم عصر تھا اس کی شاعری کی مصطلحات قوافی عروض و اوزان کے لحاظ سے بالکل عربی ہیں بحر یا لفظی accentual میں ارکان بھی کے مطابق نہیں (syllabic) اس نے اپنے ابیات نہایت ہوشیاری سے نظم کئے ہیں جو گانے والی جماعت کے ذوق کے مطابق ہے کیوں کہ اس کی اکثر نظمیں بقول Ribera ایک ڈرامائی اور افسانوی داستان ہے جو سڑکوں پر گانے والی جماعت کے لئے لکھی گئی ہیں ان ابیات کا موازنہ بروفنسالی شاعر کے مقفی طریقہ کار سے ایک نمایاں مطابقت ظاہر کرتا ہے William of Poiter کی نظمیں ان بحروں میں لکھی گئی ہیں جو ابن قزمان کی بحروں کے بالکل مماثل ہیں بلکہ بعض تھوڑی سی تبدیلی کے ساتھ اس تجویز کی ہم آہنگی کے مطابق معلوم ہوتے ہیں جو گویوں کی جماعت کے لئے بنایا گیا تھا۔ اور Provencal بروفنسالی شاعری میں جو اوزان و قوافی کا استعمال پایا جاتا ہے اور بالیقین پایا جاتا ہے اس کے وجود کا کوئی بنیادی ثبوت ان کے یہاں نہیں ہے بخلاف اس کے اندلسی گویوں کی شاعری اب تک ان کی مقفی اور موزوں شاعری میں موجود ہے جس کا اثر بروفنسال Provencal شاعری سے الفانسو کی نظموں میں یا متاخرین اندلسی شاعروں کے اشعار میں اب بھی ممتاز کیا جا سکتا ہے۔ بہرحال فرانسیسیوں کے فقراء و مساکین گیارہویں صدی میں اشعار پڑھتے اور عربی مداح خوش الحانی سے گاتے تھے اور دروازہ دروازہ راستے راستے دست سوال دراز کرتے تھے تو لوگ ان کے الفاظ کے حسن ترنم کو سن کر مسحور ہو جاتے تھے اور داد و دہش کی بارش ہونے لگتی تھی اور یہ ان کے اقوال کے فہم و ادراک یا نزاکت کی وجہ سے

---

[1] Legacy of Islam

نہیں بلکہ غایت شوق میں کہ کس قدر خوش لحن اور خوش نغمہ اور سرور افزا یا دردناک قوافی میں
گاتے ہیں رومانی زبان دو حصوں میں منقسم ہوگئی تھی ایک کا نام لسان اوق (۱) Langued
oc تھا اس کو اہلِ جنوب خاص کر بروفنسا Provence کے رہنے والے بولتے
تھے دوسرے کا نام لسان اویل Langue d'oil تھا اس کو اہلِ شمال خاص کر جزیرہ
فرانسا France بولتے تھے اور یہ وہ حکومت ہے جس کا دار السلطنت پیرس Paris
ہے شمالی شعراء کو تروفیر Trouvère کہتے تھے اور جنوبی شعراء کو تروبادور Troubadour
کہتے تھے تروبادور وہ لوگ ہیں جو بروفنسا کی حکومت میں مداحوں کی ایک قسم تھی یہ لوگ
ایک محل سے دوسرے محل ایک قلعہ سے دوسرے قلعہ کی طرف چکر لگایا کرتے تھے اپنے
قصائد کو گاتے تھے امراء اور ذی وجاہت لوگوں کی تعریف کرتے تھے اور اپنے ادب کو علم مطرز
[illegible] کہتے تھے ان کے اشعار میں عرب کی طرح قوافی کا استعمال نہیں ہوتا تھا بجائے
قوافی کے ان کے یہاں وقف کرنے کے لئے جگہ یعنی مرکز موقف ہوتے تھے جیسے وہ اشعار
جن کو بکریوں کے چرواہے گاتے تھے ہاں اس شاعری کا ایک فن ضرور تھا جس کو وہ لوگ
تنسون Tenson کہتے تھے جو اندلسی شاعری سے مشابہ تھی اہلِ علم کا بالکل اتفاق ہے
قوافی بروفنسال شاعری میں پہلی مرتبہ داخل ہوئی اور وہ بالکل عرب سے ماخوذ ہے[1] فرانسیسیوں
کے نزدیک قافیہ شعر کے ہر دو بیت یا ہر دو قطعہ کے اخیر میں صوتی حروف کے اخیر والے حرف
کا اور اس کے مابعد والے ساکن حرف کا متحد ہونا ہے جیسے ساج و باج Sage, Page
لہذا جس چیز کو سماع اور تقلید سے لیا وہ علم قوافی ہے اس سے پہلے وہ لوگ قافیہ کے عوض
میں اسونانس Assonance استعمال کرتے تھے اور اس کے معنی شعر کے ہر دو بیت کے
اخیر میں صوتی حروف کے اخیر والے حرف کا متحد ہونا اور اس کے بعد والے ساکن حرف کا
کوئی لحاظ نہ ہونا ہے جیسے ساج Sage اور آرم Arme جن حضرات نے سائنس فلسفہ

---

[1] تاریخ الادب لافرنج والعرب از روحی بک الخالدی

ادب ۔ علم تجارت وزراعت نیز مذہبی کتابوں کا مطالعہ کیا ہے وہ بطریق احسن جانتے ہیں
کہ مراقشی عرب کا اثر لاطینی پر کتنا ممتاز و نمایاں ہے موجودہ شاعری میں قوافی کا جو وجود ہے اہل
قوافی سے یونان والے بھی ناواقف تھے کہیں کہیں لاطینی زبان میں پتہ ملتا ہے مگر وہ موجودہ
قوافی و اوزان سے بالکل مغائر تھی مقاصد بھی جداگانہ تھے یہ صرف عربوں کی ترکیب میں
مطابقت کے لئے وضع کی گئی تھی اس کا مقصد شعر کے اختتام کی نشان دہی کے لئے نہ تھا
بلکہ مفہوم کی نشان دہی کے لئے تھا ایک فعل Verb یا ایک اسم Noun ایک دوسرے
کے مقابل استعمال کیا جاتا تھا اور اس تکرار Repetition کا اثر یہ ہوتا تھا کہ شاعر مطابق اور
باہم مشابہ خیالات کو تین یا چار شعر تک جاری رکھ رہا ہے اس کے بعد قوافی و اوزان کا
سلسلہ منقطع ہو جاتا تھا قرونِ وسطیٰ کی لاطینی نظموں میں قوافی کا استعمال زیادتی کے
ساتھ ملتا ہے یعنی آٹھویں یا نویں صدی میں لیکن یہ یاد رکھنا چاہیئے کہ لاطینی اور عربوں کا اختلاط
آٹھویں صدی میں ہوا لہٰذا قرین قیاس یہی ہے کہ لاطینی زبان کی پہلی مقفّی شاعری عربوں ہی
سے لی گئی ہے بالکل یہی حال جرمن کی مقفّی شاعری کا ہے یہ بھی ممکن ہے کہ قوط (گاتھ)
Goths نے قوافی کو ان مشرقی ممالک سے جہاں سے وہ نکلے تھے یورپ میں رائج کیا ہو
لیکن شعر کی قدیم صورت ٹیوٹانک قوم Tutonic Nation میں اسکینڈینیویا Scandinavia
سے لی گئی تھی جس میں ردیف Alliteration تو تھی مگر قافیہ Rhyme نہ تھا۔ ردیف
کے معنی الفاظ کی ابتدا میں انھیں حروف کو بار بار لانا ہے نہ کہ ختم پر اسی آواز کو دہرانا اور تکرار نا
ذیل میں اسی ردیف Alliteration کی جو قافیہ کی جگہ مستعمل تھی مثال لکھی جاتی ہے:

---

۱ Hell verhaissen.

It is an example os the alliterations which supplied
۱ the place of rhyme The lines are orm the German imitation
of Fouque. (Sismondi. An historical review of the literature of
south of Europe)

Halo mein ohein
Kurz nein laban kuhn nein lust;
Rasch mein rasch,
Raab der ausgang,
Fliessend blut in Nyungenstam

یہی ردلیف Alliteration شمالی زبانوں کا زیور تھا اور جنوبی اقوام کے یہاں اسونانس Assonance کا استعمال نمایاں تھا لیکن قوافی جو عربی کی ہر اصناف کی شاعری کے لوازمات میں سے تھی اندر ہے اور جو کانوں کے لئے خوش آیند تھے اس کو تر دبادور نے بردفانسال شاعری میں روشناس کرایا عربی شاعری میں ان قوافی کا استعمال نظم کے اختتام تک جاری رہتا ہے اور درمیان میں کہیں یہ سلسلہ منقطع نہیں ہوتا جیسا کہ Nibelungen کی شاعری میں ہوتا ہے اسی طرح یہ اندلسی عربی شاعری کی قدیم خصوصیت ہے شہنشاہ فریڈرک Frederick جس نے بہت سے قصائد عربی میں لکھے ہیں کی ایک مشہور نظم ثابت کرتی ہے کہ قوافی کا بالکل یہی سلسلہ بردفنسال شاعروں نے استعمال کیا ہے۔ یہ شہنشاہ جو تقریباً تمام زبانوں سے واقف تھا ریمونڈ برنجر II کا ڈنش آف پراڈنس Raymond Berger II Count of Provence سے تورن Turan میں ۱۱۶۲ء میں ملا اور اس کو خلعت و جاگیر دی کاڈنش مذکور کے ساتھ بہت سے شعرا تھے جو اس کی قوم کے تھے ان شاعروں نے فریڈرک کو اپنے اعلیٰ اعلیٰ نازک خیالات کی کثرت اور اشعار کی ہم آہنگی اور اجزا کی باہمی مطابقت سے بہت خوش کیا جس کا فریڈرک نے ان الفاظ میں جواب دیا :-

French	English Translation
Plas mi cavalier Francez	A Frenchman I'll have for my cavalier
ela donna catalana.	And a Catalonian dame.

El onrat del Ginoes, A Genoese for his honour clear,
E la court de Castellana, And a court of Castilian fame;
Los cantar Provencalez The Provencal songs my ear to please,
E la danza Trevisana, And the dances of Trevisan.
E lou corps Aragones, I'll have the grace of the Arragonese,
E la perla Juliana, And the pearl of Julian;
La mans e kora de l'Angles An Englishman's hands and face for me,
E lou donzel de Toscana And a youth I'll have from Tuscany.

عربی شاعری میں بھی ہر شعر کا دوسرا مصرعہ اکثر اسی حرف پر ختم ہوتا ہے اور اسی تکرار کو بروفنسال نے اسی طرح سے اختیار کیا اسی کی ایک دوسری شاندار مثال Geofreyde Rudel کے اشعار میں پائی جاتی ہے یہ بروفنسا کے Blieux کا ایک شریف زادہ تھا اور ان لوگوں میں تھا جن کو Frederick Barbarossa کے سامنے ۱۱۵۰ھ میں پیش کیا گیا تھا یہ اشعار حسب ذیل موقع پر لکھے گئے تھے :- کچھ بہادران سرزمین مقدس Holy Land سے واپس ہو کر تریپولی Tripoli کی شہزادی (Countess) کی شاندار مہمان نوازی کی پرجوش تعریف کی جیفری روڈل Geoffry Rudel بن دیکھے عاشق ہو گیا اور اپنے ایک دوست Bertrand d'Allamanon کو جو اسی کی طرح تروبادور تھا ساتھ لے کر لیون Levant گیا اور جہاز پر سوار ہو کر سرزمین مقدس پہنچا راستے میں شدید بیمار ہو گیا اور جب تریپلی Tripoli کے بندرگاہ پر پہنچا تو بولنے کی طاقت بھی نہ تھی جب شاہزادی کو اطلاع ہوئی کہ ایک مشہور شاعر اس کے عشق میں مر رہا ہے تو وہ جہاز ہی پر جا کر اس سے ملی اس کو ہاتھوں ہاتھ لیا اور اس کو ڈھارس دلایا اور خوش کرنے کی کوشش کی تاکہ اس کے رگ و ریشہ میں کچھ قوت آجائے جیفری نے قوت گویائی کو محسوس کر کے تہ دل سے اس کا شکریہ

الترجمۃ الفرنساریۃ French پروفنسال Provench

En luec que sia ny begui ueud En lieu qui soit ni beau ni bon

الترجمۃ الانجلزیۃ <u>English translation</u>

Angry and sad shall be my way
If I behold not her afar.
And yet I know not when that day,
Shall rise for still she dwells afar,
God, who hast formed this fair array,
of worlds, and Placed my love afar,
Strengthen my heart with hope, I pray.
of seeing her I love afar.
oh, Lord believe my faithfully,
for well I love her though afar,
Though but one blessing my repay.
The thousand griefs I feel afar.
No other love shall shed its ray.
on me, if not this love afar,
A brighter one, where so I stray
I shall not see, or near or far.

دیکھئے یہاں پروفنسال شاعری کی نظم کے قوانی کی مطابقت کے لئے تراجم میں بھی قوانی کا لحاظ رکھا گیا تروبادور ہمیشہ اسی خاص طرز ہی کے پابند نہیں رہے جو بالکل عربی ہے

بلکہ انھوں نے ہزاروں مختلف قسم کے قوانی بنائے یہی قوانی بروفنسال شاعری کی بنیاد تھے جہاں سے کہ یہ موجودہ یورپ کی کل قوموں کی شاعری میں رینگ گئے اعداد اور تلفظ کے نشانات اور لب ولہجہ عربی ہی طریقہ کو نقل کرکے بروفنسال شعراء نے اختیار کیا بروفنسالی شعراء نے قوانی کا استعمال تیرہویں صدی میں کیا عرب سے نظم میں مدح۔ غزل۔ نسیب ہجو اور ہزل لیا جس کا نام لیریک c .. ہےکہ اور ساتیریک satire ہے جیسا کہ نثر میں قصص ملح۔ ضرب الامثال لیا بعض ایسی چیزیں بھی ہیں جن کو نثر کی حالت میں نقل کرکے نظم کردیا اگر عرب کے جنوبی پروسی اوران کی لغت ادق Langnedoc کے لئے غلبہ ہوتا تو ہم فنون عربیہ کی بہت سی چیزوں کو موجودہ فرانسیسی زبان میں ضرور پاتے لیکن غلبہ شمالی باشندہ اور ان کی لغت اویل Langue d'oil کو ہوا اوران کے تروفیر Trouveres شعراء سوائے حماسی اشعار کے اور کچھ نہ جانتے تھے ان کے قصائد چھوٹے چھوٹے ہوتے تھے اور بیت کی تالیف اس طرح کی جاتی تھی کہ ان میں قافیہ نہ ہوتا تھا ہاں ان کے یہاں اسونس Assonance ضرور تھا جیسا کہ اغانی رولاں۔ Chanson de Roland میں دیکھا جا سکتا ہے تیرہویں صدی میں تروفیر شعراء تروبادور کے طریقہ پر اشعار کہنے لگے اوران سے قوالی۔ رقت غزل۔ لحن موسیقی سیکھا ان کے شہ سوار عرب کے شہ سواروں کی تقلید کرنے لگے اور سوار کی فضیلت سواری میں مہارت۔ اشعار کی یادداشت۔ اور شطرنج کے کھیل پر موقوف ہوگئی ان کی شاعری میں عربی قوانی کے داخل ہونے سے ایک لطیف حسن پیدا ہوگیا یہیں پر ایک بات اور قابل غور ہے وہ یہ کہ ابن قزمان کی نظموں میں اندلس کے درباری شعراء کے بلند خیالات اور عام نظموں کی صحیح داستان کا پتہ نہیں ملتا اگرچہ Portiers nillamaf کے بعض کارنامے اسی قسم کی اخلاقیات سے دور نہیں ہیں مگر پھر بھی اندلسیوں کی اس عام نظم کا لب ولہجہ بروفنسا کی رسمی شاعری سے جوان کی درباری شاعری کا نمونۂ کمال ہے بالکل مختلف معلوم ہوتا ہے لیکن ابن قزمان تو عربی اندلسی معاشرت کے ایک حیرت انگیز انحطاط کی نمائندگی کرتا

... ہوتا ہے اس سے غالب یہ معلوم

... بارہویں صدی میں جب اندلس

کا عرب ... بھی کا نمونہ کمال بطریق احسن منعکس ہے اس قسم

کی چھاپوں سے جن سے اندلسی درباری شاعری اور پرووفنسال کی شاعری کا منطبق اور باہم متاثر

ہونے کا ثبوت ملتا ہے تبدیلی اور تاثیری اصول کو رد نہیں کیا جا سکتا اس کے علاوہ اندلسی

اور پرووفنسال شاعری کی ہم آہنگی اور نغمہ و لحن کی باہمی یگانگت بھی اس پر کافی روشنی ڈالتی

ہے Ribera نے تو خود لفظ تروبادور Troubadour کو عربی لفظ طرب سے مشتق مانا ہے جس

کے معنی گانے اور باجے کے ہیں Music + Song اور اگر تروبادور Troubadour کو

Trouver ہی سے متعلق سمجھا جائے تو بھی غور کرنے کا مقام ہے کہ عربی لفظ "وجد" [illegible]

کے معنی بھی محبت، درد اور تکلیف کے جذبات کا محسوس کرنا ہے۔ لہٰذا اگرچہ ہم

پروفیسر [illegible] کے اس قول پر پورا دھیان نہ بھی دیں "کہ جیسے یورپ مذہب میں

(Judaism) کا زیر بار احسان ہے اسی طرح رومانس Romance میں

عرب کا زیر بار احسان ہے" تب بھی صاف معلوم ہوتا ہے کہ عربی شاعری نے یورپ کی زیر بحث

شاعری پر کتنا اثر کیا ہے۔

فن تمثیل میں بھی فرانس بنیادی طور سے عرب سے متاثر نظر آتا ہے اس کی ایجاد

کنیسہ سے ہوئی یہ لوگ حضرت عیسیٰؑ کے قتل و سولی کا قصہ یا دوسری مقدس ہستیوں کے

قصے ڈرامائی طریقہ سے ظاہر کرنا چاہتے تھے اور یہ ڈرامائی طریقہ یونانیوں سے پایا تھا یہ لوگ اس

طریق سے ناواقف تھے چودھویں صدی میں لاطینی کتابوں کا ترجمہ فرانسیسی زبان میں ہوا

اور ان لوگوں نے علوم یونان اور ان کا فلسفہ عرب سے لیا اس لئے کہ خود تو یونانی زبان سے

نابلد تھے لہٰذا ارسطو Aristotle کی کتابوں کا ترجمہ اس لاطینی سے کیا جو عربی سے ترجمہ

کی گئی تھی اس طرح جب فرانس کو اسلامی زبان کے ذریعہ یونانی حکمت و فلسفہ و علوم کا پتہ

لگا تو یہ لوگ یونانی زبان سیکھنے میں مشغول ہو گئے اور ان کے اشعار تمثیل کی طرف مائل ہو گئے اور ان کے اسلوب کو اختیار کیا اس لئے کہ فن تشخیص یا تمثیل یونان اور روماں میں بکثرت تھا اور پھر فرانسیسی نے اس میں بہت ترقی کی جیسا کہ ان کے تراجیدی Tragedy اور کومیدی Comedy سے ظاہر و باہر ہے الکساندر ہاردی A. Hardy نے بار بار صفحہ Paris میں ایک تھیٹر بنایا اور اس میں بہت سی روایات کو دکھایا جس کے موضوع اسپین سے لئے گئے کیوں کہ وہاں عرب کے پڑوسی ہونے کی وجہ سے فنون ادبیہ نے ترقی کی تھی لہٰذا یہ سب ترقی بنیادی حیثیت عرب ہی کی بدولت نصیب ہوئی کیوں کہ انھیں کے مہیا کردہ علوم ان کو اس طرف مائل کرنے کے محرک ہوئے اگرچہ براہ راست ان سے تشخیص میں زیادہ نہیں لیا۔ اس لئے کہ انھوں نے خود اس فن کی طرف توجہ نہیں مبذول کی اور وہ بھی کسی خامی کی وجہ سے نہیں بلکہ یہ طوالت طلب ہے اور عرب اختصار کا عادی ہے، دوسرے عرب بر جستگو ہے اپنے علاوہ دوسرے پر نظر نہیں ڈالتا تیسرے ان کے عقیدۂ توحید نے پارینہ مضمون کو حرام قرار دیا تھا جو ڈرامائی شاعری کا بڑا عنصر ہے۔

لوئی چہاردہم XIII ... کے زمانہ کے مشہور ڈرامانگار شاعر فکیتور ہیو گو سے کون ناواقف ہے اس کا باپ یوسف بوناپارٹ Bonapart کے ساتھ اسپین گیا اور یہ مختلف سفر میں ان کے ساتھ رہا وہاں مشرقی آبادیوں کے اثرات دیکھے وہاں اس کے خیالات زیادہ وسیع ہوئے اور اندلسی شاعروں سے متاثر بھی ہوا الفاظ و معانی میں رقت پیدا ہو گئی اور اس کے اشعار میں اندلسی روح نمایاں ہو گئی اپنے قصیدہ "غرناطہ" میں اندلس کے اکثر شہروں کا ذکر کیا ہے۔ اس نے جمعیت "اکادیمیۃ لعب الازہار"

۱؎ اس تحریک سے فرانس والے یونانی اور لاطینی کے سیکھنے کی طرف جھک پڑے یہاں تک کہ لوئی چہاردہم کے زمانہ میں اپنے علوم و فنون کو خوب سنوارا مارکیزہ رامبویہ Marquise Rambouillet نے اپنا گھر ادیبوں کے لئے کھول دیا ۱۶۲۰ء میں اس میں شعراء، ادباء، نقاد بغیر طبقی تفریق کے اکٹھا ہو کر اشعار پڑھتے تھے پھر پیرس میں ایک مجلس قائم ہوئی شعراء، امراء سے ملنے لگے پہلے صرف بھیک مانگنے کے لئے مخصوص تھے پھر کاردینال رشو Cardinal نے الاکادیمیۃ الفرنسیہ قائم کیا یہ یادگار ہے ۱۵۹۶ء، ۱۶۵۰ء
Richlu French academy.

(حاشیہ پر ہاتھ سے لکھی ہوئی عبارت، ناخواندہ)

ہے عربی مصنفین نے جو دوسری مشہور نظموں کے تراجم کا حوالہ دیا ہے اس سے غلب ہی معلوم ہوتا ہے کہ دوسرے ہر دل عزیز کارناموں میں (خاص کر گیارہویں صدی میں جب اندلس کی تہذیب اوجِ کمال پر تھی) درباری شاعری کا نمونۂ کمال بطریق احسن منعکس ہے اس قسم کی شہادتوں سے جن سے اندلسی درباری شاعری اور پروفنسا کی شاعری کا منطبق در باہم ملتی ہونے کا ثبوت ملتا ہے تبدیلی اور تاثیری اصول کو رد نہیں کیا جا سکتا اس کے علاوہ اندلسی اور پروفنساں شاعری کی ہم آہنگی اور نغمہ ولحن کی باہمی یگانگت بھی اس پر کافی روشنی ڈالتی ہے Ribera نے تو خود لفظ تروبادور Troubadour کو عربی لفظ طرب سے مشتق مانا ہے جس کے معنی گانے اور باجے کے ہیں Music + Song اور اگر تروبادور Troubadour کو Trouvere ہی سے متعلق سمجھا جائے تو بھی غور کرنے کا مقام ہے کہ عربی لفظ "وجد" wajd کے معنی بھی محبت۔ درد اور تکلیف کے جذبات کا محسوس کرنا ہے۔ لہٰذا اگر ہم پروفیسر Macdonald کے اس قول پر پورا دھیان نہ بھی دیں "کہ جیسے یورپ مذہب میں (Judaism) کا زیر بار احسان ہے اسی طرح رومانس Romance میں عرب کا زیر بار احسان ہے تب بھی صاف معلوم ہوتا ہے کہ عربی شاعری نے یورپ کی زیر بحث شاعری پر کتنا اثر کیا ہے۔

فن تشخیص میں بھی فرانس بنیادی طور سے عرب سے متاثر نظر آتا ہے اس کی ایجاد کنیسہ سے ہوئی یہ لوگ حضرت عیسیٰؑ کے قتل وسولی کا قصہ یا دوسری مقدس ہستیوں کے قصے ڈرامائی طریقہ سے ظاہر کرنا چاہتے تھے اور یہ ڈرامائی طریقہ یونانیوں سے یا تھا یہ لوگ اس طریق سے ناواقف تھے چودہویں صدی میں لاطینی کتابوں کا ترجمہ فرانسیسی زبان میں ہوا اور ان لوگوں نے علوم یونان اور ان کا فلسفہ عرب سے لیا اس لئے کہ خود تو یونانی زبان سے نابلد تھے لہٰذا ارسطو Aristotle کی کتابوں کا ترجمہ اس لاطینی سے کیا جو عربی سے ترجمہ کی گئی تھی اس طرح جب فرانس کو اسلامی زبان کے ذریعہ یونانی حکمت وفلسفہ وعلوم کا پتہ

لگا تو یہ لوگ یونانی زبان سیکھنے میں مشغول ہو گئے اور ان کے اشعار تمثیل کی طرف مائل ہو گئے اور ان کے اسلوب کو اختیار کیا اس لئے کہ فن تشخیص یا تمثیل یونان اور روماں میں بکثرت تھا اور پھر فرانسیسی نے اس میں بہت ترقی کی جیسا کہ ان کے تراجیدی Tragedy اور کومیدی Comedy سے ظاہر ہو رہا ہے الکساندر ہاردی A. Hardy نے بارزِ صنعہ Paris میں ایک تھیٹر بنایا اور اس میں بہت سی روایات کو دکھایا جس کے موضوع اسپین سے لئے گئے تھے کیوں کہ وہاں عرب کے پڑوسی ہونے کی وجہ سے فنونِ ادبیہ نے ترقی کی تھی لہذا یہ سب ترقی بنیادی حیثیت سے عرب ہی کی بدولت نصیب ہوئی کیوں کہ انھیں کے مہیا کردہ علوم ان کو اس طرف مائل کرنے کے محرک ہوئے اگرچہ براہِ راست ان سے تشخیص میں زیادہ نہیں لیا۔ اس لئے کہ انھوں نے خود اس فن کی طرف توجہ نہیں مبذول کی اور وہ بھی کسی خامی کی وجہ سے نہیں بلکہ یہ طوالت طلب ہے اور عرب اختصار کا عادی ہے دوسرے عرب برجستہ گو ہے اپنے علاوہ دوسرے پر نظر نہیں ڈالتا تیسرے ان کے عقیدۂ توحید نے پارسینر مضمون کو حرام قرار دیا تھا جو ڈرامائی شاعری کا بڑا عنصر ہے۔

لوئی چہار دہم XIII کے زمانہ کے مشہور ڈرامانگار شاعر فیکتور ہیوگو سے کون ناواقف ہے اس کا باپ یوسف بونا پارٹ Bonapart کے ساتھ اسپین گیا اور یہ مختلف سفر میں ان کے ساتھ رہا وہاں مشرقی آبادیوں کے اثرات دیکھے وہاں اس کے خیالات زیادہ وسیع ہوئے اور اندلسی شاعروں سے متاثر بھی ہوا الفاظ و معانی میں رقت پیدا ہو گئی اور اس کے اشعار میں اندلسی روح نمایاں ہو گئی اپنے قصیدہ (۱۸۲۸ء) "غرناطہ" میں اندلس کے اکثر شہروں کا ذکر کیا ہے۔ اس نے جمعیت "اکادیمیۃ لعب الازہار"

۱؎ اس تحریک سے فرانس والے یونانی اور لاطینی کے سیکھنے کی طرف جھک پڑے یہاں تک کہ لوئی چہار دہم کے زمانہ میں اپنے علوم وفنون کو خوب سنوارا مارکیزہ رامبویہ Marquise de Rambouillet نے اپنا گھر ادیبوں کے لئے کھول دیا ۱۶۲۵ء میں اس میں شعراء۔ ادبا۔ تھا اس بغیر طبقی تفریق کے اکٹھا ہو کر اشعار پڑھتے تھے پھر پیرس میں ایک مجلس قائم ہوئی شعراء امراء سے ملنے لگے پہلے صرف بھیک مانگنے کے لئے مخصوص تھے پھر کاردینال رشو Cardinal نے الاکادیمیا الفرنساویہ قائم کیا یہ مرکز ارت ۱۵۹۶ء سے ۱۶۵۰ء
Richlieu French academy.

میا طلسمی تعبیرات کو فرانسیسی فقہ میں زندہ کیا اور یہ سب ترقی عربی تحریک ہی کی وجہ سے ہوئی۔

بیانِ ملکیت و تفصیلات

متعلقہ برہان دہلی
فارم چہارم قاعدہ ۸

مقام اشاعت : ۱۴۳۶ اردو بازار جامع مسجد دہلی ۶

وقفۂ اشاعت : ماہانہ

طابع کا نام : عمید الرحمٰن عثمانی

قومیت : ہندوستانی

ناشر کا نام : عمید الرحمٰن عثمانی

سکونت : ۱۴۳۶ اردو بازار جامع مسجد دہلی ۶

ایڈیٹر کا نام : عمید الرحمٰن عثمانی

قومیت : ہندوستانی

سکونت : ۱۴۱۵، اردو بازار دہلی ۶

ملکیت : ندوۃ المصنفین، جامع مسجد دہلی ۶

میں عمید الرحمٰن عثمانی ذریعہ ہذا اعلان کرتا ہوں کہ مندرجہ بالا تفصیلات میرے علم اور یقین کے مطابق درست ہیں

(دستخط طابع و ناشر)

عمید الرحمٰن عثمانی

سرپرست اعلیٰ
عالیجناب حکیم عبدالحمید چانسلر جامعہ ہمدرد

نگران اعلیٰ
حضرت مولانا حکیم محمد زماں حسینی

مدیر اعزازی
قاضی اطہر مبارکپوری

اپریل و مئی ۱۹۹۶ء

برہان

جلد ۱۱۸ شمارہ ۴-۵

دفتر رابطہ
Nadwatul-Musannefeen
4136, Urdu Bazar, Jama Masjid, Delhi-110006

نظرات

ہندوستان کی سیاست میں آجکل حوالہ کانڈ نے تہلکہ مچا رکھا ہے۔ بڑے بڑے سیاسی رہنماؤں کے نام جین کی حوالہ ڈائری میں دیکھ کر ہر شخص حیرت زدہ ہو کر رہ گیا جن رہنماؤں کی تصویر عوام الناس کے ذہن میں پاکیزہ تھی ان ہی رہنماؤں کے نام جب عوام نے جین حوالہ ڈائری میں دیکھے تو وہ سر پکڑ کر ہی رہ گئے کس پر یقین کیا جائے کون رہنما صحیح معنوں میں عوام کا خدمتگار ہے اور ملک کا وفادار ہے۔ عوام کے لئے اس کا فیصلہ کرنا ہی مشکل ہو گیا۔ جو رہنما بھرشٹاچار کے خلاف مہم چلانے کے لئے پر تول رہے تھے جین حوالہ ڈائری کے ذریعہ جب ان کے نام عوام کے سامنے مشتہر ہوئے تو کسی کو بھی اس بات پر یقین آنا مشکل تھا لیکن جب اخبارات میں روزانہ کچھ واقعات شائع ہوئے تو پھر اس پر یقین کرنے کے علاوہ کوئی چارہ ہی نہیں رہا۔ جو رہنما اپنے آپ کو دودھ کا دھلا ہوا ثابت کرتے نہ تھکتے تھے جب ان کی بابت عوام کو صحیح معلومات حاصل ہوئی تو بڑا ہی دکھ و افسوس ہوا کہ آج اخلاق و کردار کا کوئی معیار ہی نہیں رہ گیا ہے ہر شخص اپنی ذاتی اغراض کی حصولیابی کی خاطر ہر وہ کام کرنے پر آمادہ ہے جو ملک و قوم کے مفاد کے خلاف ہے۔ جبکہ ملک و قوم کا مفاد راہنماؤں کے لئے ہر طرح مقدم ہونا چاہیئے شاید یہ بیسویں صدی کا سب سے بڑا المیہ ہے کہ راہنما ہی غاصب اور راہزن بن چکے ہیں۔ اور جب یہ صورتحال ہے تو ہم کیسے ملک میں کسی قسم کا سدھار لانے میں کامیاب ہو سکیں گے قوم کی حالت کو بہتر بنانے میں ہمیں کیسے کامیابی حاصل ہو سکے گی۔ یہ سوچنے سمجھنے کی بات ہے۔

وزیر اعظم پی وی نرسمہا راؤ اس بات کے لئے یقیناً مبارکباد کے مستحق ہیں کہ انہوں

نے جین حوالہ ڈائری کے افشا ہونے کی راہ میں کسی قسم بھی مداخلت نہیں کی۔ اور انھوں نے بغیر کسی لاگ لپیٹ کے جین حوالہ ڈائری میں موجود ناموں کے خلاف سی بی آئی کی کارروائی کو منظوری دی۔ چاہے اس سے ان کی کابینہ کے بعض اراکین تک کو گرفت میں کیوں نہ آنا پڑا۔ یہ بہت بڑی بات ہے۔ اس پر جتنا وزیراعظم کو شاباشی دی جائے کم ہے ذرا تصور تو کیجئے کہ آج کے حالات میں کون ایسا مرد کا بچہ ہوگا جو اپنے خصوصی تعلقات والوں کے خلاف کسی قسم کی قانونی کارروائی کو ہونے دیگا با اثر اور طاقتور آدمی کے لئے یہ بات سب سے بڑی رسوائی کی بات ہے کہ اس کا کوئی خاص آدمی اس کے ہوتے ہوئے کسی قانونی گرفت میں پھنس جائے اور وہ نہ نکل سکے۔ لیکن یہ قابل ستائش بات ہے ہندوستان کا طاقتور ترین وزیراعظم اپنے خاص الخاص آدمی کو بھی اگر وہ ملزم ہے تو اس کی کسی بھی طرح کی مدد کرنے کے لئے قطعاً آگے نہیں بڑھتا ہے۔ اور یہ ہندوستان کی سیاست کے نئے ماحول میں یہ بڑی اہم بات ہے۔

اپوزیشن پارٹیوں کو جین حوالہ ڈائری میں موجود ناموں کے خلاف سی بی آئی کی غیر جانبدارانہ کارروائی کی تعریف و ستائش کرنی چاہیئے تھی لیکن یہاں بھی اپوزیشن نے اپنی غیر ذمہ داری کا ہی ثبوت دیا اور الٹے وزیراعظم ہی پر نکتہ چینی شروع کردی اگر جین حوالہ ڈائری میں اپوزیشن لیڈروں کے نام موجود ہیں اور ان کے خلاف کارروائی ہورہی ہے تو یہ بھی تو دیکھو کہ حکومت میں موجود کئی اراکین کے خلاف بھی تو اسی مستعدی کے ساتھ کارروائی ہوئی جس طرح اپوزیشن لیڈروں کے خلاف کارروائی کی گئی۔ مگر یہ ہندوستان کے عوام کی بدقسمتی ہی ہے کہ اسے ہندوستان کی اپوزیشن پارٹیوں میں ایسے راہنما دکھائی دے رہے ہیں جو اندر خانے کچھ ہیں اور باہر سے بڑے اچھے عوام کے محبوب رہنما نظر آتے ہیں۔ اگر وزیراعظم ملک سے بھرشٹاچار کو ختم کرنے پر آمادہ و مستعد ہیں تو اپوزیشن کا یہ فرض تھا کہ وہ اس نیک کام میں وزیراعظم کا ساتھ دیتے۔ بھرشٹاچار جس نے ہندوستانی عوام کا خون چوس رکھا ہے عوام اس

نظرات

ہندوستان کی سیاست میں آجکل حوالہ کانڈ نے تہلکہ مچا رکھا ہے۔ بڑے بڑے سیاسی رہنماؤں کے نام جین کی حوالہ ڈائری میں دیکھ کر ہر شخص حیرت زدہ ہو کر رہ گیا جن رہنماؤں کی تصویر عوام الناس کے ذہن میں پاکیزہ تھی ان ہی رہنماؤں کے نام جب عوام نے جین حوالہ ڈائری میں دیکھے تو وہ سر پکڑ کر ہی رہ گئے کس پر یقین کیا جائے کون رہنما صحیح معنوں میں عوام کا خدمتگار ہے اور ملک کا وفادار ہے۔ عوام کے لئے اس کا فیصلہ کرنا ہی مشکل ہو گیا۔ جو رہنما بھرشٹاچار کے خلاف مہم چلانے کے لئے پر تول رہے تھے جین حوالہ ڈائری کے ذریعہ جب ان کے نام عوام کے سامنے مشتہر ہوئے تو کسی کو بھی اس بات پر یقین آنا مشکل تھا لیکن جب اخبارات میں روزانہ کچھ واقعات شائع ہوئے تو پھر اس پر یقین کرنے کے علاوہ کوئی چارہ ہی نہیں رہا۔ جو رہنما اپنے آپ کو دودھ کا دُھلا ہوا ثابت کرتے نہ تھکتے تھے جب ان کی بابت عوام کو صحیح معلومات حاصل ہوئی تو بڑا ہی دکھ و افسوس ہوا کہ آج اخلاق و کردار کا کوئی معیار ہی نہیں رہ گیا ہے۔ ہر شخص اپنی ذاتی اغراض کی حصولیابی کی خاطر ہر وہ کام کرنے پر آمادہ ہے جو ملک و قوم کے مفاد کے خلاف ہے۔ جبکہ ملک و قوم کا مفاد راہنماؤں کے لئے ہر طرح مقدم ہونا چاہیئے۔ شاید یہ بیسویں صدی کا سب سے بڑا المیہ ہے کہ راہنما ہی غاصب اور راہزن بن چکے ہیں۔ اور جب یہ صورتحال ہے تو ہم کیسے ملک میں کسی قسم کا سدھار لانے میں کامیاب ہو سکیں گے قوم کی حالت کو بہتر بنانے میں ہمیں کیسے کامیابی حاصل ہو سکے گی۔ یہ سوچنے سمجھنے کی بات ہے۔

وزیر اعظم پی وی نرسمہاراؤ اس بات کے لئے یقیناً مبارکباد کے مستحق ہیں کہ انہوں

نے جین حوالہ ڈائری کے افشاء ہونے کی راہ میں کسی قسم بھی مداخلت نہیں کی۔ اور انھوں نے بغیر کسی لاگ لپیٹ کے جین حوالہ ڈائری میں موجود ناموں کے خلاف سی بی آئی کی کارروائی کو منظوری دی۔ چاہے اس سے ان کی کابینہ کے بعض اراکین تک کو گرفت میں کیوں نہ آنا پڑا۔ یہ بہت بڑی بات ہے۔ اس پر جتنا وزیراعظم کو شاباشی دی جائے کم ہے ذرا تصور تو کیجیے کہ آج کے حالات میں کون ایسا مرد کا بچہ ہوگا جو اپنے خصوصی تعلقات والوں کے خلاف کسی قسم کی قانونی کارروائی کو ہونے دیگا با اثر اور طاقتور آدمی کے لئے یہ بات سب سے بڑی رسوائی کی بات ہے کہ اس کا کوئی خاص آدمی اس کے ہوتے ہوئے کسی قانونی گرفت میں پھنس جائے اور وہ نہ نکل سکے۔ لیکن یہ قابلِ ستائش بات ہے ہندوستان کا طاقتور ترین وزیراعظم اپنے خاص الخاص آدمی کو بھی اگر وہ ملزم ہے تو اس کی کسی بھی طرح کی مدد کرنے کے لئے قطعاً آگے نہیں بڑھتا ہے۔ اور ہندوستان کی سیاست کے نئے ماحول میں یہ بڑی اہم بات ہے۔

اپوزیشن پارٹیوں کو جین حوالہ ڈائری میں موجود ناموں کے خلاف سی بی آئی کی غیرجانبدارانہ کارروائی کی تعریف و ستائش کرنی چاہیئے تھی لیکن یہاں بھی اپوزیشن نے اپنی غیر ذمہ داری کا ہی ثبوت دیا اور الٹے وزیراعظم ہی پر نکتہ چینی شروع کردی اگر جین حوالہ ڈائری میں اپوزیشن لیڈروں کے نام موجود ہیں اور ان کے خلاف کارروائی ہورہی ہے تو یہ بھی تو دیکھو کہ حکومت میں موجود کئی اراکین کے خلاف بھی تو اسی مستعدی کے ساتھ کارروائی ہوئی جس طرح اپوزیشن لیڈروں کے خلاف کارروائی کی گئی۔ مگر یہ ہندوستان کے عوام کی بدقسمتی ہی ہے کہ اسے ہندوستان کی اپوزیشن پارٹیوں میں ایسے راہنما دکھائی دے رہے ہیں جو اندر خانے کچھ ہیں اور باہر سے بڑے اچھے عوام کے محبوب رہنما نظر آتے ہیں۔ اگر وزیراعظم ملک سے بھرشٹاچار کو ختم کرنے پر آمادہ و مستعد ہیں تو اپوزیشن کا یہ فرض تھا کہ وہ اس نیک کام میں وزیراعظم کا ساتھ دیتے۔ بھرشٹاچار جس نے ہندوستانی عوام کا خون چوس رکھا ہے عوام اس

سے تنگ آچکے ہیں۔ آنے والے انتخابات میں عوام وزیراعظم کے اس کام کو آگے بڑھانے کے لئے یقیناً دوبارہ کانگریس کو موقع دیں گے تاکہ وہ اپنے ادھورے کاموں کو جو عوام الناس کی فلاح و بہتری کے لئے ہیں، ان کو پورا کرسکیں۔ اور ملک سے بھرشٹاچار کی جڑوں کو اکھاڑ پھینکا جاسکے۔

ہندوستان کے بڑے بڑے شہروں میں جہاں آبادی بڑھ رہی ہے وہاں اسی کے ساتھ گندگی بھی اور غنڈہ گردی بھی دونوں ساتھ ساتھ بڑھ رہی ہیں۔ موٹروں کی بھرمار سے دھواں اس قدر بڑھتا جارہا ہے کہ لوگوں کا سانس لینا بھی دوبھر ہوگیا ہے جگہ جگہ کوڑے کے ڈھیر لگے ہوئے ہیں۔ جس سے شہروں میں مچھر اور کیڑے مکوڑے شہریوں کی زندگی میں زہر گھول رہے ہیں۔ ارباب حل و عقد کی توجہ اسطرف جب بھی جاتی ہے تو کچھ مخصوص علاقوں میں صفائی کی مہم شروع کردی جاتی ہے۔ لیکن جب ارباب حل و عقد کی توجہ ختم ہوجاتی ہے تو صفائی کی مہم بھی اسی کے ساتھ ختم ہوجاتی ہے۔ ضرورت اس بات کی ہے کہ شہروں میں ہر جگہ صفائی و ستھرائی کا خاص خیال رکھا جائے جس سے بیماری وغیرہ کو دور بھگایا جاسکے۔ ملک کے عوام کی صحت و تندرستی ملک کی خوشحالی و ترقی کا باعث ہوگی اس میں کسی شک کی گنجائش نہیں ہے۔ اسی طرح شہروں میں لار اینڈ آرڈر کا مسئلہ ہے سرکار ہر شہری کے تحفظ کی ضامن ہے۔ زناکاری، اغوا اور قتل کی واردات سے روزانہ اخبارات کے صفحات بھرے نظر آتے ہیں۔ کسی بھی ملک میں اس قسم کی وارداتیں ملک کی ترقی و فلاح میں یقیناً رکاوٹ ہیں۔ غنڈہ گردی کا سدّباب ہونا بہت ضروری ہے۔ اغوا اور قتل کی وارداتیں ختم ہونی چاہئیں یہ ہر شہری کا مطالبہ ہے اور حکومت کا فرض ہے کہ وہ عوام کے اس مطالبہ کو پورا کرنے کے لئے لار اینڈ آرڈر کی مشنری کو چست بلکہ فعال بنائے۔ اور سختی کے ساتھ غنڈہ گردی، زناکاری اور قتل و ڈکیتی کے خاتمہ کیلئے مناسب اور کارآمد تدابیر اختیار کرے۔

ہندوستانی عوام کا مسیحا، ملک کا سچا خیر خواہ خیر اندیش غریبوں و یتیموں کا ہمدرد، عالم انسانیت کا محبوب عالی جناب حکیم عبدالحمید صاحب دامت برکاتہم اپنی خداداد قابلیت و خدمات کے طفیل علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کے چانسلر کے پُرعظمت منصب پر عوام کے ہر حلقہ کی چاہت و پسند سے منتخب ہو گئے۔ یہ دراصل ہندوستانی عوام کی تو کامیابی ہے ہی مگر علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کے چانسلر کے عہدہ پر عالی جناب حکیم عبدالحمید صاحب کے منتخب ہونے سے عہدۂ چانسلر کی بھی عزت و توقیر میں اضافہ ہوا ہے۔ ہم دل کی گہرائیوں سے پوری ہندوستانی قوم کی ترجمانی کے فرائض انجام دیتے ہوئے مبارک باد پیش کرتے ہیں عالیجناب حکیم عبدالحمید صاحب مدظلہ العالی کو انہوں نے اپنی بے پناہ مصروفیات کے باوجود علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کے چانسلر کے عہدہ کو قبول فرمایا اور ان تمام حضرات کو جنہوں نے اس عہدہ کے لئے صحیح و قابل ہستی کا انتخاب فرمایا — بانیٔ مسلم یونیورسٹی کی روح جنت میں آج خوشی و مسرت سے جھوم رہی ہو گی کہ بڑی مدت کے بعد مسلم یونیورسٹی علی گڑھ کو ان کے خوابوں کا صحیح و خیر اندیش رہبر و رہنما نصیب ہو گیا۔

عالی جناب حکیم عبدالحمید صاحب قبلہ کے لئے مندرجہ بالا سطریں لکھ کر دل و دماغ میں مسرت و خوشی کی کرنیں پیدا کر ہی رہے تھے کہ معاً یہ خبر دل و دماغ میں غم و افسوس کی بجلی بن کر کود گئی کہ عالی جناب حکیم عبدالحمید صاحب غسل خانہ میں پھسل کر گر گئے اور ان کی کولہے کی ہڈی ٹوٹ گئی جس کی وجہ سے انھیں فوراً ہمدرد نگر مجیدیہ اسپتال میں داخل کرا دیا گیا۔

اللہ تعالیٰ سے دعا ہے کہ اپنے اس نیک بندہ کو جس کا ہر لمحہ ہر پل اور ہر وقت کا ایک ایک منٹ بندگانِ خدا کے دکھ درد کو سننے اور ختم کرنے میں صرف ہوا ہو اور جس کا دن اور رات ملک و قوم کی فلاح و بہتری میں بیت رہا ہو۔ مکمل صحت یابی و تندرستی سے ہمکنار فرما، سلامتی و عمر درازعطا فرما۔ آمین ثم آمین۔

قرآنِ حکیم میں ہندی الاصل الفاظ

ڈاکٹر مقصود احمد شعبۂ عربی، بڑودہ یونیورسٹی، بڑودہ

عرب و ہند کے مابین یوں تو زمانۂ قدیم سے تعلقات چلے آرہے ہیں لیکن ۲۰۰۰ ق م[1] یا پھر بقولِ ڈاکٹر مقبول احمد تیسری صدی[2] قبلِ مسیح سے باقاعدہ تجارتی تعلقات کا پتہ چلتا ہے اور اس سلسلے میں تاریخی شہادتیں بھی ملتی ہیں۔ یہی نہیں بلکہ عہدِ عتیق[3] (Old Testament) سے بھی اس کی تائید و توثیق ہوتی ہے۔ ان دیرینہ اور صدیوں سے چلے آرہے تجارتی تعلقات کے نتیجے میں مختلف النوع سامانِ تجارت کے تبادلے بھی عمل میں آئے۔ ہندوستان کے پھلوں اور خوشبوؤں سے عرب خاص طور متعارف ہوئے۔ ہندوستان کے بعض پھل اور خوشبوئیں عربوں کو اس درجہ پسند آئیں کہ ان کو معرب کرکے انہوں نے نہ صرف عام بول چال میں بلکہ اپنی کلاسیکی شاعری میں بھی بکثرت ان کا استعمال کیا۔ عربی شاعری اور عام بول چال میں استعمال ہونے والے بعض معرب الفاظ درج ذیل ہیں:

ہندی		عربی
ناریل		نَارُجِیل
آم		اَنْبَج
لیمو		لَیْمُون
چندن		صَنْدَل
موشہ	(मोच)	مَوْز (کیلا)
مُشک	(मुष्क)	مِسْک

کنک پھل قَرَنْفُل (لونگ)
پپلی فِلْفِل (سیاہ مرچ)

آخری تین الفاظ امرأالقیس کے معروف ومشہور قصیدے کے درج ذیل اشعار میں استعمال ہوئے ہیں:

إِذَا قَامَتَا تَضَوَّعَ الْمِسْكُ مِنْهُمَا
نَسِيمَ الصَّبَا جَاءَتْ بِرَيَّا الْقَرَنْفُلِ

تَرَى بَعَرَ الْآرَامِ فِي عَرَصَاتِهَا
وَقِيعَانِهَا كَأَنَّهُ حَبُّ فُلْفُلِ

علاوہ بریں، دیگر شعرائے عرب نے بھی ان الفاظ کا استعمال اپنے کلام میں کیا ہے۔
نزولِ قرآن کے وقت اہلِ عرب ایسے بہت سارے ہندی الاصل الفاظ سے مانوس ومتعارف تھے اور وہ ان کی شاعری میں بہ کثرت مستعمل تھے۔ چنانچہ ان میں سے بعض ایسے الفاظ کا استعمال قرآن کریم میں بھی ہوا جن سے وہ بہت زیادہ مانوس تھے اور جو انہیں از حد مرغوب تھے۔ ایسے تین الفاظ کی تفصیل ذیل میں دی جاتی ہے۔

مِسْك: یہ لفظ قرآن مجید میں صرف ایک جگہ یعنی سورۃ المطففین کی آیت نمبر ۲۶ میں جنت کی نعمتوں کے بیان کے سلسلے میں وارد ہوا ہے۔ آیت مذکورہ یوں ہے:

يُسْقَوْنَ مِنْ رَحِيقٍ مَخْتُومٍ ۙ خِتَامُهُ مِسْكٌ ۚ وَفِي ذَٰلِكَ فَلْيَتَنَافَسِ الْمُتَنَافِسُونَ

(ان کو نفیس ترین سر بند شراب پلائی جائے گی جس پر مشک کی مہر لگی ہوگی۔ جو لوگ دوسروں پر بازی لے جانا چاہتے ہوں وہ اس چیز کو حاصل کرنے میں بازی لے جانے کی کوشش کریں)

اس لفظ کی اصل کے متعلق اختلاف پایا جاتا ہے۔ الجوالیقی، الثعالبی، السیوطی وغیرہم اس کو فارسی الاصل قرار دیتے ہیں، بعض ماہر لسانیات کے نزدیک یہ لفظ عربی میں سریانی کے توسط سے داخل ہوا جس میں یہ پہلوی سے اخذ کیا گیا اور پہلوی میں یہ سنسکرت کے لفظ "مشک" سے آیا۔ VOLLERS کے مطابق یہ لفظ عربی میں MIDDLE PERSIAN سے براہِ راست آیا ہے۔ اس لفظ کو سنسکرت

کے لفظ مشک (मुष्क) سے مشتق ماننا ہی زیادہ مناسب معلوم ہوتا ہے۔ جہاں تک اس کے عربی میں آنے کا سوال ہے تو اغلب ہے کہ اس میں یہ تاجرانِ عرب کے توسط سے براہ راست در آیا ہوگا۔

کافور: اس لفظ کا استعمال بھی عربی شاعری میں ہوا ہے۔ عرب کے مشہور شاعر الاعشیٰ نے بھی اس کا استعمال کیا ہے۔ قرآن کریم میں اس کا استعمال سورۃ الدھر کی آیت نمبر ۵ میں ہوا ہے جو حسب ذیل ہے:

إِنَّ الْأَبْرَارَ يَشْرَبُونَ مِنْ كَأْسٍ كَانَ مِزَاجُهَا كَافُورًا ۔

(نیک لوگ (جنت میں) شراب کے ایسے ساغر پئیں گے جن میں آبِ کافور کی آمیزش ہوگی۔)

اس کے اصل کے متعلق بھی اختلافِ رائے ہے۔ عام طور سے اس کو فارسی الاصل تصور کیا جاتا ہے۔ مگر یہ خیال محلِ نظر ہے۔ (Fraenkel) اس کو سریانی الاصل قرار دیتے ہیں، جس میں یہ پہلوی سے آیا اور پہلوی میں کاپور کی شکل میں سنسکرت سے آیا جس میں یہ بشکلِ کرپور (कर्पूर) غالباً ہندوستان کے (Munda Dialects) سے آیا۔ جہاں تک اس کے ماخذ کا تعلق ہے تو اس کو سنسکرت کے لفظ کرپور (कर्पूर) سے مشتق ماننا ہی زیادہ قرینِ قیاس معلوم ہوتا ہے۔ یہ عربی میں کب اور کیسے داخل ہوا اس سلسلے میں قطعی طور پر کچھ نہیں کہا جا سکتا تاہم اس بات کا امکان ہے کہ یہ بھی عربی میں عرب تجار کے ذریعہ داخل ہوا ہوگا۔

زنجبیل (ادرک، سونٹھ): یہ لفظ بھی قرآن مجید کی سورۃ الدھر کی آیت نمبر ۱۷ میں جنت کی نعمتوں کے ضمن میں وارد ہوا ہے۔ آیتِ مذکورہ حسب ذیل ہے:

وَيُسْقَوْنَ فِيهَا كَأْسًا كَانَ مِزَاجُهَا زَنْجَبِيلًا ۔

(ان کو وہاں (جنت میں) ایسی شراب کے جام پلائے جائیں گے جس میں سونٹھ کی آمیزش ہوگی۔)

اس کے اصل کے متعلق بھی مختلف آرا ہیں۔ الجوالیقی، الثعالبی، السیوطی وغیرہم اس کو فارسی الاصل قرار دیتے ہیں۔ ایک خیال کے مطابق اس کا ماخذ پہلوی کا سنگیر (Singa Ber)

ہے جہاں سے یہ سریانی میں آیا اور سریانی سے عربی میں داخل ہوا۔[۸] بعض ماہر لسانیات اس کو سنسکرت کے لفظ شرنگویر (शृङ्गवेर) یا شرنگویر (शृङ्गवेर) سے مشتق مانتے ہیں۔[۹] اس کو سنسکرت سے ماخوذ تسلیم کرنا ہی زیادہ درست معلوم ہوتا ہے۔ شرنگویر سے عام ہندی میں زر نجابیر ا ہوا اور یہی عربی میں قدرے تبدیلی کے ساتھ زنجبیل ہو گیا۔[۱۰] مذکورہ بالا دونوں لفظوں کی طرح یہ بھی عربی میں عرب تجار کے توسط سے ہی آیا ہوگا۔

آرتھر جیفری نے ان کے علاوہ اور بھی چند ہندی الاصل الفاظ کو ایسے عربی الفاظ کے ماخذ ہونے کا امکان ظاہر کیا ہے جو قرآن حمید میں وارد ہوئے ہیں، مگر ان میں خاصا تکلف پایا جاتا ہے۔ اسی لئے ان کو موضوع بحث نہیں بنایا گیا۔ تاہم جو حضرات تحقیق مزید اور مفصل معلومات کے متمنی ہوں ان کو چاہیئے کہ وہ (The Foreign Vocabulary of The Quran) کا بالاستیعاب مطالعہ کریں اور دورانِ مطالعہ اس بات کا بھی خیال رکھیں کہ اس نے اس کتاب کو اپنے اس مفروضے کے تحت لکھا ہے کہ اگر چہ راسخ العقیدہ مسلم علماء اس کے قائل نہیں ہیں کہ قرآن کی زبان دیگر زبانوں سے متاثر ہے تاہم اس میں ایسے الفاظ بہ کثرت پائے جاتے ہیں جن کی اصل عربی نہیں ہے اور جن سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ قرآن نے دوسری زبانوں کے اثر کو قبول کیا ہے۔

تعلیقات و حواشی

۱۔ دیکھئے سید سلیمان ندوی: عرب و ہند کے تعلقات، الہ آباد، ۱۹۳۰، صفحات ۲، ۳۔

۲۔ ملاحظہ ہو مقبول احمد: Indo-Arab Relations، بمبئی، ۱۹۶۹، ص ا، نیز دیکھئے سید ابوالاعلیٰ مودودی: سیرت سرورِ عالم، جلد اول، دہلی، ۱۹۸۳، ص ۱۳۷۔

۳۔ ملاحظہ ہو کتاب پیدائش (۳۷: ۲۵ تا ۲۸)۔

بائبل کی محولہ آیات میں اسمٰعیلیوں کے ایک قافلے کا ذکر ہے جو گرم مصالحے، روغنِ بلسان وغیرہ لے کر مصر کی طرف جا رہا تھا۔ یہ وہی قافلہ ہے جس نے حضرت یوسفؑ کو مصر لے جا کر فروخت کیا تھا۔ قافلۂ مذکور چونکہ مصالحہ جات لے کر جا رہا تھا اس لئے گمان غالب ہے کہ وہ ہندوستان سے آ رہا ہوگا کیونکہ ان اشیاء کی پیداوار وہیں ہوتی ہے۔ حضرت یوسفؑ کے فروخت کئے

کئے جانے کا واقعہ غالباً ۱۷۰۰ قبلِ مسیح میں پیش آیا۔

"حضرت یوسفؑ کے کنوئیں میں پھینکے جانے اور پھر مصر میں فروخت کئے جانے کا واقعہ ۱۹۰۰ قبلِ مسیح کے قریب کے زمانے میں پیش آیا۔" (دیکھئے ابوالاعلیٰ مودودی: تفہیم القرآن، جلد دوم دہلی، ۱۹۷۵، ص ۳۸۱)

اس ضمن میں ایک اہم امر کی نشاندہی ضروری ہے۔ وہ یہ کہ قرآنِ کریم کے مطابق حضرت یوسفؑ کو (کنعان سے گزرنے والے) ایک قافلہ کے سقہ نے کنوئیں سے نکالا اور پھر اہلِ قافلہ انکو اپنے ہمراہ مصر لے گئے اور وہاں ان کو عزیزِ مصر کے ہاتھ فروخت کر دیا (دیکھئے سورۂ یوسف: ۱۹ تا ۲۱) اس کے برعکس اس سلسلے میں بائبل کا بیان الجھا ہوا ہے۔ اس کا خلاصہ کچھ یوں ہے کہ حضرت یوسفؑ کے بھائی جب ان کو گڑھے میں ڈال کر کھانا کھانے بیٹھے تو دیکھا کہ اسماعیلیوں کا ایک قافلہ جلعاد سے آرہا ہے اور گرم مصالحہ، روغن بلسان وغیرہ لے کر مصر کو جا رہا ہے۔ یہوداہ نے اپنے بھائیوں سے کہا کہ اگر ہم اپنے بھائی کو مار ڈالیں اور اس کا خون چھپائیں تو کیا نفع ہوگا۔ آؤ اسے اسماعیلیوں کے ہاتھ بیچ ڈالیں کہ ہمارا ہاتھ اس پر نہ اٹھے کیونکہ وہ ہمارا بھائی اور ہمارا خون ہے۔ اس کے بھائیوں نے اس کی بات مان لی۔ پھر وہ مدیانی سوداگر ادھر سے گزرے۔ تب انہوں نے یوسفؑ کو کھینچ کر گڑھے سے باہر نکالا۔ اور اسے اسماعیلیوں کے ہاتھ بیس روپے کے عوض بیچ ڈالا اور وہ لوگ یوسفؑ کو مصر میں لے گئے۔ (دیکھئے کتاب پیدائش ۳۷: ۲۵ تا ۲۸) پھر آگے چل کر بائبل کے مصنفین لکھتے ہیں: ... مدیانیوں نے اسے (یوسفؑ کو) مصر میں فوطیفار کے ہاتھ جو فرعون کا ایک حاکم اور جلو داروں کا سردار تھا بیچا۔ (ایضاً ۳۷: ۳۶)

تلمود کا بیان ہے کہ مدین کے سوداگروں نے یوسفؑ کو کنوئیں سے نکال کر اپنا غلام بنا لیا۔ پھر برادرانِ یوسفؑ نے حضرت یوسفؑ کو ان کے قبضے میں دیکھ کر ان سے جھگڑا کیا۔ آخر کار انہوں نے بیس درہم قیمت ادا کرکے برادرانِ یوسفؑ کو راضی کیا۔ پھر انہوں نے بیس ہی درہم میں یوسفؑ کو اسماعیلیوں کے ہاتھ بیچ دیا اور اسماعیلیوں نے مصر لے جا کر فروخت کیا۔ دوسرے یہ کہ خود مدیانیوں نے حضرت یوسفؑ کو فوطیفار (حاکمِ مصر) کے ہاتھ بیچا۔

تلمود کے بیان کے مطابق مدیانیوں نے حضرت یوسفؑ کو کنوئیں سے نکال کر پہلے تو اپنا

غلام بنایا پھر انہوں نے بیس درہم ادا کر کے برادرانِ یوسفؑ کو راضی کیا۔ بعدازاں انہوں نے بیس ہی درہم میں حضرت یوسفؑ کو اسماعیلیوں کے ہاتھ فروخت کیا اور اسماعیلیوں نے انہیں مصر لے جا کر بیچ دیا۔

ان متضاد بیانات سے یہ صاف معلوم ہوتا ہے کہ موجودہ بائبل اور اس سلسلے کی دیگر کتب مجموعہ ہائے تحریفات ہیں۔

۴۔ مزید تفصیل کے لئے دیکھئے "THE FOREIGN VOCABULARY OF THE QURAN" ARTHUR JEFFERY بڑودہ، ۱۹۳۸، ص ۲۶۴۔

۵۔ سید سلیمان ندوی نے بھی اس کو ہندی الاصل قرار دیا ہے۔ دیکھئے عرب و ہند کے تعلقات ص: ۷۲۔

۶۔ مزید تفصیل کے لئے دیکھئے: The Foreign Vocabulary of The Quran، ص ۲۴۶

۷۔ سید سلیمان ندوی کے نزدیک بھی یہ ہندی الاصل ہے۔ دیکھئے عرب و ہند کے تعلقات ص ۷۲۔

۸۔ دیکھئے: The Foreign Vocabulary of The Quran، ص ۱۵۴۔

۹۔ ملاحظہ ہو حوالہ سابق نیز دیکھئے F. Staingas:

A Comprehensive Persian English Dictionary.

دہلی، ۱۹۸۱ (لفظ زنجبیل)

۱۰۔ دیکھئے عرب و ہند کے تعلقات صفحات ۶۹ - ۷۲۔

بقیہ تبصرہ

سے کام لیا ہے۔ اور ایک دیانتدار مورخ کی حیثیت سے تاریخی سچائیوں اور صداقتوں کو درج کر دیا ہے۔ جو پڑھنے کے لائق ہے۔ اور نہایت ہی بصیرت افروز ہے۔ مساجد اور اوقاف کی تباہی و بربادی میں کس کا ہاتھ ہے یہ تمام تفصیلات اس میں درج کی گئی ہیں اور دلائل و براہین کے ساتھ کی گئی ہیں۔

مولانا قاسمی کی زبان بہت ہی سادہ و شگفتہ ہے۔ انہوں نے بڑی اچھی زبان میں یہ کتاب لکھی ہے۔ جو ادبی و تاریخی دونوں حیثیت سے بے نظیر و بے مثال ہے۔

امید قوی ہے کہ اس اہم کتاب کو ہر حلقہ میں قبولیت حاصل ہوگی۔

قدیم ہندوستانی روایات — چند جھلکیاں

اتل کمار بسواس (کمشنر ترہٹ کمشنری مظفر پور، بہار)		ترجمہ و تلخیص مختار احمد مکی، جمشید پور

ترہٹ کمشنری (مظفر پور بہار) کے کمشنر اتل کمار بسواس نے ہندوستان ٹائمس پٹنہ میں ایک طویل مضمون لکھا جو کہ کئی ہفتہ تک مسلسل چھپتا رہا ہے ان مضامین میں انہوں نے ہندو مذہب سے متعلق چند بنیادی سوالات اٹھائے ہیں ۹ اکتوبر ۱۹۹۴ء میں چھپے اپنے پہلے مضمون کی سرخی "جہان ناواقفیت ایک خدائی عطیہ ہے" لگائی۔ اس کے مطابق جانکاری کا نہ ہونا خدائی دین ہے کیونکہ جانکاری حقیقت میں خطرناک ہوتی ہے اور لوگوں کو انقلابی بنا دیتا ہے ایک جانکاری آدمی سوچتا ہے غور و فکر کرتا ہے چیزوں کو تولتا اور پرکھتا ہے اور اگر وہ عقل سے پرے ہے تو اس سے انکار کر دیتا ہے اور اس کے خلاف بغاوت کرتا ہے۔ ہندوؤں کے ایک مشہور دیوتا شیوا ہیں جس کے عضو تناسل کی پوجا مندروں اور گھروں میں کی جاتی ہے وشنو کے ماننے والے جن کی بڑی تعداد جنوبی ہند میں ہے اپنی پیشانیوں پر بچپن سے ہی وشنو کے جنسی عضو کی تصویریں نقش کرواتے ہیں لاکھوں کی تعداد میں ایسے منادر ہیں جہاں مرد و عورت کے جنسی عمل کی پوجا شیو لنگم کی شکل میں کی جاتی ہے اس پوجا کے لئے بڑی تعداد میں لوگ اپنے خاندان کے خاتون ممبر یعنی بیوی، بہن، بیٹا بیٹی اور ماں وغیرہ کے ساتھ جاتے ہیں اور مذہبی جذبات اور اندھی تقلید کے تحت پوجا کرتے ہیں۔ موجودہ سینما اور ٹی وی بھی اس پوجا کی نمائش میں کسی سے پیچھے نہیں ہے۔ سوال یہ ہے

کہ لنگم اور جنسی وظیفہ کی نمائش اور اس کی پوجا کہاں تک آج کے مہذب سماج کے لئے مناسب ہے خواہ وہ جنسی عضو بھگوان ہی کا کیوں نہ ہو۔

سادھو سنت اور رشی کے اخلاقیات کو لیکر بھی لیسواس نے بحث کی ہے مہابھارت کے ادھیہ ۱۰۸ کے مطابق ایک رشی وبھنڈ ریکا رشی شرینگا کے باپ تھے اور اس کی ماں ایک ہرنی تھی۔ ایسی مثالیں تنہا نہیں ہے بلکہ مہابھارت کے صفحات اس سے بھرے پڑے ہیں پانڈو کو ایک رشی داما نے سراپ دیا تھا کہ وہ کبھی باپ نہیں بن سکتا ہے گرچہ وہ یدھسٹر ارجن نکل اور سہدیو کا باپ مانا جاتا ہے شراپ کی یہ کہانی مہابھارت کے پہلے ادھیہ میں ہے رشی داما نے ایک ہرنی کے ساتھ جنگل میں جنسی فعل انجام دے دیا تھا۔ پانڈو کے ذریعہ چلائے گئے تیر سے داما کی موت ہو گئی۔ مرنے سے قبل اس نے بد دعا کی کہ جب بھی پانڈو عالم شہوت میں اپنی بیوی کے پاس جائے گا تو فوراً اس کی موت ہو جائے گی اس کا مطلب یہ ہوا کہ پانڈو کے پانچوں بچے پانڈو کے نہیں بلکہ کسی دوسرے کے ہیں گرچہ وہ پانڈو کی بیوی سے ہیں لیکن اس پر کوئی سوال نہیں اٹھتا۔ سوال یہ بھی ہے کہ کیا جانوروں کے ساتھ جنسی افعال جنسی کارکردگی کی دلیل ہے؟ شائد یہی وجہ ہے کہ کھجراہو کے مندر میں جانوروں سے جنسی فعل کرتے ہوئے دکھایا گیا ہے۔ مہابھارت میں ایسے بھی بہت سے واقعات ملتے ہیں جن کے مطابق رشی عام لوگوں کے درمیان کھلی جگہ پر عورتوں سے جنسی وظیفہ انجام دیا کرتے تھے ادھیہ ۶۳ کے مطابق رشی پارس ہارا نے ستیہ وتی جو کہ ایک ملاح کی لڑکی تھی اس کے ساتھ سرعام یہ کام کیا جس کے نتیجہ میں سنتانو کی پیدائش ہوئی جو کہ کورو اور پانڈو کے جد امجد بھیشم پتامہ کے باپ تھے۔ چندوگیا اپنشد کے مطابق رشیوں کا یہ معمول تھا کہ پوجا کرتے ہوئے بھی اگر کوئی عورت کسی رشی سے جسمانی تعلقات کی خواہاں ہو تو وہ پوجا چھوڑ کر وہیں اسی وقت تمام لوگوں کی موجودگی میں جنسی فعل انجام دیتے اور اسے ایک مذہبی فعل قرار دیا گیا۔

جس قدیم ہندوستان کی تعریف کے گن گاتے ہوئے آج ہم نہیں تھکتے وہ انتہائی تھرتھرا دینے والے واقعات سے بھی بھرے پڑے ہیں۔ برہما نے اپنی بیٹی ست روپا سے شادی کی جس کے نتیجہ میں منو کی پیدائش ہوئی اور منو نے بھی اپنی ماں ست روپا سے شادی کرلی۔ باپ اور بیٹی کے درمیان شادی اور جسمانی تعلقات کی ایک لمبی فہرست ہے۔

۲۴ اکتوبر ۹۴ء کے شمارہ میں مسٹر بسواس نے Devolion سے متعلق سوالات اٹھائے ہیں اور کچھ شاستروں کا حوالہ دیتے ہوئے اس کا کہنا ہے کہ جو لوگ جانوروں سے جنسی فعل انجام دیں گے ان کو ۱۲ پانا اور دیوی کی مورتیوں کے ساتھ یہ کام کرنے پر ۲۴ پانا جرمانہ دینا ہوگا۔ سوال یہ ہے کہ ارتھ شاستر کے مصنف کو یہ سزا تجویز کرنے کی ضرورت کیوں پڑی؟ کوئی بھی قانون اس وقت بنتا ہے جب اس کی ضرورت ہو، سوال یہ بھی ہے کہ وہ کون کون دیویوں کی مورتیاں تھیں؟ مزید یہ کہ ان کے ساتھ کہاں اور کس کے ذریعہ بدفعلیاں کی جاتی تھیں؟ اور کیا اس سزا کے خوف سے ہی دیو داسیوں نے مورتی کی جگہ لے لی۔ مورتیوں کے سلسلہ میں درگا کالی سرسوتی، لکشمی، سپنارہ اور منشیا وغیرہ کا نام خاص طور پر لیا جاتا ہے۔ تفصیل سے بسواس نے ان سے تعلقات کی نوعیت بیان کی ہے۔ کن لوگوں کے ذریعہ یہ بدفعلیاں کی جاتی تھیں اس کا جواب دیتے ہوئے بسواس کا کہنا ہے کہ نچلی ذات کے لوگوں کے لئے مندروں کے دروازے بند تھے، راجہ مہاراجہ، زمیندار مہاجن اور سوداگر وغیرہ ہی مندر میں جایا کرتے تھے لیکن اس بدفعلی کی ان سے توقع نہیں کی جاسکتی کیونکہ ان لوگوں نے اپنی شردھا سے بڑی تعداد میں زمین زیورات اور دوسرے تحائف دئے ہیں ان کے دلوں میں اپنی دیوی دیوتاؤں کے لئے بڑا عزت واحترام رہا ہے مزید یہ کہ دن میں یہ لوگ مندروں میں جایا کرتے تھے اور یہ دنیاوی عقلمند لوگ اتنے بیوقوف نہیں تھے کہ اپنا وقت

ان بے جان پتھروں اور مٹی کی مورتیوں پر ضائع کرتے جبکہ انہیں آسانی سے عورتیں حاصل تھیں ان مورتیوں کی دیکھ ریکھ کی ذمہ داری پروہتوں اور برہمن دیوتاؤں کی تھی وہ دن رات کسی بھی وقت بغیر کسی شک وشبہ کے جا سکتے اور رہ سکتے تھے دور دراز پہاڑی علاقوں پر مندروں کی موجودگی محض اتفاق نہیں ہے بلکہ اس میں مصلحت بھی ہے پکڑے جانے کی صورت میں بڑی آسانی سے ان مالدار پروہتوں کے ذریعہ ۲۴ پانا جرمانہ دیا جاسکتا تھا کیونکہ ان کے لئے یہ رقم بہت کم تھی۔ حتیٰ کہ طوائف سے تعلقات قائم کرنے پر ۴ ۵ پانا جرمانہ اور جتنی بار یہ تعلق قائم کیا گیا ہے اس کا ۱۶ اگنا جہیز بھی دینا پڑتا اہلہ ساشتر کے مطابق اپنے گرو کی بیوی سے زنا کی سزا غیر معمولی طور پر زیادہ تھی عضو تناسل کاٹ لئے جاتے اس کے بعد موت کی سزا دی جاتی اس وجہ سے صرف ایک ہی مثال ملتی ہے جبکہ اندرا نے اپنے گرو گوتم کی بیوی اہلیہ سے جسمانی تعلقات قائم کئے جبکہ گرو گھر میں نہیں تھے لیکن کوئی سزا نہیں دی گئی صرف گرو کا شراپ ملا۔

۲۵، دسمبر کے مضمون میں اتل کمار بسواس نے بنگال کے کلین برہمن سماج پر روشنی ڈالی ہے اس کا کہنا ہے کہ کلین برہمن کے لئے عورتیں سماجی مرتبہ کی علامت رہی ہیں۔ جس طرح آج کا مالدار طبقہ اپنے گھر کے سامنے بیرونی کاروں کا کارواں رکھتا ہے۔ بنگال کے مصنفین نے عام طور پر اپنی تحریروں میں اسے نظر انداز کیا ہے ایک ڈپٹی مجسٹریٹ بابو چندر داس نے ڈھاکہ انسٹیٹیوٹ میں ۱۸۷۰ء کو خطاب کرتے ہوئے کہا تھا کہ وہ ذاتی طور پر دو کلین برہمن سے واقف ہے ایک کے پاس ساٹھ بیویاں ہیں اور دوسرے کے پاس سو ان لوگوں کے پاس ایک نوٹ بک ہے جس میں بیویوں کے نام اور ان کی ولدیت اور پتہ تحریر ہوتے ہیں۔ جاڑا شروع ہوتے ہی یہ لوگ اپنے نوٹ بک کے حساب سے عیاشی کے دورے پر نکلتے ہیں اور ہر بیوی سے پیسہ وصول لیتے ہوئے گرمی کے

کے ابتداء میں اپنے گاؤں واپس آجاتے ہیں یہ کلین برہمن اکثر بوڑھے بیمار اور موت کے بستر پر ہوتے جن میں انگنت بیویوں کے جسمانی ضروریات پورا کرنے کی صلاحیت نہیں ہوتی تھی یہ بھی اکثر ہوا ہے کہ نوٹ بک یا یادداشت کی غلطی سے غلط جگہ پر پہونچ جایا جائے اور جب صحیح شوہر کچھ دنوں کے بعد وہاں پہونچے تو اس غلطی کا احساس ہوا۔ رابندر ناتھ ٹیگور نے بھی اپنے ایک ناول نوکا دوبی میں ایسے پلاٹ اور کردار پیش کئے ہیں ۱۸۶۶ء میں حکومت بنگال کی جانب سے ایک کمیٹی بنائی گئی جس میں ویدیا ساگر بھی بحیثیت ایک ممبر تھے۔ اس کے مطابق ایسے بھی واقعات ہیں جبکہ ایک کلین برہمن کی ۲۳ شادی ایک ہی دن ایک ہی وقت میں انجام پائی۔ کلین برہمن گاؤں گاؤں گھومتے رہتے اور اس گاؤں کے مالدار لوگوں کی بیٹیوں سے شادی کرکے دو چار روز رہنے کے بعد دان دکشنا لے کر اور اس کی خانہ پوری اپنے رجسٹر میں کرنے کے بعد دوسرے پڑاؤ کی جانب نکل جاتے اور اس طرح شادی ٹور کا یہ سلسلہ چلتا رہتا۔ اس طرح کی شادیوں کے نتیجہ میں اس عورت اور سماج کی کیا حالت رہی ہوگی اس کا اندازہ کیا جاسکتا ہے ۲۷ اپریل ۱۸۵۵ء کے سماچار سودھا پرشن کی ایک رپورٹ کے مطابق ایک کلین بیٹے نے اپنے باپ سے پوچھا کہ اسے ایک آدمی کا خط ملا ہے کہ اس کی بیوی کو بچہ تولد ہوا اور اس سلسلہ کی ایک تقریب میں شرکت کی دعوت دی گئی ہے جبکہ دو سال سے وہ اپنی اس بیوی کے پاس نہیں گیا ہے تو اس کے کلین باپ نے جواب دیا کہ اس میں کوئی ہرج نہیں ہے کیونکہ تمہاری پیدائش کی خبر بھی اسی طرح میں نے سنی تھی اور بغیر کسی پریشانی کے اس تقریب میں شامل ہوا تھا۔

۱۵ اور ۲۲ر جنوری ۱۹۹۵ء کے شمارہ میں مسٹر بسواس نے ہندو سماج میں مروج ستی کے طریقہ سے بحث کی ہے اور اسے ہندوستانی سماج کے نام ایک بدترین دھبہ کا نام دیا ہے۔ اس کا کہنا ہے کہ ہندو سماج نے اس گھناؤنے جرم کا کوئی

ریکارڈ نہیں رکھا ہے لیکن انگریزوں کے ذریعہ ۱۸۱۵ء سے ۱۸۲۵ء یعنی سات سال کا ایک ریکارڈ مرتب کیا گیا تھا جس کے تحت اس دوران ۸ ہزار عورتوں کو ستی کے نام پر بلی دی گئی ۲۷ مارچ ۱۸۱۸ء کو انڈیا گزٹ میں شائع ایک خبر کے مطابق غیر شادی شدہ لڑکیاں بھی ستی کی بھینٹ چڑھائی گئیں۔ وہ صرف اس لئے کہ وہ کسی سے منسوب تھیں اور اس کے ہونے والے شوہر کی موت ہوگئی تھی۔ بیوہ عورتوں کو نشہ آور ادویات پلاکر مردہ شوہر کی لاش سے کس کر باندھ دیا جاتا تھا اور پھر چتا میں آگ لگادی جاتی تھی لمبے لمبے بانس سے اسے مارا جاتا تھا۔ تاکہ وہ جلتی ہوئی چتا سے اٹھ کر بھاگ نہ جائے ایسی صورت میں اسے دوبارہ ہاتھ پاؤں باندھ کر یا دھکیل کر شعلوں کے حوالہ کر دیا جاتا تھا ۱۸۱۹ء میں بنگال کے ۲۴ پرگنہ ضلع میں ۵۳ عورتوں کو بطور ستی جلانے کا ریکارڈ موجود ہے جس میں ۳۸ فیصد کا تعلق برہمن خاندان سے ۱۹ فیصد کا استھ اور چار فیصد بندیا سے ہے یعنی ۶۱ فیصد عورتیں جنہیں ستی کے نام پر زندہ جلایا گیا بھدرا لوک طبقہ سے تعلق رکھتی ہیں جبکہ ۱۸۷۲ء کی مردم شماری کے مطابق اس طبقہ کی آبادی ۲۴ پرگنہ میں صرف ۱۶ فیصد تھی ۳۸ فیصد برہمن عورتیں ستی کی بھینٹ چڑھائی گئیں۔ جبکہ برہمن کی تعداد صرف ۹ فیصد تھی۔ ولیم وارڈ نے ۱۷۹۲ء میں ۲۴ پرگنہ کا ہی ایک دلخراش واقعہ تحریر کیا ہے کہ کلکتہ کے جنوب میں مجلپور کے ایک برہمن بنچارما کی موت ہوگئی تو حسب رواج اس کی بیوی کو ستی ہونے کے لئے مجبور کیا گیا اور اسے لاش کے ساتھ باندھ دیا گیا اور چتا کو آگ لگادی گئی موسم ابر آلود تھا اور اندھیرا بھی پھیل گیا تھا ایسے میں وہ عورت جزوی طور پر جلی ہوئی حالت میں چتا سے نکل کر قریب کی جھاڑی میں چھپ گئی تھوڑی دیر بعد لوگوں کو احساس ہوا کہ صرف ایک لاش جل رہی ہے تو اس عورت کی تلاش شروع ہوئی اور اس کے بیٹے نے اسے پکڑ کر نکالا اور اسے مجبور کیا کہ وہ

دوبارہ آگ میں جل جائے یا پانی میں ڈوب کر، اپنے کو پھانسی لگا کر مرجانے کے لئے تیار ہو جائے وہ بے چاری بے بس عورت اپنے بیٹے سے ہی زندگی کی بھیک مانگتی رہی لیکن بیٹا اپنی ذات چھوڑنے کے لئے آمادہ نہیں تھا نتیجتاً ہی کے بیٹے اور دوسرے لوگوں نے اس کا ہاتھ پاؤں باندھ کر دوبارہ اس جلتی ہوئی چتا پر پھینک دیا۔ شاید دنیا کی تاریخ میں ایسی مثال دیکھنے سے بھی نہ ملے جو ایک بیٹے نے اپنی ماں کے ساتھ کیا۔ کلین برہمن کی بیویاں بھی اسی طرح اپنے شوہر کے ساتھ جلادی جاتیں خواہ وہ اپنے شوہر کے ساتھ کبھی نہ بھی رہی ہو ایسا اس برہمن واش کا نتیجہ تھا جس کے تحت اسے بتایا جاتا تھا کہ اس کا شوہر (یعنی پرمیشور) اس کا انتظار کر رہا ہے اور اس طرح ایک ساتھ سب لوگ سورگ میں چلے جائیں گے مزید یہ کہ اس کے میکہ اور سسرال دونوں خاندان کے لئے یہ باعث عزت واحترام اور نیک نامی ہے ——————

یہ اپریل مئی ۱۹۹۶ء کا مشترکہ شمارہ

بعض ناگزیر وجوہات کی بناء پر ماہانہ "برہان" دہلی کا زیر مطالعہ شمارہ اپریل اور مئی ۱۹۹۶ء کا مشترکہ شائع کیا جارہا ہے۔ ہمیں امید ہے کہ قارئین کرام ہماری مجبوری کو محسوس کرتے ہوئے ادارہ کے ساتھ اپنے تعاون کو جاری رکھیں گے۔

گذشتہ دنوں دفتر ندوۃ المصنفین دہلی میں اچانک آگ لگ جانے سے ادارہ کو جو نقصان اٹھانا پڑا ہے اس کی تلافی کی صورت صرف یہ ہی ہو سکتی ہے کہ ہمدردان برہان ادارہ کے ساتھ زیادہ سے زیادہ تعاون فرمائیں۔ خریدار حضرات اپنا زر تعاون فوراً ارسال کریں۔ اور نئے خریدار بنانے کے لئے بھی سعی و جدوجہد کریں۔ ادارہ اپنے قارئین کرام کے اس تعاون کے لئے حد درجہ شکر گذار ہوگا۔

نوٹ:۔ خریدار حضرات سے درخواست ہے کہ اپنا زر تعاون ارسال کرتے وقت منی آرڈر فارم پر اپنا مکمل نام و پتہ ضرور تحریر فرمایا کریں۔

دسویں صدی ہجری کا باکمال محدّث

قسط ۱

از

جناب شیخ فرید برہان پوری

(پروفیسر رابرٹسن کالج۔ جبل پور)

دسویں صدی ہجری کا باکمال محدّث ـــــ حضرت شیخ علی متقی بُرہان پور کی مایۂ ناز ہستی ہے۔ وہ اپنے دور کے ممتاز عالم اور فاضل اجل تھے۔

علی متقی اصلاً جونپوری اور مولداً برہان پوری ہیں۔ ان کے والد حسام الدین بن عبدالملک بن قاضی خاں اپنے اہل و عیال کو لے کر جون پور سے برہان پور آ گئے۔ اور یہاں ۸۸۵ھ ۱۴۸۰ء میں علی متقی پیدا ہوئے۔ سات یا آٹھ سال کی عمر میں تقریباً ۸۹۲ھ ۱۴۸۷ء میں ان کے والد نے حضرت شاہ بہاءالدین باجن کے حلقۂ ارادت میں شامل کر دیا۔

اپنے والد بزرگوار اور شہر کے دوسرے عالموں سے علوم متداولہ کی تعلیم حاصل کی۔ اور مختصر عرصہ میں علم و فضل میں کمال حاصل کر لیا۔

والد کی وفات کے بعد ابتدار شباب میں ملازمت کرنے کا خیال پیدا ہوا۔ اس ارادہ سے شادی آباد ـــ مانڈو ـــ پہنچے۔ اور وہاں ملازمت کر لی۔ فارغ البالی کے ساتھ زندگی گذارنے لگے۔ کچھ مال و متاع بھی جمع کر لیا۔ مگر خدا کی عنایت اور ہدایت کی دست گیری سے دنیاوی مال و متاع کی وقعت نظروں سے اُٹھ گئی۔ اور اس فانی دنیا کی حقیقت کے انکشاف کے بعد دنیا سے قطع تعلق کرنے کی ٹھان لی۔ ملازمت چھوڑ کر برہان پور واپس آئے اور شیخ عبدالحکیم ابن شاہ باجن کی خدمت میں حاضر ہوئے اور ان کی صحبت سے فیض پاتے رہے خاندان چشتیہ کا خرقۂ خلافت حاصل کیا۔

ان کے ابتدائی حالات نہیں ملتے۔ انھوں نے اپنا حال یوں بیان کیا ہے ـــــ

"یہ فقیر جب بچہ تھا۔ اُس وقت والد رضی اللہ عنہ نے شیخ اجل شیخ باجن چشتی کا مُرید کر دیا تھا۔ ان کا طریقہ: جہد وسماع صفا وہیجان کا باعث ہوا۔ پس جب میں سن شعور کو پہنچا۔ اور حق و باطل کی تمیز ہوئی۔ تو انھیں کو میں نے اپنا شیخ رکھا۔ اور انھیں کے قول پر عمل کرنے کے لئے راضی ہوا۔ کیونکہ مشائخین کا یہ قول ہے۔ کہ لڑکا جب مرید کر دیا جاتا ہے۔ تو اس کو بالغ ہونے کے بعد اختیار رہے کہ چاہے اسی شیخ کو اپنا شیخ بنائے یا کوئی اور شیخ بنائے۔ میں نے انھیں کو اپنا شیخ رکھا جب میرے والد اور حضرت شیخ (شاہ باجن) کا انتقال ہوگیا۔ تب میں مشائخین خاندان عالیہ چشتیہ بہشتیہ کا خرقہ حضرت شیخ عبدالحکیم بن شیخ باجن سے پہنا"[1]

غالباً ۹۱۲ھ / ۱۵۰۶ء میں حضرت شیخ عبدالعلیم کے مرید ہوئے۔

ملتان کا سفر اور قیام راہ طریقت میں پیش آنے والی مشکلات کا حل تلاش کرنے کے لئے ملتان کا قصد کیا۔ دو سال تک شیخ حسام الدین ملتانی کی صحبت میں رہے۔ اور ظاہری و باطنی فیوض سے مستفیض ہوتے رہے۔ ان سے اکثر تفسیر بیضاوی اور عین العلم کا تذکرہ رہا۔ عبدالوہاب متقی برہان پوری [متوفی ۱۰۰۱ھ / ۱۵۹۲ء] کی روایت سے اخبار الاخیار میں منقول ہے کہ ـــــ

"جب شیخ الاسلام حضرت حسام الدین کی خدمت میں ملتان میں رہتے تھے۔ شیخ الاسلام خود اپنے سر پر کتابیں رکھ کر ان کے حجرے میں آتے تھے۔ کیوں کہ یہ خلوت میں رہتے تھے اس لئے اندر جانے کی اجازت حاصل کرنے کے لئے وہ فرماتے تھے کہ حسام الدین آیا ہے۔ کیا حکم ہے۔ ایک دو دفعہ اسی طرح کہتے تھے۔ تو حضرت دروازہ کھول دیتے تھے۔ اکثر ایسا

---

[1] اخبار الاخیار (اردو) ص ۳۶۸۔ ترجمہ مراۃ احمدی ص ۱۰۳

معارج الولایت قلمی ص ۳۰۹ اور سفینۃ الاولیاء میں فارسی عبارت نقل ہے) مذکورہ بالا عبارت اس رقعہ کا ترجمہ ہے۔ جو انھوں نے اپنی رحلت کے وقت کسی مخلص کے سپرد کر دیا تھا۔ [2] ایضاً ص ۳۶۹۔

یہ ہوا کہ حضرت شیخ حجرہ نہ کھولتے تھے۔ تو حضرت شیخ الاسلام واپس ہو جاتے تھے .....
اکثر تفسیر بیضاوی کا مذاکرہ کیا کرتے تھے " ——

اسی طرح چند سال حضرت شیخ الاسلام کی خدمت میں ملتان میں رہے جب جاذبۂ رفیق نے مرکز —— سوادِ اعظم —— کی جانب کھینچا۔ تو مدینہ منورہ کے قصد سے ملتان سے روانہ ہوئے۔ مانڈو آئے۔ یہاں والدہ کی بیماری کی وجہ سے کچھ عرصہ تک ان کو قیام کرنا پڑا۔ ان کی آمد کی خبر سن کر طالبانِ رشد و ہدایت جوق در جوق آنے لگے۔ ہر وقت ایک مجمع رہتا۔

والدہ کی وفات کے بعد مانڈو گڑھ سے احمد آباد آئے۔

قیام احمد آباد | احمد آباد میں ورود اور قیام کے زمانہ کا تعین مشکل ہے۔

کچھ عرصہ تک انھوں نے احمد آباد میں قیام کیا۔ ان کی بزرگی اور فضیلت کا شہرہ سن کر سلطان بہادر شاہ والی گجرات نے ملاقات کی خواہش ظاہر کی۔ مگر انھوں نے انکار کردیا۔ عوام پروانہ وار ان کے گرد جمع ہو جاتے تھے۔ اکثر تنگ آ کر دروازہ بند کر کے بیٹھ جاتے تھے۔

انھی دنوں —— قاضی عبداللہ سندھی —— صاحب علم و تقویٰ —— گردشِ روزگار سے پریشان ہو کر گجرات کی راہ عازمِ مدینہ تھے۔ شیخ سے ان کو بے حد عقیدت اور محبت تھی۔ بادشاہ نے شوقِ ملاقات کی شدت سے مجبور ہو کر قاضی صاحب موصوف کی معرفت باریابی چاہی۔ انھوں نے قاضی صاحب کی درخواست منظور کر لی۔ سلطان حاضرِ خدمت ہوا۔ اور ان کے نصائح و ارشادات کو غور سے سنا۔ اور ایک کروڑ تنکہ —— گجراتی سکہ —— بطور نذرانہ ان کی خدمت میں بھیجا۔ چونکہ یہ نذرانہ قاضی صاحب کے توسل سے حاصل ہوا تھا۔ قاضی صاحب کو عنایت کر دیا۔

گجرات سے ۹۵۳ھ / ۱۵۴۶ء میں دیارِ عرب کا رخ کیا اس وقت ان کی عمر ۶۰ برس کی تھی۔

——

سفر میں طریق زندگی | سفر میں ان کا طریقہ یہ تھا کہ دو تھیلے ساتھ رکھتے تھے۔ ایک میں کھانے پینے کا ضروری سامان اور دوسرے میں قرآن پاک اور چند کتابیں۔ کھانے کا سامان بھی دو تین دن سے زیادہ کا نہ ہوتا تھا۔ جنگل سے لکڑیاں چن کر لاتے۔ چقماق سے آگ جلاتے اور اپنے ہاتھ سے کھانا پکاتے تھے۔ اور خود ہی برتن وغیرہ صاف کر لیتے تھے۔ اس باب میں انھوں نے کسی کی خدمت قبول نہ کی۔

مکہ میں سکونت | شیخ نے عرب پہنچ کر مشہور اور معروف اساتذہ اور شیوخ کی خدمت میں چند سال تک علوم ظاہری اور باطنی کی تکمیل کی۔ ان شیوخ میں شیخ ابن حجر مکی۔ شیخ ابوالحسن بکری۔ اور محمد بن سخاوی جیسے فاضل اجل شامل ہیں۔ چند سال میں شیخ نے اپنی فطرت ذہانت۔ روحانی ذوق اور توفیق ایزدی سے یہ مرتبہ حاصل کر لیا۔ کہ استاد شاگرد اور شاگرد استاد ہو گیا۔

"از ہند در سال نہصد و پنجاہ و سہ سال بصوب حرمین شریفین خرامش فرمود و توفیق تصحیح و تصحیح جملگی صحاح حدیث در ملازمت شیخ ابوالحسن بکری شافعی مصری و دیگر محدثان معجزبیان

با . . . . . استعداد خدیو مردم را بافادہ فرمائی بہ مسند . . . . . . نشاندہ فراوان

تالیفات سودمند در فن حدیث برائے رہنمونی مردم گذاشت"[1]

۹۵۰ھ/۱۵۵۰ء سے ۹۷۱ھ/۱۵۶۴ء تک مکہ میں حدیث شریف کی دائرۃ المعارف

"کنز العمال فی سنن الاقوال والافعال" ——— کی ترتیب و تہذیب میں مصروف رہے

جس نے سیوطی کے مجموعۂ احادیث پر خط نسخ پھیر دیا۔

شیخ اس درمیان میں ۹۶۱ھ/۱۵۵۳ء تک دو مرتبہ گجرات آئے۔ وہاں شیخ اور سلطان محمود کی ملاقات کی تفصیل "ظفر الوالہ بمظفر وآلہ" میں درج ہے۔[2]

یہاں سلطان محمود اکثر خلاف شریعت لباس پہن کر حاضر خدمت ہوتا۔ اس کی طرف انھوں نے کبھی توجہ نہ کی۔ ایک مرتبہ جب سلطان شرعی لباس میں حاضر ہوا۔ تو انھوں نے

---

[1] گلزار ابرار زرق ص۲۵۶۔ اذکار ابرار ص[illegible] [2] ظفر الوالہ ——— مطبوعہ لندن ص۳۱۵

خوشنود ہوکر اس کی طرف دیکھا۔ سلطان کی درخواست پر اس کے محل میں تشریف لے گئے۔ اپنے گلاس کو چار مرتبہ پانی سے دھوکر سلطان کو پانی پینے کے لئے دیا۔ تاکہ اس کا شک دور ہو جائے سلطان نے خوشی سے پانی پی لیا۔ سلطان نے اپنی سلطنت لاکر قدموں پر ڈال دی۔ مگر انھوں نے کچھ قبول نہ کیا۔

سلطان نے مدرسہ اور طلبا رکے وظائف کے لئے بڑی رقم مقرر کردی۔ شیخ مکہ لوٹ گئے۔ اور تصنیف و تالیف میں مشغول ہوگئے۔

وفات | وفات سے چند روز پہلے ان میں کچھ جذبے پیدا ہو جاتے تھے جس سے تمام بدن اور حرکات سکنات میں تغیر پیدا ہو جاتا تھا۔

عبدالوہاب متقی کہتے ہیں کہ صفر کے مہینے ۹۷۵ھ ۱۵۶۷ء میں وفات سے دو تین دن قبل شیخ نے ان سے ایک بیت پڑھنے کے لئے کہا۔ انھوں نے ذیل کی بیت پڑھی [۱]

ہرگز نیامد در نظر صورت ز رویت خوب تر شمسے ندانم یا قمر یا زھرۃ یا مشتری

اس بیت کو سن کر ان کی عجیب حالت ہوگئی۔ با آواز بلند پڑھنے کے لئے کہا عبدالوہاب متقی نے کئی مرتبہ بلند آواز سے پڑھا۔ " حضرت شیخ سے محبت آمیز کلام اور شور انگیز نالے بلند ہونے لگے "۔ جب خادم کھانا لایا تو انھوں نے اس کو اس طرح کوٹنے کے لئے کہا کہ سب ایک ہو جائے اور دوئی نہ رہے۔ اور ایک دوہرہ پڑھا۔

" آں چناں سحق کن کہ یکے شود و دوئی نماند چنانچہ ایں دوہرہ خبرے دہد "

دوہرہ ————

" سن سہیلی پریم کی باتا یوں مل رہی جیوں دود بتاتا " [۲]

اپنے مقالہ ——— " ہندوستان میں ہندوستانی " میں حضرت سید سلیمان ندوی نے اس دوہرہ کے ذیل میں لکھا ہے۔ کہ " غور کیجئے۔ کہ ان کا تعلق ہندوستان کے کن کن صوبوں

۱؎ اخبار الاخیار (اردو) ص ۲۶۷ ۲؎ اخبار الاخیار مطبع ہاشمی میرٹھ ص ۲۴۹ (بحوالہ نقوش سلیمانی)

سے میا - جون پور (یوپی) برہان پور (خاندیش) - مانڈو (مالوا) ملتان (پنجاب سندھ) اور احمد آباد (گجرات) بایں ہمہ ان کی جو زبان تھی وہ اس دوہرے سے ظاہر ہے۔[1]

وفات کے وقت تمام جسم ساکت تھا۔ شہادت کی انگلی حرکت کر رہی تھی۔ اس کی حرکت بند ہونے کے بعد مریدوں نے سمجھ لیا۔ کہ روح قالب سے رخصت ہو گئی ہے۔

رحلت کے وقت ان کا سر شیخ عبدالوہاب متقی کے زانو پر تھا۔

دو جمادی الاول ۹۷۵ھ منگل ۴ نومبر ۱۵۶۷ء کو صبح کے وقت جان جان آفریں کے سپرد کردی۔ اِنَّا لِلّٰہِ وَاِنَّا اِلَیْہِ رَاجِعُوْن۔

برہان پور کی مردم خیز خاک سے اٹھا ہوا باکمال محدث ——— مکہ کی مقدس سرزمین میں ابدی آرام کے مزے لے رہا ہے ———

تاریخ وفات | "شیخ مکہ"۔ "قضیٔ نحبہ"۔ "متابعتِ نبی"[2] اور "پیرِ خاص مصطفٰے است علی"[3] سے تاریخِ وفات نکلتی ہے۔

مخبرالواصلین (قلمی) میں ذیل کا قطعہ درج ہے۔

آنکہ او ہادیٔ خفی و جلی است　　متقی زمانہ شیخ علی است

وارثِ علم مرسلیں بودہ　　خاتم دہر را نگیں بودہ

درۃ التاج اتقیاء او بود　　گوئے تقویٰ ازیں زمانہ ربود

در احادیث بود بے ہمتا　　ہم چو در اختراں قمر یکتا

بہ فقاہت عدیلِ او عدم است　　عاجز از وصفِ او قلم است

از جمادی نخست بود دوم[4]　　کہ علی شد باوجِ چرخِ نہم

سالِ ترحیل او رقم افتاد　　وارث الانبیاء بحق جاں داد

مرقد او بہ مکۃ اللہ است　　فیض بخش گدا و ہم شاہ است (رجا)

---

[1] نقوش سلیمانی صفحہ ۵۶ [2] گلزار ابرار (قلمی) ورق ۲۶۵ [3] اخبارالاخیار (اردو) صفحہ ۵۶۴ [4] یہ تاریخ وفات بارہ جمادی الاول ہے مگر قطعہ میں دو تاریخ نظم کی گئی ہے۔

عربی شاعری و خیالات کا اثر پروفنسال و اطالیہ کی شاعری پر

از

جناب ڈاکٹر محمد امجد صاحب صدیقی
(پروفیسر یونیورسٹی الہ آباد)

(۲)

اس میں شاعر ایک پہاڑ پر جاکر خاموش کھڑا ہوجاتا ہے اور اس کے اوپر کبھی نیلے آسمان کو دیکھتا ہے اور کبھی اس کے نیچے بہتے ہوئے دریا پر نظر ڈالتا ہے موجوں کی تھپیڑوں کی آواز، ہواؤں کے جھونکوں کی سنسناہٹ اور کبھی خشکی اور دریا کی مخلوط آواز کو سنتا ہے ان دونوں آوازوں کو ملأ اعلیٰ کی طرف جاتے ہوئے محسوس کرتا ہے جو آواز دریا سے نکل کر جاتی ہے اس میں فرحت و سرور پاتا ہے اور جو آواز خشکی سے پیدا ہوتی ہے اس میں حزن و ملال، رنج و الم کی آمیزش پاتا ہے امواج کی آواز کو حمد باری کی تسبیح سمجھتا ہے اور خشکی کی آواز کو زمین کا رونا اور انسان کے شور و واویلا کی آواز تصور کرتا ہے ان دونوں آوازوں میں سے ایک کا نام "طبیعت" اور دوسرے کا نام "انسانیت" رکھتا ہے اس دل کش منظر پر غور کر کے بے خود ہوجاتا ہے اور اتھاہ گہرائی میں پہنچ کر اپنے نفس سے سوال کرتا ہے کہ ہم یہاں کیوں ہیں؟ ان سب کا کیا مقصد؟ آیا زندگی بہتر ہے یا موت؟ پھر خدائے وحدہٗ لاشریک کی ذات گرامی کی قسم کھاکر کہتا ہے کہ صرف خدائے قدوس ہی جانتا ہے کہ یہ طبیعت کا سرود و غنا، جنسِ بشری کے حزن زبکار سے دواماً کیوں ممزوج ہے اور پھر دنیائے حیرت میں غرق ہوجاتا ہے:-

اس طرح فیکتور ہوگو Victor Hugo نے اپنے دوسرے قصیدہ "الشموس الغاربۃ" (The Setting suns) میں غروبِ آفتاب، شفق کا ظہور

اور اس پر گفتگو رگھٹاؤں کا چھا جانا نہایت دلچسپ انداز میں بیان کیا ہے اور اس سے مخلوقات میں وجود خالق کے نظریہ پر بالکل اسی طرح دلیل لایا ہے جیسے معری نے اپنے حسب ذیل اشعار میں اس کو پیش کیا اور حیرت انگیز یگانگت سے لطف اندوز ہوجئے اشعار یہ ہیں :-

ادری الخلق فی امرین ماض ومقبل — وظرفین ظرف فی مدۃ ومکان

اذا ما سألناعن مراد الهنا — کنی عن بیان فی الاجابۃ کان

یا جیسے قرآن میں ہے " اِنَّ فِی خَلْقِ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَاخْتِلَافِ اللَّیْلِ وَالنَّهَارِ لَاٰیٰتٍ لِّاُولِی الْاَلْبَابِ الَّذِیْنَ یَذْکُرُوْنَ اللّٰهَ قِیَامًا وَّقُعُوْدًا وَّعَلٰی جُنُوْبِهِمْ وَیَتَفَکَّرُوْنَ فِیْ خَلْقِ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ رَبَّنَا مَا خَلَقْتَ هٰذَا بَاطِلًا سُبْحٰنَکَ فَقِنَا عَذَابَ النَّارِ " اور اسی " الشموس الغاربات " (The setting sun) کے عمدہ اشعار میں سے یہ ہے " هذه السحب الملونة بالوان الرصاص والذهب والنحاس والحديد تستكن فيها الزوبعة والاعصار والساعقة والجحيم وتدمدم دمدمة متخفية فهو الله الذي يعلقها جميعا في السموات العميقة كما يعلق الفارس على اوتاد البيت اسلحته المتصلصلة " یہ بھی بالکل ویسے ہی ہے جیسے قرآن کے سورہ نبا میں " اَلَمْ نَجْعَلِ الْاَرْضَ مِهٰدًا وَّالْجِبَالَ اَوْتَادًا وَّخَلَقْنٰکُمْ اَزْوَاجًا وَّجَعَلْنَا نَوْمَکُمْ سُبَاتًا وَّجَعَلْنَا اللَّیْلَ لِبَاسًا وَّجَعَلْنَا النَّهَارَ مَعَاشًا وَّبَنَیْنَا فَوْقَکُمْ سَبْعًا شِدَادًا وَّجَعَلْنَا سِرَاجًا وَّهَّاجًا وَّاَنْزَلْنَا مِنَ الْمُعْصِرٰتِ مَآءً ثَجَّاجًا لِّنُخْرِجَ بِهٖ حَبًّا وَّنَبَاتًا وَّجَنّٰتٍ اَلْفَافًا " اسی دیوان میں ہیوگو نے ایک اعلیٰ درجہ کا قصیدہ لکھا ہے جس کا نام " الدعاء للجميع " (Prayer To all.)

ہے یہ قصیدہ [illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible] معلوم ہوتا ہے کہ اس میں بالکل [illegible]

تاریخ الادب بین الافرنج والعرب

رسول کریم صلعم سے روایت کیا ہے

"قیل یا رسول اللہ من احق الناس بحسن الصحبة - قال - امک ثم امک ثم اباک ثم ادناک ثم ادناک"

جو قرآن میں ہے اس کو بھی دیکھئے:-

"واخفض لھما جناح الذل من الرحمة وقل رب ارحمھما کما ربیانی صغیرا"

اور پھر لزومیات میں معری کے اشعار ملاحظہ فرمائیے:-

واعط اباک النصف حیا ومیتا ۔۔۔ وفضل علیہ من کرامتھا الاما

اقلتک خفا اذ اقلتک مثقلا ۔۔۔ وارضعت الحولین واحتملت تما

والقتک عن جھد والقاک لذة ۔۔۔ وضمت وشمت مثل ما ضم ارشما

اگر معری اور دوسرے شعرائے عرب کے کلام کو بنظر غائر ملاحظہ کیا جائے تو ہوگو کے اس "الدعاء الجمیع" کے اکثر خیالات میں مماثلت نظر آئے گی۔

فرانس والے جو اسلوب کی روانی اور شان وشوکت کو شاعری کا جوہر اور جزو اعظم سمجھتے تھے انھوں نے شہسواروں کے قصے حادثے اور داستانوں کو جو حیرت واستعجاب در مسرت کو پیدا کر سکیں اپنے یہاں لے لیا اور اس کو اشعار میں نظم کیا حالانکہ دوسری قوموں نے اس کو نثر میں جگہ دی ہندی قصے Dolopathos (or King and seven wise men) کا لاطینی ترجمہ ہوگیا یہ تروفیر Troubadours کا پہلا خزانہ ہے اور عربی قصے مراقشیوں نے قشتالیوں کو دیا اور قشتالیوں Castellanos نے فرانس کو دیا اس کا بھی نظم میں ترجمہ ہوا اور اس کے جانشینوں نے پروفنسا Provence میں Raymond Berenger

اولوالعزمی کی روح کے ساتھ ساتھ زیب وزینت وآرائش کا ذوق معہ تمام علوم عربیہ [illegible] ان دونوں لطیف اشیاء کے باہمی اتحاد نے ایک نئی شاعری کی روح پھونک دی جو [illegible] زمانہ میں پروفنسا بلکہ تمام جنوبی یورپ میں بجلی کی طرح چمکی اور ان کو منور کردیا۔

وہ زمانہ تھا جب شیفالیہ chivalry پروفنسا میں وجود میں آئی یہ قدیم تصورات سے بالکل مختلف تھی اس کی اصل خصوصی عورتوں کی خدمت و احترام تھی گیارہویں صدی کے اخیر میں جنوبی فرانس میں اسی قسم کی شاعری کا ظہور ہوا جس کے مضامین نئے معاشرتی اصول نئے اصطلاحات نئی شاعری کی اس جدید ترقی کی طرف رہنمائی کرنے والی کوئی چیز فرانس کے پرانے ادب میں نہیں پائی جاتی البتہ اس نئی شاعری میں عرب اندلس کے بعض مستحکم اثرات پائے جاتے ہیں جو نمایاں طور پر ظاہر کرتے ہیں کہ ابتدائی پروفنسال شاعر عربی نمونہ شاعری سے ضرور متاثر ہوا تھا اور جس طرح عربی علوم و فلسفہ کے اثرات سے ڈیسپر ریمان - لبنان وغیرہم کے اقوال پر ہیں اسی طرح عربی شاعری کے اثرات پروفنسال شاعری پر سسمنڈی (Sismondi) کی مشہور کتاب "جنوبی یورپ کے ادب کا تاریخی جائزہ" History of the literature of south of Europe. افسانوی داستانیں شہسواروں مملو و مشحون ہے۔[1]

---

[1] انیسویں صدی کے نصف میں اس کے خلاف آواز سنائی دیتی ہے یہ ناقد اندلس اور پروفنسا کے درمیان اختلاط کی ایک مستند تحریری شہادت چاہتا ہے جس کو اپنے حسب خاطر خواہ نہ پاکر دوسرے گوشہ پر جا پہنچتا ہے اغسطس ولیم شلیگل Augustus William Schlegel ایک کتاب on the language and literature of Provence مطبوعہ ۱۸۱۸ء میں پروفنسال کی شاعری اور تہذیب پر عربی اثرات کا انکار کرتے ہوئے زمانہ وسطی کے اندلس کے مذہبی تعصب و تنفر کا ذکر کرتا ہے حالانکہ تاریخ مراقشی اور اندلسیوں کے درمیان اس قسم کے تنفر و عناد کا پتہ نہیں دیتا قشتالیہ کے الفانسو Alphonso of Castile کے زمانہ تک کوئی حکومت ایسی نظر نہیں آتی جہاں عیسائی شاہزادہ مراقشی دربار میں پناہ گزیں نہ رہا ہو یا مراقشی حاکم عیسائی حکومت کے زیر سایہ نہ رہا ہو ڈیڑھ سو سال ہم دور دو جر - two Rogers اور سسلی کے دو ولیم two Williams of Sicily بلکہ فریڈرک دوم Frederick II کے دربار میں ہم دیکھتے ہیں کہ عرب اٹلی کے باشندے ملتے تھے دونوں سسلی two Sicilies کے صوبوں میں قاضی judges عرب ہی منتخب ہوتے تھے تقریباً ۱۰ صدی دونوں قومیں جنوب یورپ میں گہرے دوستانہ طریقہ سے مل جل رہے M. Raynouard نے کافی ثبوت دیا ہے کہ پروفانس زبان پرتگال میں ۷۳۴ء میں Alcacem کے عمارت کے کسی حصہ میں تحریراً موجود تھی اس وقت جنوبی فرانس کے تمام صوبہ جات عبدالرحمٰن کے قبضے میں آچکے تھے طلیطلہ Toledo کی فتح جو ۱۰۸۵ء میں ہوئی یہ پروفنسال کی شاعری کی تاریخ نہیں قرار دی جا سکتی جیسا کہ Alexandre M. Ginguené نے اس کو پروفنسا شاعری کا سال مقرر کیا ہے طلیطلہ کی

(بقیہ حاشیہ بر صفحہ آئندہ)

کے نظم میں عمدہ نازک خیالات ۔ افلاطونی محبت ۔ عزت و احترام کا جذبہ قوی کا کمزور کی مدد کا خیال بلند کرداری کی اُمنگ فرانس کے قدیم تروفیر Troubadour کے یہاں نہیں ملتی شہسواروں کے داستان Romance of chivalry کے موجدین نے اپنے ہیرو کی تصویر کھینچنے میں جرمن کی وفاداری ، فرانس کی بہادری اور عرب کی بلند خیالی سے کام لیا جب شہسواروں کی داستان کی ترقی ہوئی تو اس وقت عرب کی اخلاقی حالت اوج کمال پر تھی نیکی پارسائی میں سرگرم تھے زبان کی پاکیزگی اور ان کے مصنفین کی نازک خیالی سے یورپ والے کسی قدر ندامت محسوس کرتے ہیں اور سچ تو یہ ہے کہ تمام یورپ سے زیادہ اولوالعزم اندلسی تھے جو عرب ہی کے تعلیم یافتہ علماء و فضلاء تھے عرب ہی اسپین میں شہسواروں کی داستان کے موجد تھے انھیں کے شہسواروں کی حیرت انگیز داستان نے دلوں پر بہت اثر کیا عربوں کا دستور تھا کہ روزانہ شام کے وقت اپنے خیموں میں جمع ہو کر حیرت انگیز داستانوں کو سنتے تھے غرناطہ میں تو اس داستان کے ساتھ رقص و سرود بھی ہوتا تھا اسپین کے تاریخی قصائد ان کے "موالیا" عربی ہی شاعری سے ماخوذ ہیں جس طرح یورپ عربی ادب و افسانہ سے بلا تکبیر پورے طور سے متاثر ہے مثلاً مقدس پیالہ Holy Grail کے افسانے بے شبہ شامی سرچشموں سے لئے گئے حکیم بیدپا کے اخلاقی قصے الف لیلہ کی کہانیوں نے جو اثر کیا وہ ناقابل رد ہے چاسر Chaucer کی کہانی اسکوائرز ٹیل Squire's Tale اصل میں الف لیلہ ہی کی ایک کہانی ہے بوکاشیو Boccaccio نے

(بقیہ حاشیہ صفحہ گذشتہ) کی فتح کے معنی یہ ہیں کہ بہت سے مشہور کالج جو عرب کے قبضہ میں تھے عیسائیوں کے قبضے میں آگئے اور ان کالجوں نے درباروں کے ان باہمی اختلاط کے بہت زمانہ بعد تک جس نے ان کی شاعری کو مانوس کرایا تھا ۔ مسلسل علوم عربیہ کو مغرب میں پھیلانے کا سلسلہ جاری رکھا مراقشی کا اثر لاطینی پر سائنس ۔ فلسفہ ۔ ادب ۔ تجارت ۔ زراعت اور مذہبی کتابوں کے مطالعہ سے صاف نمایاں ہے لہذا یہ کس قدر تعجب خیز ہے کہ اس نے ان گانوں اور گیتوں پر اثر نہ ڈالا ہو جو تہواروں میں کی رو سے رواں تھے جس میں دونوں قومیں آپس میں ملتی جلتی تھیں جب کہ ہم یہ بھی جانتے ہیں کہ دونوں قومیں گانے اور شاعری پر کس قدر فریفتہ تھیں ۔

قصے سن کر اپنی کتاب Chanson de Roland کی صورت میں پیش کیا بالکل اسی طرح
فرانس والے شہسواروں کے داستان سے بہت متاثر ہوئے جب شارلیمان
Charlemagne نے فتوحات عظیم کے بعد شاہنشاہ کا لقب اختیار کیا اور نصاریٰ کے حجاج
کے لئے بیت المقدس کی زیارۃ کی اجازت عباسی خلیفہ سے حاصل کرلی تو اس کی بڑی
شہرت ہوئی اس کی شان میں اس کے متعلق قصے اور اشعار پڑھے جانے لگے جیسے عرب
والے ہارون الرشید کے لئے کیا کرتے تھے "اغانی رولاں" Chanson de Roland
"حج شارلیمان" Voyage of Charlemagne نظم کئے گئے اسی فرانسیسی زبان میں جس
کو اس زمانے والے بولتے تھے عرب کی اس تقلید میں ان کے علاوہ اور بہت سے قصائد
حروب صلیبیہ کے متعلق کہے گئے جن کا مطالعہ عرب کی تاریخ کے محققین کے لئے اتنا ہی ضروری
ہے جتنا کہ یورپین محققین کو اپنے تاریخی غوامض کے اکتشاف کے لئے عربی کتابوں کی چھان
بین کی ضرورت ہے بارھویں صدی کے اخیر میں اور تیرھویں صدی کے ابتدا میں شمالی
شعرا جنوبی شعرا کی تقلید کرکے محسنات شعریہ ۔رقت غزل ۔عربی قوافی اور الحانِ موسیقیہ
کا استعمال کیا اور اسی کے زیر اثر بہت سے دیوان مرتب کئے اور پھر اشعار ہجو یہ ہزلیہ اور
حکایات کلیلہ دمنہ کے طریقہ پر اور کچھ حکایات حیوانات کی زبان سے بیان کرتے ہوئے
لکھے گئے مثلاً رومان روز Romance of Rose اور رومان ثعلب Roman de Renart
وغیرہ

شہسواری کی وہ روح جو قرون وسطیٰ میں چھائی ہوئی تھی جس نے جنگ جوئی کی
وحشت و بربریت کو شہسواری کے ورزشی کھیلوں سے بدل دیا اور عشق و محبت نے
جو ادب العانیہ پیدا کیا اور عورت سے جو محبت تراشا وہ اسی روح کا فیض تھا جو عربی
شاعری نے پیدا کی تھی اور موشحات کے ذریعہ دنیا کے سامنے پیش کیا آٹھویں صدی میں
اسلیبشی زبان میں غیر نفسانی بے لوث پاک یعنی افلاطونی محبت کی تحریک کا آغاز ہوا

تھا اس پر عربی شاعری کا اثر قطعی طور پر نمایاں ہے اس کا اثر پروونسال شاعری پر اس حد
تک ہوا جس کو پروفیسر حتی اپنی کتاب "عرب اور اسلام" میں یوں بیان کرتے ہیں "گیارہویں
صدی کے اخیر میں جنوبی فرانس کے ادبیں پروانسی [illegible] شعر عشق و محبت کی
شعلہ سامانیوں کو عجیب و غریب پر بہار تخیل کے سانچوں میں ڈھالتے ہوئے پر زور شور کے
ساتھ نمودار ہوتے ہیں قرون وسطیٰ کے غزل گو شاعر جنہیں بارہویں صدی میں فروغ حاصل
ہوا تھا اپنے جنوبی "غزل سرا" [illegible] Zajal معاصروں ہی کے پیرو تھے عربی شاعروں
کو ہی اپنے سامنے رکھ کر جنوبی یورپ میں "مسلک ظرافت" Cult [illegible] Dame ایک ایک
نمودار ہوئی ابتدائی یورپ کی سب سے بڑی یادگار جانسن دی رولاں" Chanson de Roland
جو ۱۱۰۰ء میں لکھی گئی جس طرح ہومر Homer کی نظموں سے تاریخی یونان کے آغاز کا
پتہ چلتا ہے بالکل اسی طرح جان سن رولاں سے بھی ایک نئے مغربی یورپ کے تمدن کے
آغاز کے آثار و علامات کا سراغ ملتا ہے یہ کتاب اپنی تخلیق کے لحاظ سے ایک ایسے فوجی
ربط کی رہین منت ہے جو اہل یورپ نے اس زمانہ میں اسلامی اسپین سے قائم کیا تھا" سچ
تو یہ ہے کہ بقول پروفیسر حتی "یورپی ادب پر عربی زبان کا سب سے بڑا اثر یہ ہے کہ اس نے
اپنی طرز انشار کا جو اثر ڈالا اس کی بدولت معمولی تخیل کو سخت ترین ذہنی بندشوں سے
رہائی نصیب ہوئی جن میں وہ روایات کے ہاتھوں گرفتار تھے" اسپینی ادب کے اعلیٰ مزاح
میں جس طرح عربی نمونوں کی جھلک صاف نظر آتی ہے مثلاً سرفانٹس کی کہانی "دان کوشوٹ،
دکویک زاٹ" [illegible] Don کی ظرافت اور بذلہ سنجی میں یہی رنگ دکھائی دیتا ہے بالکل
اسی طرح یہ افلاطونی محبت بھی اسپین میں عرب ہی کے اثرات ہیں جس نے پروونسال شاعری
میں اپنا گھر کر لیا۔ یہ مسحور کرنے والی محبت نازک و لطیف جذبات زیب و زینت و آرائش
اور دلی محاسن سے معمور وہ محبت نہیں ہے جس کو معمولی یا جذباتی محبت سے تعبیر کیا جائے
بلکہ ایک وجد انگیز اصول ہے عجیب و غریب نازک طریقہ ہے ایک فطری حالت ہے جو اپنے

کمال کا نمونہ عام عورتوں میں نہیں پاتا بلکہ بیوی میں پاتا ہے جس کی عزت و احترام و حفاظت
کی پاسداری اور حسن کی بے لوث محبت کا خیال ایک خلاق قوت پیدا کرتا ہے جس سے شاعر کی
زندگی نہایت پُرشان و شوکت ہو جاتی ہے یہ فنِ محبت یہ عورت کا ادب لطالیہ یہ خاتونی محبت
کا طریقہ کہاں سے آیا پروفانساوالے اپنی ابتدائی شاعری میں اس سے بالکل نابلد تھے ان کے
تروبادور [illegible] کی تحریریں بالکل غنائی تھیں [illegible] رزمیہ [illegible] نہ تھیں یہ
ضرور پروفنسا کی شاعری کے لئے باعث فخر ہے کہ انھوں نے اولوالعزمی اور نازک خیالی کے
محاسن کا خیال رکھا اور زمانہ میں برائیوں کے باوجود بلند خیالی کے عزت و احترام کی حفاظت
کی جذباتِ محبت اور رموزِ محبت میں تروبادور کو عرب کی شاعری سے جو گہرا تعلق ہے وہ پروفنسا
ملی شاعری میں روزِ روشن کی طرح نمایاں ہے مسلمان کے نزدیک عورت ایک دیوی ہے اور
غلام بھی اور اس کا حرم مندر بھی ہے اور قید خانہ بھی اس کا حرم ان تمام آراستگی اور نازک خیالات
کا مجموعہ ہے جو حماسی شاعری میں نمایاں ہے اسی کی وجہ سے عربی و فارسی قصائد پروفنسال
کے گانوں کا ترجمہ معلوم ہوتا ہے یہ پاک بے لوث اور افلاطونی محبت اس زمانہ کے اخلاق سے
نہیں پیدا ہوئی جس کی تصویر اس زمانہ کے ادب میں نمایاں ہو عورت بقول [illegible]
قرونِ وسطی کی متوسط زندگی میں حد درجہ کی ذلیل اور ہر قسم کی قوت اور وحشیانہ برتاؤ کے لئے
سرنگوں ہوتی تھی اور نہ ہی یہ خیال نسیفالیہ نظموں [illegible] کے نمونہ کمال میں پائی جاتی
ہیں جس کی ابتدا صرف امرا کے خوش کرنے کے لئے ہو رہی تھی یہ ضرور ہے کہ یورپ میں جا بجا
کسی قدر عورتوں کے احترام کا جذبہ تھا وہ حضرت مریم کی پاکیزہ زندگی کا لحاظ کرتے ہوئے بعض
عورتوں کو فرشتہ صفت دیوی سمجھتے تھے مگر اصولی حیثیت سے تو یہ بات تھی لیکن عمل اس کے
بالکل خلاف تھا اس قسم کا نازک خیال و فطری جذبات یہ عورت کا نیا ادب لطالیہ روحانی عشق
محبت اور پاکیزہ خیالی کنیسہ کی پاک دامن اور اچھوت عورتوں کے نمونہ کمال سے بالکل مختلف
تھا یونانی اور لاطینی ادب چاہے وہ عہد زریں ہی کا ہو مگر اس کی روحانی دنیا [illegible]

مگر اس کا وجود یقینی طور پر ان کی شاعری میں نمایاں ہے جس کا واحد ذریعہ اور ممکن سرچشمہ عرب اندلس کی شاعری ہی ہو سکتی ہے گیارہویں صدی سے پہلے بلکہ بہت پہلے عرب کی شاعری اوج کمال پہنچی اور عرب کے قدیم زمانہ بلکہ ہر زمانہ کی شاعری کبھی بھی اس قسم کی پاکیزہ محبت اور فطری جذبات سے خالی نہ تھی کہ زمانۂ جاہلیت میں اس بے لوث افلاطونی محبت کا ذکر نہایت صیقل زبان میں نادر استعارات مع دلکش تشابیہ میں عمدہ عروض کے بحر و اوزان اور بے عیب قوافی لوازمات کے ساتھ ساتھ (کیوں کہ یہ عنصر صرف عرب میں قدیم سے پایا جاتا ہے) بیان کیا جاتا تھا ہر ہر غزل و قصائد میں نسیب و تشبیب کا ذکر لابدی تھا شاعر اپنی معشوقہ سے جدائی و ہجر کا غمگین خیال اور پاکیزہ محبت ہر اس موقع پر جب وہ اپنی معشوقہ کے مکانات کے کھنڈرات سے گذرتا تھا تو ضرور کرتا تھا نظم کی ابتدا ہی اس سے کرتا تھا کیوں کہ محبت کا تقاضا بھی یہی تھا جو ان کی تمام شاعری میں نمایاں ہے مثال کے لئے چند اشعار زمانہ جاہلیت کے درج کرتا ہوں :—

قفا نبک من ذکری حبیب و منزل   بسقط اللوی بین الدخول فحومل
کانی غداة البین یوم تحملوا   لدی سمرات الحی ناقف حنظل

(امرء القیس)

عوجوا فحیوا لنعم ومنة الدار   ماذا تحیون من نوی واحجار
وقد ارانی ونعما لاهیین بها   والدهر والعیش لم یهمم بامرار
ایام تخبرنی نعم واخبرها   ما اکتم الناس من حاج واسراری

(نابغہ)

ما بکاء الکبیر بالاطلال   وسوالی وما ترد سوالی
دمنة قفرة تعاورها الصیف   بریحین من صبا وشمال
لاتالی ذکری جبیرة ام من   جاء منها بطائف الاهوال

(اعشی)

یا دار عبلة بالجواء تكلمي وعمي صباحا دار عبلة واسلمي

(عنترہ)

اذ نتنا ببينها اسماء رب ثاو يمل منه الثواء

(حارث بن حلزہ)

لخولة اطلال ببرقة ثهمد تلوح كباقي الوشم في ظاهر اليد

وقوفا بها صحبي على مطيهم يقولون لا تهلك اسى وتجلد

(طرفہ)

امن ام اوفى دمنة لم تكلم بحومانة الدراج فالمتثلم

فلما عرفت الدار قلت لربعها الا انعم صباحا ايها الربع واسلم

(زہیر)

اور دیکھئے

سلی البانة الغيناء بالاجرع الذی به البان هل حييت اطلال دارك

وهل قمت فی اطلالهن عشية مقام اخی البا سام واخلرت ذلك

وهل همكت عيناى فی الدار غدوة بدمع كنظم اللؤلؤ المتهالك

ارى الناس يرجون الربيع وانما ربيعي الذی ارجو نوال وصالك

ارى الناس يخشون السنين وانما سنيتي التی اخشی صروف احتمالك

لئن ساءنی ان نلتنی بمساءة لقد سرنی انی خطرت ببالك

ليهنك اسای بكفی علی الحشا ودرفراق عينی دهبة من زيالك

جب شاعری شہروں میں پھیلی محبت کا عنصر زیادہ مضبوط ہونے لگا بلکہ نئی نئی ترکیبیں اور لطیف جذبات شامل ہوتی گئیں شعر غنائی کا دور دورہ ہوا شاعری اپنی ذاتی عواطف اور فطری محبت کا مظاہرہ کرتی رہی پھر درباری شعراء کے یہاں بھی شعرِ غنائی ایک خاص قسم کے رنگ توپلین وترنم رقص وسرود اور ادبی لچک قوافی واوزان کے ساتھ ساتھ اصل عواطف کو جوش میں لائے

اور جذبات کو ابھارنے کے لئے استعمال کیا گیا صوفیوں میں بھی اسی عشق مجازی کے لباس میں روحانی محبت کا ذکر ہونے لگا تاکہ وہ اس طرح سے معشوق حقیقی کی اطاعت بحسن و خوبی انجام دے سکیں یہی وہ فطری اور پاکیزہ محبت ہے جس کا گہرا اثر پروفنسا کی شاعری پر پڑا اس نئی غنائی شاعری Provencal کی ایک خصوصیت یہی افلاطونی محبت کی بنیاد ہے جس میں محبت کے معاشرتی اصول اور اخلاقیات بھی شامل ہو گئے جو عرب کی ایک نمایاں خصوصیت اور قابل داد اور لائق دید خدمت ہے آٹھویں صدی کے اخیر میں بغداد کے دربار میں کچھ شعرا ایسے گانے کی دیوی خیالات و جذبات Ecstasy کو بالکل اسی فن محبت کے لئے استعمال کر رہے تھے ابن داؤد نے Ibn Dawud کتاب الزہرہ Book of Venus میں محبت کے تمام نظریات، اس کی فطرت، اصول، تاثرات کے اصول اس نمونۂ کمال کے مطابق مرتب کیا جس کو حدیث میں ان الفاظ میں بیان کیا گیا ہے "من یحب ویکتم حبہٗ ویحیی عفیفا ویموت فھو شھید[1]"

Who so loves and conceals his love, remains chaste and dies. That one may martyr

مسلمانوں کی تہذیب کی وسعت اور ان کی مفتوحہ حکومتوں کا باہمی اختلاط سے اس قسم کی شاعری اندلس میں نمودار ہوئی اور یہاں شمال کے عیسائیوں سے مسلسل لڑائیوں کی وجہ سے جو باہمی ارتباط ہوا اس سے اس فن نے زیادہ فروغ پایا عرب کی شاعری اور محاسن کا یہیں مظاہرہ ہوا یہاں شعرا میں سعید بن جوزی Said ibn Judi بقول ڈوزی شعر غنائی کی ایک بین مثال ہے یہاں بھی افلاطونی اور غیر نفسانی محبت کے نمونۂ کمال کو عالمگیر مقبولیت حاصل ہوئی۔ ابن حزم Ibn Hazm جو نہایت متقدر مذہبی آدمی تھا جس کی عزت و احترام مذہب کے تقابلی علوم کے بانی ہونے کی حیثیت سے تمام مغرب میں کی جاتی تھی وہ بھی اس کی دوسری شان دار مثال ہے انھوں نے بھی محبت پر ایک رسالہ لکھا جو کتاب الزہرہ Book of Venus سے بھی سبقت لے گیا وہ محبت کے افلاطونی اصول سے بالکل متفق ہے اس نے محبت کی ایسی عمدہ تشریح کی ہے جو اس کے بعد میں آنے والی صدی میں تروبادور Troubadours کے یہاں پائی جاتی ہے اگرچہ یہ لوگ اس بلندی تک نہ پہنچ سکے اسی درباری شعراء کے تروبادور بہت متاثر ہوئے۔ لیکن یہاں ایک دشواری اور اہم سوال یہ ہوتا ہے کہ متقدمین ترابادور عربی نہیں جانتے تھے تو پھر کون وہ درمیانی حضرات تھے جنہوں نے اس فن کو اندلس سے پروفنسا کی طرف منتقل کیا۔

---

[1] حدیث کا عربی ترجمہ ہے۔ جو محبت کرتا ہے اور اپنی محبت کو چھپا لیتا ہے اور عفت کی ساتھ زندہ رہ کر مر جاتا ہے وہ شہید ہے

تبصرہ

نام کتاب : دلی کی تاریخی مساجد حصہ اول

مصنف : عطاء الرحمٰن قاسمی

قیمت : ۲۰۰ روپیہ

ناشر : مولانا آزاد اکیڈمی ۳۴ ابوالفضل انکلیو اوکھلا نئی دہلی ۲۵

تبصرہ نگار : اخلاق حسین قاسمی

دلی کی تاریخی مساجد حصہ اول میں دلی کی قدیم تاریخی مساجد کا مکمل تعارف و تبصرہ شامل ہے اور ان مساجد کی تصویریں بھی دی گئی ہیں اور ان یادگار مسجدوں کی پیشانیوں اور دیواروں پر لگے ہوئے نادر و نایاب کتبوں اور لوحوں کا بھی ذکر ہے۔ اور گاہ بگاہ لوح نویسوں اور خطاطوں کا اجمالی تذکرہ بھی آگیا ہے۔ جو دلچسپ بھی ہے اور معلوماتی بھی! اور جس سے "فن کے ساتھ" "صاحب فن" کے تعارف کی روایت قائم ہوتی ہے۔ جو تاریخ و ادب میں خوش آیند امر ہے۔

دلی کی تاریخ پر بہت کچھ لکھا گیا ہے۔ اور اچھے پیرایہ میں لکھا گیا ہے۔ لیکن دلی کی تاریخی مساجد پر کوئی مستقل کتاب ابتک نہیں لکھی گئی تھی۔ عطاء الرحمٰن قاسمی صاحب نے مساجد پر مستقل کتاب لکھ کر ہم لوگوں کی طرف سے فرض کفایہ ادا کیا ہے۔ اور دلی والوں پر احسان کیا ہے۔

مولانا قاسمی اپنی چند اہم تاریخی کتابوں اور مختلف مضامین کی وجہ سے ایک پختہ قلم اور پختہ فکر مصنف کے طور پر شہرت پا چکے ہیں۔ اور یہ نئی تحقیقی کتاب ان کی علمی شہرت میں مزید اضافہ کرے گی۔ اور مصنف کتاب تاریخ کے صفحات میں بہت دنوں تک زندہ رہ سکے گا۔

اس کتاب کی ایک بڑی خصوصیت یہ ہے کہ مصنف نے جہاں ان مساجد کی تاریخ قدیم عربی و فارسی کتابوں کے حوالوں کے ساتھ لکھی ہے ـــــ وہیں ان مساجد کا معائنہ و مشاہدہ بھی بھی کیا ہے۔ اور ان مساجد پر بیٹھے ہوئے حالات و واقعات کو بیان کرنے کے سلسلہ میں غیر جانبداری

(باقی صلا پر)
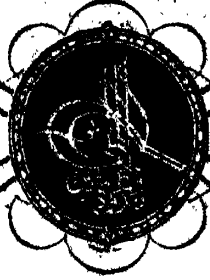
سرپرست اعلیٰ
عالیجناب حکیم عبدالحمید چانسلر جامعہ ہمدرد
جون تا جولائی ۱۹۹۶ء
برہان
جلد ۱۱۸/۱۹ شمارہ ۶، ۷
نگران اعلیٰ
حضرت مولانا حکیم محمد زماں حسینی
مجلس ادارت اعزازی
سید اقتدار حسین
ڈاکٹر معین الدین بقائی
محمود سعید بلالی
ڈاکٹر جوہر قاضی
نظرات عمیدالرحمن عثمانی ۲
مفتی صاحبؒ سے ایک ذاتی اور علمی مذاکرہ ۶
دسویں صدی ہجری کا باکمال محدث ۱۹
جناب شیخ فرید برہان پوری، پروفیسر پرشین کالج جبل پور
فلسطین کی ممتاز شاعرہ، فدوی طوقان ۲۵
حقانی القاسمی، نئی دہلی۔
ہندوستان کی آزادی۔ کچھ ذمہ دار اسباب ۳۰
مختار احمد مکی۔ ریڈر شعبہ سیاسیات کریم سٹی کالج جمشید پور
تبصرہ ۳۷
وفیات ۳۹
دفتر رابطہ
Nadwatul-Musannefeen
4136, Urdu Bazar, Jama Masjid, Delhi-110006

نظرات

حالیہ پارلیمنٹری انتخابات کے نتائج نے ہندوستان کی سیاست میں ہلچل مچا دی ہے۔ اور کانگریس جماعت کو اس الیکشن میں جسطرح شکست کا سامنا کرنا پڑا اس کا کچھ اندازہ پہلے سے تو تھا مگر اس کا کسی کو بھی گمان نہ تھا کہ کانگریس اس بری طرح ہارے گی کہ ریکارڈ بن جائے گا۔ اس انتخاب میں کانگریس دوسرے نمبر پر سمٹ کر رہ گئی اور جو پارٹی کبھی پارلیمنٹ میں کسی گنتی میں شمار نہ ہوتی تھی وہ نمبر اول پر براجمان ہوگئی۔ ہماری مراد بھارتیہ جنتا پارٹی سے ہے ۱۹۸۴ء میں یہ پارٹی پارلیمنٹ میں صرف دو عدد سیٹوں کے ساتھ اپنی موجودگی بمشکل برقرار رکھ پائی تھی اور ۱۹۸۰ء میں جبکہ یہ پارٹی نئی نئی قائم ہوئی تھی، پارلیمنٹ میں اس کی سیٹیں کل دس تھیں مگر ۱۹۸۹ء کے پارلیمنٹری انتخابات میں بھارتیہ جنتا پارٹی کانگریس کی ڈھلمل پالیسی اور اس کے ایک طرح سے سیکولرزم کے انحراف کی بدولت اور جنتا دل کے قیام کے نتیجہ میں ایکدم چھلانگ لگا کر اسّی سے اوپر پہونچ گئی اور پھر ۱۹۹۱ء میں یہی بھارتیہ جنتا پارٹی ایک سو انیس سیٹیں جیت کر پارلیمنٹ میں دوسری بڑی پارٹی کی صورت میں ابھر کر سامنے آئی اور پارلیمنٹ میں حزب اختلاف کی باوقار کرسی پر جا چڑھی ۔ اور ۱۹۹۶ء کے پارلیمنٹری انتخابات میں بھارتیہ جنتا پارٹی نے وہ کامیابی حاصل کی کہ کانگریس اس کے آگے بونی ہوگئی۔ اور پارلیمنٹ میں سب سے بڑی پارٹی بن کر حکومت بنانے کی دعویدار بن گئی۔

سنہ ۱۹۹۶ء کے پارلیمنٹری انتخابات میں بھارتیہ جنتا پارٹی کو تمام دیگر سیکولر اور غیر سیکولر جماعتوں سے زیادہ سیٹیں دستیاب ہوگئیں تو اس کا حکومت بنانے کا دعویٰ سراسر جائز اور صحیح تھا چنانچہ صدر جمہوریہ ہند کے سامنے جب بھارتیہ جنتا پارٹی نے حکومت بنانے کا دعویٰ پیش کیا تو صدر جمہوریہ ہند نے آئین کے مطابق اسے حکومت بنانے کا موقع دیا۔ بھارتیہ جنتا پارٹی کے پارلیمنٹری قائد جناب اٹل بہاری باجپئی نے بحیثیت وزیر اعظم حلف لیا۔ اور انہوں نے اپنی اتحادی جماعت شیوسینا، اکالی دل بادل، اور سمتا پارٹی کی حمایت سے اپنی حکومت بنائی دس افراد پر مشتمل اپنی کابینہ کا بھی اعلان کیا۔ صدر جمہوریہ ہند نے انھیں ۱۵ روز کے اندر اندر اپنی اکثریت ثابت کرنے کا وقت دیا۔ اور اس وقت سے کچھ ایک آدھ دن پہلے ہی اپنی اکثریت ثابت کرنے میں مشکل و دقت کا اندازہ کر کے جناب اٹل جی نے وزارت عظمیٰ سے استعفیٰ دینے میں ہی اپنی عافیت سمجھی۔ وہ ۱۳ روز تک ہندوستان کے وزیر اعظم رہے۔

بھارتیہ جنتا پارٹی کی حکومت کو گرانے کے لئے کانگریس سمیت تمام سیکولر پارٹیوں نے ایک پلیٹ فارم بنایا اور اس کے تحت کرناٹک کے وزیر اعلیٰ جناب دیوگوڑا کی قیادت میں حکومت بنانے کے لئے صدر جمہوریہ ہند کے سامنے اپنا دعویٰ پیش کیا جسے صدر جمہوریہ ہند نے منظور کرتے ہوئے جناب دیوگوڑا کو وزیر اعظم کی کی حیثیت سے حلف دلاکر حکومت بنانے کا موقع دیتے ہوئے انھیں پارلیمنٹ میں دس روز کے اندر اپنی اکثریت ثابت کرنے کے لئے ہدایت کی۔

جناب دیوگوڑا دس روز کے اندر پارلیمنٹ میں اپنی اکثریت ثابت کرسکیں

گے یا نہیں یہ الگ بات ہے ویسے قیاس اغلب ہے کہ وہ پارلیمنٹ میں اپنی اکثریت ثابت کردیں گے کیونکہ بھارتیہ جنتا پارٹی، شیوسینا وغیرہ کے علاوہ دوسری تمام ۱۳ پارٹیوں نے انھیں اپنی حمایت پیش کی ہے۔ لیکن اب یہاں سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ حکومت بنانے کے لئے چھوٹی بڑی سیکولر پارٹیوں کا اتحاد مستقبل میں واقعی پائیدار ثابت ہوگا بھی یا ایسے ہی ہوا میں اڑ کر رہ جائے گا جس کے بعد اگر خدانخواستہ دوبارہ ملک کو پارلیمنٹری الیکشن کا سامنا ہوا تو کیا ملک کا اقتصادی ڈھانچہ اس کے اخراجات کا متحمل ہوسکے گا بھی، یہ سوچنے کی بات ہوگی۔ اور جیسے تیسے مجبوری میں الیکشن ہو بھی جاتے ہیں تو پھر سیکولر طاقتیں جو حکومت بناتے وقت ایک ہیں مگر الیکشن کے وقت ایک دوسرے کے خلاف نبرد آزما ہوں گی تو پھر یہ بھی یاد رکھنے والی بات ہوگی کہ اس ملک پر اسی بھارتیہ جنتا پارٹی کی حکومت ہوگی جس کے خلاف یہ سب پارٹیاں اس وقت ایک ہوگئی ہیں اگر کسی بھی حالت میں اسے حکومت بنانے کے حق سے محروم کرنے پر تلی ہوئی ہیں۔ کہ فرقہ پرستی کی لعنت سے ملک کو محفوظ رکھنا ہے۔ زبانی جمع خرچ تو ان کا یہ ہی ہے لیکن عملی کردار ان کا یہ ہوگا کہ بھارتیہ جنتا پارٹی پوری طاقت سے ابھرے گی اور پھر یہ سب سیکولر جماعتیں جو الیکشن کے وقت ایک دوسرے کی ٹانگ کھینچنے میں لگی ہوئی ہوں گی بھارتیہ جنتا پارٹی کو حکومت بناتے وقت ہائیں ہائیں کرتی ہی رہ جائیں گی!

کچھ حضرات کا یہ گمان و وہم تھا کہ اگر بھارتیہ جنتا پارٹی برسر اقتدار آگئی تو وہ کوئی ایسا اقدام کرنے سے باز رہے گی جس سے ملک کے سیکولر ڈھانچہ پر آنچ آئے۔ کیونکہ ملک کے اکثر صوبوں میں اس کی حکومت میں ایسی کوئی کارگزاری دیکھنے کو نہیں ملی جس سے

سیکولر پسندوں کو تشویش لاحق ہو۔ مگر ۱۳ روز کی مرکزی حکومت کی باگ ڈور سنبھالنے کے بعد بھارتیہ جنتا پارٹی کے حامیوں نے یوپی میں جسطرح کا کھیل کھیلا۔ اس کا کچھ تھوڑا بہت اندازہ نئی دہلی سے شائع ہونے والے ہندی اخبار نو بھارت ٹائمز کی ایک خبر سے ہوتا ہے جس میں یہ چھپا ہے کہ یوپی میں بھاجپا کے حامیوں نے اپنی حریف جماعت سماجوادی پارٹی کے کئی ورکروں کو ہلاک کیا اور مرادآباد میں مسلم انٹر کالج کی زمین پر جبراً قبضہ کیا جسے پولیس کی مدد سے بمشکل ہٹایا گیا۔ اس سے پہلے یوپی ہی میں بھاجپا کی حکومت ہی کے سلسلے میں بابری مسجد کا انہدام عمل میں لایا گیا۔ اس لحاظ سے دیکھا جائے تو بھارتیہ جنتا پارٹی کی حکومت اگر مرکز میں خدانخواستہ تھوڑی سی مدت ہی تک ٹک جاتی تو نہ معلوم ملک کا کیا حشر ہوتا اس کا تصور ہی رونگٹے کھڑے کر دیتا ہے۔ جو ہوا وہ بہتر ہی ہوا۔ دفعہ ۳۷۰، یا یکساں سول کوڈ وغیرہ جیسے مسائل سے ملک کو جس طرح کے خطرات درپیش ہوتے اس سے یقیناً ملک کے باشندوں کو مصیبتوں کا ہی سامنا ہوتا۔ جس سے ملک کا سیکولر ڈھانچہ جو جیسا کچھ ہے، تہس نہس ہو کر رہ جاتا!

جناب دیوگوڑا نے وزارتِ عظمیٰ کی حلف برداری کے بعد حکومت کی اہم پالیسیوں کا جو اعلان کیا ہے اور اپنی کابینہ کی جس طرح تشکیل کی ہے اسے دیکھ کر ملک میں خوشحالی کی آمد کے لئے حسن ظن کا احساس ہے۔ خدا کرے جناب دیوگوڑا کی قیادت میں یہ ملک ترقی و کامیابی کی منزلیں طے کرے اور یہ حکومت پائیدار ثابت ہو اور پوری مدت پانچ سال تک چلے۔ یہ ہر ہندوستانی کی تمنا و خواہش ہے۔ ادارہ "برہان" ہندوستان کے نئے وزیر اعظم جناب دیوگوڑا کو اپنی دلی مبارکباد پیش کرتا ہے۔ اور ہندوستان کے روشن مستقبل کے لئے دعا گو ہے۔

مفتی صاحبؒ سے ایک ذاتی اور علمی مذاکرہ

تلگنڈہ (حیدرآباد) کے ایک صحیفہ نگار ابن غوری نے ۲۵ اکتوبر ۱۹۷۲ء کو مفتی صاحبؒ سے ایک ذاتی انٹرویو لیا تھا۔ اس انٹرویو کے کچھ سوال و جواب پیش نظر ہیں:۔

س :۔ کن اشخاص سے آپ نے (اپنی شخصیت کی تشکیل میں) گہرا اثر قبول کیا؟ اور کس طرح؟ سب سے زیادہ متاثر کن کس کی شخصیت رہی۔؟

ج :۔ علمی اعتبار سے تو میں سب سے زیادہ مولانا انور شاہ صاحب کشمیری سے متاثر ہوا۔ علاوہ اس کے کہ وہ ہمارے سب سے بڑے اُستاد تھے۔ یوں بھی بے مثال محدث اور عالم دین تھے اور جہاں تک میں نے اندازہ لگایا ہے۔ مجموعی اعتبار سے سینکڑوں سال بعد ایسی جامع علوم عقلیہ ونقلیہ ہستی پیدا ہوئی۔

اردو ادب کا جہاں تک تعلق ہے یوں تو مختلف اہل قلم کا اثر مجھ پر پڑا لیکن علمی اور مذہبی چیزوں کو مذہب سے متعلق کرنے کا جہاں تک تعلق ہے مولانا شبلی کا سب سے زیادہ اثر پڑا۔ اور اسی کے ساتھ مولانا ابوالکلام آزاد۔

سیاسی اعتبار سے ہمارے رہنما حضرت شیخ الہند مولانا محمود حسن صاحب تھے۔ اگرچہ ان کا انتقال میری جوانی ہی میں ہوگیا تھا، پھر بھی ان سے قریب رہنے کا موقع ملا۔ اور ان کے خاص شاگردوں مولانا شبیر احمد عثمانی اور مولانا عبیداللہ سندھی سے استفادہ کا موقع ملا۔ اور قدرتی طور پر طبیعت پر اس کا اثر پڑا۔

جہاں تک خالص فقہی اور تزکیہ باطن کا تعلق ہے، مجھ پر سب سے زیادہ اثر

اپنے والد ماجد مفتی عزیز الرحمان صاحب کا رہا۔ مرحوم اپنے دور کے سب سے بڑے مفتی تھے۔ ان ہی کی تربیت میں مجھے بھی یہ کام کرنے کا موقع ملا۔ یوں تو تمام طریقوں میں وہ بیعت کرتے تھے، لیکن طریقہ نقشبندیہ میں خاص طور پر۔ اپنے دور میں اس طریقہ کار کی اشاعت میں مرحوم کا بہت بڑا دخل ہے۔ وہ حضرت حاجی امداد اللہ صاحب مہاجر مکی کے بھی مجاز خاص تھے۔ اور حضرت مولانا شاہ رفیع الدین صاحب مجددی نقشبندی مہتمم اول دارالعلوم دیوبند کے خلیفہ اول بھی۔

س:۔ کن کتابوں اور مصنفین نے آپ کو سب سے زیادہ متاثر کیا۔؟

ج:۔ مجموعی اعتبار سے یوں تو بہت سی کتابوں اور حضرات مصنفین کا اثر پڑا۔ اور حضرت مولانا سید انور شاہ صاحب کشمیری کی خدمت میں رہ کر بہت سی اہم کتابوں کے مطالعہ کا موقع ملا۔ پھر بھی خاص طور پر علامہ شیخ ابن ہمام، علامہ ابن تیمیہ، علامہ ابن قیم، علامہ شاطبی اور حضرت شاہ ولی اللہ کی تصنیفات سے زیادہ استفادہ کا موقع ملا ـــــ جہاں تک اردو مصنفین اور تصنیفات کا تعلق ہے خالص ادبی نقطۂ نظر سے ڈپٹی نذیر احمد کی اصلاحی کتابیں، ان کا ترجمہ قرآن، محمد حسین آزاد کی بعض خالص ادبی کتب، مولانا حالی اور مولانا شبلی کی تصنیفات کے مطالعہ کا موقع ملا۔ اور آخر میں مولانا آزاد کے ترجمان القرآن سے استفادہ ہوا، جو اپنی نوعیت کے اعتبار سے عظیم الشان کارنامہ ہے۔

جہاں تک درسی کتابوں کا تعلق ہے ان میں دوسری کتابوں کے علاوہ ہدایہ، بیضاوی، قاضی مبارک ـــــ اور متوسط کتابوں میں مختصر المعانی اور شرح جامی سے بہت ہی فائدہ ہوا ـــــ اور دورۂ حدیث جو دیوبند میں خاص طور سے پڑھایا جاتا ہے۔ خاص طور پر بخاری شریف اور ترمذی شریف مولانا انور شاہ صاحب سے پڑھنے کا موقع ملا۔ اس لئے قدرتی طور پر اس سے زیادہ فائدہ پہنچا۔ بلکہ درسی زندگی

میں انقلاب ہی آگیا، کہا جاسکتا ہے۔

س :۔ آپ کے پسندیدہ شعراء اور مصنفین۔؟

ج :۔ شعر کی دنیا بہت وسیع ہے اور ہر ایک کا ذوق الگ ہوتا ہے لیکن ہمارے بچپن میں جس شاعر کے نغمے زیادہ گونجتے تھے وہ مرزا داغ تھے۔ اور اس وقت سب ہی ادبی محفلوں میں اس کا تذکرہ ہوتا تھا۔ اور لوگ اسی رنگ میں کہنے کی کوشش کرتے تھے۔ اس لئے مجھ پر نقش اول کے طور پر اس کا اثر پڑا۔ چنانچہ ان کے مطبوعہ دیوان کے پڑھنے اور یاد کرنے کا موقع ملا۔ ان کے بعد جب شعور اور بڑھا اور ذوق میں کچھ پختگی آنے لگی۔ تو پھر چند مشہور شعراء ذوق، غالب، مومن کا کلام پڑھنے کا موقع ملا۔ ہمارے گھرانے میں خاص طور سے مرزا ذوق کا بہت چرچا تھا۔ اور اپنے بچپن میں ہم نے زیادہ ان ہی کا نام سُنا تھا اور اپنے بزرگوں سے ذوق کے بہت سے اشعار سُنے تھے۔ پھر جب خود مطالعہ کا وقت آیا تو ذاتی طور پر غالب کے دیوان کا اثر پڑا خالص تغزل کے اعتبار سے مومن خاں کی غزلوں میں اور ان کے تخیل کی نزاکت میں اور اس ربط میں کہ جو عاشق و معشوق کے درمیان ہوتا ہے۔ مومن خاں نے اس کو جس نفاست اور جس باریکی سے بیان کیا ہے۔ اس کا زیادہ اثر ہوا۔ اپنے دور کے شاعروں میں قریباً سبھی کو براہ راست سننے اور دیکھنے کا موقع ملا۔ خاص طور پر حسرت موہانی، جگر، فانی، اصغر۔ اور سیاسی، اجتماعی اور ملی شاعری کے اعتبار سے ڈاکٹر اقبال کے کلام کا نہ صرف غیر معمولی اثر پڑا۔ بلکہ اس سے اجتماعی زندگی کی بہت سی لائنوں کو روشنی ملی۔ اب سے ۴۰۔ ۵۰ سال پہلے جبکہ علامہ اقبال کی بعض خاص نظموں کا عام چرچا ہوا تھا۔ میں نے بھی ان کو بڑے ذوق سے پڑھا، یاد کیا۔ خصوصاً ان کی نظم شمع اور شاعر، طلوع اسلام، شکوہ جواب شکوہ، اور بہت سی غزلیں ذوق و شوق سے پڑھیں۔ پھر کچھ عرصہ بعد اقبال کے

مذاق میں جو پختگی آئی اور ایک خاص رنگ پیدا ہوا۔ اس کو بھی میں نے محسوس کیا اور پھر ضربِ کلیم اور بالِ جبریل وغیرہ سے فائدہ اٹھایا۔

س :- آپ کتنی زبانوں سے واقف ہیں۔ ؟

ج :- اصل زبان تو میری اُردو ہے۔ فارسی باقاعدہ پڑھی، ۷ - ۸ سال تک اور اسی طرح ۸ - ۹ سال تک عربی پڑھی۔ اور بقدرِ ضرورت انگریزی بھی سمجھ لیتا ہوں، اور پڑھ لیتا ہوں۔

س :- آپ کی ذاتی لائبریری کتنی کتابوں پر مشتمل ہے؟ کوئی نایاب کتاب؟

ج :- میری لائبریری اگرچہ مختصر ہے مگر اس میں عربی کی تقریباً تمام مروجہ علوم وفنون کی اہم اور ضروری کتابیں موجود ہیں۔

س :- چند پسندیدہ اشعار ارشاد فرمائیں۔

ج :- تری خاک میں ہو اگر شرر تو خیالِ فقر و غنا نہ کر
کہ جہاں میں نانِ شبینہ پر ہے مدارِ قوتِ حیدری
گلۂ جفائے وفا نما کہ حرم کو اہلِ حرم سے ہے
کبھی بُت کدے میں بیاں کروں تو کہے صنم بھی ہری ہری

⁂

ذوق بے پروا گیا، فکرِ فلک پیما گیا
تیری محفل میں نہ دیوانے نہ فرزانے رہے
رشتۂ الفت میں جب ان کو پرو سکتا تھا تو
پھر پریشاں کیوں تری تسبیح کے دانے رہے

س :- اپنی زندگی کا کوئی ناقابلِ فراموش واقعہ۔ ؟

ج :- زندگی میں بہت سے ایسے واقعات پیش آئے ہیں، لیکن مجلس مشاورت کے

اجتماع کے سلسلے میں جو دیوبند میں ہوا تھا، وہاں ایک ایسا واقعہ پیش آیا۔ جو
ناقابل فراموش ہے۔ یعنی یہ کہ کچھ ہمارے سیاسی حریفوں نے دارالعلوم کے بعض طلبہ کو مشتعل کرکے اس اجتماع کو درہم برہم کرنے کی کوشش کی۔ اور مجھ پر بے تحاشہ لاٹھیوں سے حملہ کر دیا۔ مجھے نہیں معلوم کہ اس وقت میری جان کس طرح بچی۔ لیکن رہ رہ کر یہ خیال آتا رہا۔ کہ میں نے اپنی عمر کا بڑا حصہ طلبہ کے جذبات کو سمجھنے اور ان کی خدمت میں صرف کیا ہے۔ اس پر میرے ساتھ اس طرح کا معاملہ، بہت غور کرتا ہوں سمجھ میں نہیں آتا۔

س:۔ آپ کی شدید خواہش کیا ہے۔؟

ج:۔ آرزو یہ ہے کہ ملت کے مشترک مسائل اور مصائب میں ان کو سمجھنے اور حل کرنے کے لئے کوئی ایسا مشترک پلیٹ فارم ہو، جو خیالات کے اختلاف کے باوجود اس میں سب ایک آواز ہوں۔ اور اس آواز میں ایک ایسی طاقت پیدا ہو، کہ جو خیالات کے اختلافات پر غالب رہے۔ اسی کے لئے میں کوشاں ہوں۔ اور جی چاہتا ہے۔ کہ.......

س:۔ اطمینانِ قلب کس طرح حاصل ہوسکتا ہے۔؟

ج:۔ قرآن مجید کی رو سے تو اطمینان قلب کا ذریعہ صرف خدا کی یاد ہے۔ لیکن خدا کی یاد کس طرح ہو؟ اس کا کیا طریقہ ہو؟ کس طرح زندگی میں اس کو مؤثر بنایا جائے یہ ایک طویل بات ہے۔ پھر بھی قناعت کی زندگی اختیار کرنا، کسی سے کوئی توقع نہ رکھنا اور جس راستے اور طریقے کو صحیح سمجھیں اس پر دانائی، احتیاط اور حکمت عملی سے چلتے رہنا بھی اطمینانِ قلب کے ذریعے ہیں۔

س:۔ راقم الحروف کو کوئی نصیحت فرمائیں۔

ج:۔ بڑی باتوں کے لئے چھوٹی باتوں کو نظر انداز اور یہ سمجھنا کہ اصلاً ہماری زندگی

کے مقاصد مشترک ہیں۔ ان کے حصول کے لئے راستے کی دشواریوں کو حکمت عملی سے دور کرنا۔ اور سچ تو یہ ہے کہ سب سے بڑا معلم تو زمانہ ہے۔ اس کی جو گردشیں ہیں، لیل و نہار کی، وہی انسان کو صحیح راستہ دکھاتی ہیں ـــــ محاسبۂ نفس سب سے بڑی چیز ہے۔ اگر انسان اس کا پابند ہو جائے تو اس کی زندگی کی بہت سی مشکلیں دور ہو سکتی ہیں۔

ایک اور صحافتی مُذاکرہ

ایڈیٹر ماہنامہ شبستان دہلی کا انٹرویو جو جولائی ۱۹۷۹ء میں دفتر ندوۃ المصنفین میں لیا گیا۔

مفتی عتیق الرحمٰن صاحب نے لکھنؤ کے حالیہ شیعہ سُنّی فساد کے بارے میں میرے سوال کا جواب دیتے ہوئے کہا "تیرہ سو پُرانا اختلاف اتنی بھیانک کروٹ لے سکتا ہے یہ میرے وہم و گمان میں بھی نہ تھا۔ میں ابھی چند دن قبل ایک مصالحتی مشن لے کر لکھنؤ گیا تھا۔ میں نے وہاں شیعہ سُنّی فساد کی جو تفصیل سنی۔ اس نے میری آنکھوں میں آنسو چھلکا دیئے۔ میرے تصور میں بھی نہ تھا کہ ایک مسلمان ایک مسلمان کا گھر جلا سکتا ہے۔ مسلمان ہوتے ہوئے مسلمان عورت کا اغوا کر سکتا ہے۔ اور کلمہ گو ہو کر ایک کلمہ گو کا قتل کر سکتا ہے۔

مفتی صاحب نے مزید کہا "آپ مجھ سے پوچھتے ہیں کہ مجھے اس فساد میں سُنّی کا قصور نظر آیا یا شیعہ کا، اور میں کہتا ہوں کہ ظلم و زیادتی کا کوئی پیمانہ نہیں ہوتا ہے۔ لکھنؤ کے اس شرمناک فساد میں جس کا جو بس چلا وہ اس نے کیا، زیادتیاں دونوں نے کیں، دونوں درندے بن گئے، دونوں نے اپنا مذہب بھلا دیا۔ اور دونوں اسلام کو بھول گئے۔

میں نے وہاں جلی ہوئی مسجد بھی دیکھی اور جلا ہوا امام باڑہ بھی۔

انھوں نے غم و افسوس میں ڈوبی ہوئی آواز میں مزید کہا: "جہاں تک میں نے اندازہ لگایا ہے۔ اس فساد کی اصل جڑ الیکشن ہے۔ ۱۹۶۷ء کے عام انتخاب کے بعد سے برابر ایسی صورتیں پیدا ہوتی رہیں جس سے دونوں طبقوں میں دوری اور نفرت بڑھتی گئی۔ ورنہ جہاں تک سنی اور شیعہ عقائد کا تعلق ہے وہ سینکڑوں برس سے اختلافات کے باوجود باقی ہیں۔

انھوں نے کہا: "میرا اپنا خیال ہے کہ اس فساد کے جہاں اور افسوس ناک پہلو ہیں ان میں سب سے زیادہ خطرناک پہلو یہ ہے کہ جن سنگھ کو یہ کہنے کا موقع مل گیا کہ مسلمانوں کے دونوں گروہوں میں بھی فساد وہی صورت اختیار کر سکتا ہے، جو ہندو مسلم فساد میں ہوتا ہے اور میرے خیال میں مسلمانوں کو سبق دلانے کے لئے صرف یہی بات کافی ہے۔"

اپنے مصالحتی مشن کی سرگرمیوں کے بارے میں انھوں نے کہا: "ہم لوگوں نے دونوں طرف کے لیڈروں سے ملاقات کی اور اختلافات کی بنیادیں سمجھنے اور ان کو قریب لانے کی بڑی سخت کوشش کی۔ ہمیں اپنے مشن میں ایک بڑی حد تک کامیابی بھی ہوئی ہے۔ ہمارے اس وفد کے جانے سے جہاں اور فائدے ہوئے وہاں ایک بڑا فائدہ یہ بھی ہوا کہ عام مسلمان یہ سمجھنے لگے ہیں کہ چند اوپر کے انتہا پسند لوگوں کے علاوہ یہ فساد ان کے مفاد میں نہیں ہے ان مسلمانوں کی یہ دلی خواہش ہے۔ کہ ان کی زندگی معمول کے مطابق ہو جائے۔"

میرے ایک ضمنی سوال کے جواب میں انھوں نے مزید کہا: "میں گرفتار شدگان کی رہائی کی کوشش بھی کر رہا ہوں اور مجھے پوری امید ہے کہ اگلے ہفتے جب میں دوبارہ لکھنؤ جاؤں گا تو میرا مشن ایک بڑی حد تک کامیاب ہو جائے گا۔"

میں نے مفتی صاحب سے کہا: "اس فساد کی کچھ اور تفصیل بتائیے۔" انھوں نے بڑے درد بھرے لہجے میں کہا: "اور کچھ بتانے کی ہمت نہیں ہے — بس یہ دعا مانگیے کہ میرا مصالحتی مشن کامیاب ہو جائے۔"

مفتی صاحب نے میرے سوال کا جواب کچھ اس انداز سے دیا تھا کہ میں ان کے خلوص، ان کی نیک نیتی اور ان کے جذبۂ اسلام سے متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکا۔ میں نے نظریں گھما کر ان کے کمرے کا جائزہ لیا۔ اور یہ سوچا کہ واقعی عالم کی شان ہی نرالی ہوتی ہے۔ اس کی زندگی ہی سادہ نہیں ہوتی ہے اس کا ماحول بھی سادہ ہوتا ہے۔

اپنی داستانِ حیات کے بارے میں میرے چند سوالوں کے جواب میں انھوں نے کہا۔

"میں دیوبند میں پیدا ہوا تھا۔ اور میں نے وہیں تعلیم پائی ہے۔ میرے والد مفتی عزیز الرحمٰن (مرحوم) دارالعلوم دیوبند کے مفتیِ اعظم تھے۔ میں ہمیشہ سے قوم پرست رہا ہوں۔"

انھوں نے مزید کہا۔ "آج مسلم مجلسِ مشاورت کے ممبر کی حیثیت سے مجھ پر ملک کے بعض عناصر فرقہ پرستی کا الزام لگاتے ہیں لیکن وہ یہ بھول جاتے ہیں کہ ۱۹۴۷ء کے ہنگاموں میں جب قرول باغ دہلی میں میرا مکان جلا دیا گیا تھا، میرے ندوۃ المصنفین کی ساری کتابیں نذرِ آتش کر دی گئی تھیں۔ میرا لاکھوں روپے کا نقصان ہو گیا تھا۔ اور میں نے جامع مسجد کے ایک حجرے میں آکر پناہ لی تھی۔ اس وقت بھی میرے ذہن میں ایک لمحہ کے لئے بھی پاکستان جانے کا خیال نہیں آیا تھا، حالانکہ مجھے پاکستان آنے کے دعوت نامے مسلسل مل رہے تھے، اور ایک پُر سکون زندگی کا نقشہ میرے سامنے رکھا جا رہا تھا۔ میں یہاں بے سروسامانی کی حالت میں پڑا رہا مٹر کی روٹی کھاتا رہا لیکن میں نے ہندوستان نہیں چھوڑا۔ اور ہندوستان کی محبت ہمیشہ میرے مصائب پر حاوی رہی۔

میں نے چونکہ اپنے پہلے ہی سوال کے جواب میں مولانا کے دردِ ملّی کو محسوس کر لیا تھا اس لئے میں نے ان سے پوچھا۔ "مسلمانوں کے ایک طبقہ کا یہ خیال ہے کہ ہندوستانی مسلمانوں کی زبوں حالی کا سبب یہ ہے کہ ان کی خود اپنی کوئی سیاسی جماعت نہیں ہے۔ اس سلسلے میں خود آپ کی کیا رائے ہے۔؟ کیا ہندوستانی مسلمانوں کو واقعی ایک سیاسی جماعت کی ضرورت ہے۔؟"

انھوں نے میرے اس سوال کا جواب بڑی تفصیل سے دیا اور کہا " مجبوری یہ ہے کہ مشترکہ انتخاب کی موجودگی میں ایک علیحدہ جماعت بنانے سے مسلمانوں کو کوئی فائدہ نہیں پہنچ سکتا کیوں کہ سیاسی جماعت کا مطلب پارلیمانی سیاست میں حصہ لینا ہے۔ اور نئے حالات نے ملکی سیاست میں جو نیا نقشہ بنایا ہے۔ اس میں سیاسی جماعت بنا کر مسلمانوں کو کوئی مؤثر نمائندگی نہیں مل سکتی۔ کیوں کہ مسلمان بکھرے ہوئے ہیں اور یکجا نہیں ہیں۔"

انھوں نے مزید کہا " ایک دوسری مشکل یہ بھی ہے کہ جیسے ہی ہم نئی سیاسی جماعت کے قیام کے بارے میں سوچتے ہیں۔ ہمارا ذہن فوراً مسلم لیگ کی طرف چلا جاتا ہے کیونکہ مسلم لیگ ماضی میں ایک بڑی جماعت تھی اور آج بھی جنوبی ہند میں موجود ہے۔ کیفیت یہ ہے کہ دہلی، بہار اور یوپی میں مسلم لیگ کا نام آتے ہی ایک انتشار سا پیدا ہو جاتا ہے۔ اور اکثریت کو ماضی کے واقعات یاد آنے لگتے ہیں۔ چنانچہ یہی وجہ ہے کہ جنوبی ہندستان کے مسلم لیگی لیڈروں نے بھی شمالی ہندستان میں مسلم لیگ کا قیام غیر مفید سمجھا۔"

سلسلۂ کلام جاری رکھتے ہوئے مفتی صاحب نے کہا " میں مانتا ہوں کہ ہندستان میں مسلمانوں نے اپنی سیاسی جماعت بنائی بھی تھی لیکن علیحدہ سیاسی جماعت بنانے کے تجربے بہتر ثابت نہیں ہوئے۔ یوپی میں صوبائی سطح پر مسلم مجلس قائم کی گئی۔ اور اس کو آگے بڑھانے کی بڑی کوشش کی گئی۔ لیکن حالیہ انتخاب میں مسلم مجلس کے ٹکٹ پر صرف تین ممبر کامیاب ہو سکے۔

مفتی صاحب اتنا کہہ کر چند لمحات کے لئے خاموش ہو گئے۔ اور وقت چاروں طرف بہتا رہا۔ اچانک انھوں نے ایک بالکل نئی بات کہی۔ انھوں نے کہا " لیکن یہ ممکن ہے کہ کل جب ملک کے عوام کا سیاسی شعور بیدار ہو کر پختہ ہو جائے اور حالات سازگار ہو جائیں۔ تو مسلمان اپنی مناسب نمائندگی کے لئے اپنی نشستوں کے تحفظ کا مطالبہ کریں اور پھر یہ کہیں کہ جداگانہ انتخاب کا طریقہ رائج کیا جائے۔"

مفتی صاحب کے یہ جملے سن کر میں حیرت سے ان کی طرف دیکھ ہی رہا تھا۔ کہ

انھوں نے ایک تاریخی انکشاف بھی کیا ۔انھوں نے کہا "آزادی کے بعد جب نیا دستور بنایا جارہا تھا اور اچھوتوں کی نشستوں کا تحفظ کیا جارہا تھا ۔تو بعض مسلمان لیڈروں نے پنڈت جواہر لال نہرو کے سامنے یہ تجویز رکھی تھی کہ مسلمانوں کی نشستوں کا بھی تحفظ کر دیا جائے ۔کیونکہ مخلوط انتخاب میں مسلمانوں کو مناسب نمائندگی نہ مل سکے گی ۔اس تجویز کے جواب میں پنڈت نہرو نے کہا "یہ بات ٹھیک نہیں ہوگی ۔کیونکہ میں تو اس کی توقع کرتا ہوں کہ مخلوط انتخاب میں مسلمانوں کو اپنے تناسب سے زیادہ نشستیں مل جائیں گی "چنانچہ بات آئی گئی ہوگئی ۔

مفتی صاحب نے مزید کہا "لیکن اگر اس وقت مسلمان لیڈروں کی تجویز مان لی گئی ہوتی تو آج اسمبلیوں اور پارلیمنٹ میں ہماری کافی نمائندگی ہوتی جب کہ آج یہ حالت ہے ۔کہ صوبائی اسمبلیوں اور پارلیمنٹ میں ہمارے ممبروں کی تعداد روز بروز کم ہوتی جارہی ہے ۔راجستھان اور مدھیہ پردیش میں مسلمانوں کی کافی آبادی ہے ۔لیکن ان کی وہاں کی اسمبلیوں میں مناسب نمائندگی نہیں ہے ۔اور اس کا واحد سبب ہماری نشستوں کا عدم تحفظ ہے ۔"

میں نے پوچھا "کیا ہندوستانی مسلمانوں میں ایسا کوئی نڈر اور بے باک لیڈر ہے ،جو ہندوستانی مسلمانوں کی قیادت کرسکے ۔"انھوں نے جواب میں کہا "کبھی ایسا بھی ہوتا ہے کہ اگر قیادت کے لئے ایک آدمی نہیں ملتا ہے تو چند دماغ مل کر یہ کام کر لیتے ہیں ۔بشرطیکہ ان سب کا اندازِ فکر اور طریقۂ کار ایک ہو ۔ایسا ہوتا ہے تو کچھ مدت بعد لیڈر کی شخصیت خود بخود ابھر آتی ہے ۔میرے کہنے کا مطلب یہ ہے کہ اگر انفرادی قیادت ملنے میں دیر ہے تو اجتماعی قیادت مہیا ہوسکتی ہے ۔کیونکہ مجھے فی الحال مسلمانوں میں کوئی ایک لیڈر نظر نہیں آرہا ہے ۔البتہ لوگ میدان میں آرہے ہیں ۔جیسے مسٹر بدرالدین طیب جی ۔

میرا اگلا سوال تھا "کیا مسلمانوں کا مذہب اور سیاست الگ الگ ہے ۔"انھوں نے جواب میں کہا "ہم سمجھتے ہیں دینِ اسلام زندگی کے ہر شعبے پر حاوی ہے ۔اس لئے سیاست

بھی اس کے دائرہ کار اور دائرۂ عمل میں داخل ہے۔ دوسرے لفظوں میں یوں سمجھ لیجئے۔ کہ اسلام نے انفرادی زندگی کے اُصول بھی بتائے ہیں: ۔ اور اجتماعی زندگی کے بھی اس لئے قدرتی بات ہے کہ سیاست بھی اس کے دائرہ عمل میں آتی ہے لیکن وقتی سیاست کی تنگ نظری جسے آپ ڈپلومیسی کہہ سکتے ہیں۔ اس پر ہم اسلام کے اس اُصول کا اطلاق نہیں کر سکتے۔"

مفتی صاحب نے جواب دینے میں اتنی حق گوئی سے کام لیا تھا کہ مجھے ماضی کے وہ علمائے دین یاد آگئے۔ جنھوں نے پھانسیاں پائی تھیں، سرِ بازار کوڑے کھائے تھے۔ جیلوں میں اپنی زندگی گذاری تھی۔ لیکن حق گوئی اور بے باکی کے دامن کو ہاتھ سے نہیں چھوڑا تھا۔

اب میں نے ان سے پوچھا: "کیا مسلم مجلسِ مشاورت کا قیام ہندوستانی مسلمانوں کے مفاد میں ہے۔؟"

اور میرا یہ سوال سنکر پہلے وہ چونکے اور پھر ایک دبی دبی مسکراہٹ ان کے لبوں پر اس طرح پھیل گئی۔ جیسے بند کمرے میں سورج کی کرن کسی باریک سوراخ سے داخل ہو جائے۔

انہوں نے میرے سوال کے جواب میں کہا: "مسلم مجلسِ مشاورت جن مقاصد کی بنیاد پر عالم وجود میں آئی تھی وہ مقاصد نہایت اہم ہیں اور اس لحاظ سے اس مجلس کی ضرورت آج پہلے سے بھی زیادہ ہے۔ ان مقاصد کا خلاصہ یہ ہے کہ شکوہ و شکایت کے بجائے مسلمان اپنے اندر سے احساسِ کمتری دُور کریں، اور اپنی آواز کو مؤثر بنائیں، جان دار بنائیں اور اسلام و نیز مسلمانوں کے متعلق جو غلط فہمیاں پھیلی ہوئی ہیں، ان کو وسیع پیمانے پر دُور کرنے کی کوشش کریں۔ میں سمجھتا ہوں کہ اگر احتیاط کے ساتھ ان مقاصد کے لئے کام کیا جائے اور مسلم مجلس مشاورت صحیح معنوں میں ایک اجتماعی مشاورت کی تنظیم بن جائے تو اس کی حیات نصف مسلمانوں کے لئے بلکہ پورے ملک کے لئے مفید ہے۔ کیوں کہ مجھے یقین ہے کہ مشترک مسائل اور

مصائب کا حل مشترک غور و فکر کے بعد ہی نکل سکتا ہے۔

مسلم مجلسِ مشاورت کے بارے میں انھوں نے مزید کہا: "مجلسِ مشاورت کا نیا دستور آگیا ہے۔ اور اب اس کی نئی تنظیم کی جا رہی ہے۔"

مفتی صاحب نے چوں کہ اتحاد و اتفاق کی بات کی تھی۔ اس لئے میں نے ان سے پوچھا: "ہندستانی مسلمانوں کا مفاد اتحاد میں ہے۔ پھر جمعیۃ العلماء، جماعتِ اسلامی اور مجلس مشاورت متحد ہو کر مسلمانوں کی خدمت کیوں نہیں کرتیں۔ آخر اس اتحاد میں کیا رکاوٹ ہے۔؟"

انھوں نے جواب میں کہا: "اس اتحاد میں دو رکاوٹیں ہیں۔ ایک رکاوٹ وہ اندیشے اور توہمات ہیں۔ جن میں جماعتیں عام طور سے مبتلا ہو جاتی ہیں۔ اور اتحاد کی تجویز سامنے آتے ہی ان کو خود اپنا وجود خطرے میں نظر آنے لگتا ہے۔ دوسری رکاوٹ بڑی نازک ہے۔ اور وہ ہے مذہبی منافرت، جس کی بنیاد جماعت اسلامی کی تشکیل کے وقت پڑ چکی تھی۔ اور جو ابھی تک عوام کے ذہنوں میں باقی ہے۔" مفتی صاحب نے مزید کہا: "لیکن پھر بھی میری اپنی رائے میں وقت کی سب سے بڑی ضرورت یہ ہے کہ ان اندیشوں اور توہمات سے الگ ہو کر مشترک مفاد اور بڑے مقصد کے حصول کے لئے یہ سب جماعتیں ایک ہو جائیں۔"

اب میں نے ان سے ایک نیا سوال کیا۔ میں نے پوچھا: "آپ ہندوستانی وفود کے ساتھ کئی مرتبہ اسلامی ممالک کی سیاحت کر چکے ہیں۔ ہمیں بتائیے کہ وہاں کے عوام ہندستانی مسلمانوں کے بارے میں کیا رائے رکھتے ہیں۔؟"

مفتی صاحب نے جواب میں کہا: "میں پہلی مرتبہ ۱۹۴۹ء میں ایک وفد کے ساتھ حجاز گیا تھا۔ اس وقت میں نے یہ اندازہ لگایا تھا کہ پاکستان کے پروپیگنڈے سے وہاں کے لوگ اتنے متاثر ہیں کہ ان کو یہ سمجھانا ہی مشکل تھا کہ اب بھی ہندوستان میں کروڑوں مسلمان رہتے ہیں۔ اور ان کی مسجدیں آباد ہیں۔ دوسری مرتبہ میں ۱۹۶۵ء میں انڈونیشیا، ملیشا،

سعودی عرب، شام اور اردن گیا تھا۔ اس مرتبہ میں نے عوام کی رائے میں فرق پایا۔ البتہ یہ بڑی شدت کے ساتھ محسوس کیا کہ ہمارے ملک میں فرقہ وارانہ فسادات کا جو تسلسل ہے اس کا ان تمام ممالک کے عوام پر بڑا ناگوار اثر ہے۔ میں جب انڈونیشیا گیا تھا تو دراصل مجھے افریقہ اور ایشیائی اسلامی ممالک کی کانفرنس میں ہندوستانی وفد کے لیڈر کی حیثیت سے شرکت کرنا تھی جو بانڈونگ میں ہوئی۔ میں نے کانفرنس میں تقریر کی۔ اور ہندوستانی مسلمانوں کے بارے میں کہا۔

"میں مانتا ہوں کہ ہمارے کچھ مسائل ہیں، لیکن ہم ان مسائل کو خود ہی حل کرنے کی استطاعت رکھتے ہیں۔ اس لئے ہمارے معاملات میں دوسروں کو دخل دینے کی ضرورت نہیں ہے۔"

مفتی صاحب نے کہا "میری اس تقریر کا وہاں کے عوام پر کافی اثر پڑا۔ اور میری یہ تقریر کافی پسند کی گئی۔"

میں نے پوچھا "آپ روس بھی تو گئے تھے، وہاں کے مسلمانوں کا کیا حال ہے؟" انھوں نے جواب دیا "میں نے وہاں بوڑھی عمر کے مسلمانوں کو مذہبی پایا اور نئی نسل کو مذہب سے دور۔ میں نے وہاں یہ محسوس کیا کہ پورا ملک انقلاب کی زد میں ہے۔ میں نے وہاں یہ دیکھا کہ وہاں کسی قسم کی سیاسی آزادی نہیں ہے۔ البتہ ہر مذہب کے ماننے والوں کو آزادی حاصل ہے اور حکومت مذہبی معاملات میں کوئی مداخلت نہیں کرتی ہے۔" مفتی صاحب نے مزید کہا "میں نے ماسکو کی ایک مسجد میں جو بالکل نئی بنی ہے امامت بھی کی اور مسلمانوں کو نماز پڑھائی۔ میں نے لینن گراڈ کی ایک مسجد میں بھی جو ترکی کے سلطان عبدالحمید کی بنوائی ہوئی تھی روسی مسلمانوں کے ساتھ نماز پڑھی۔ میں نے روسی مساجد میں جمعہ کی نماز میں نمازیوں کا کافی اجتماع دیکھا اور پوچھنے پر مجھے یہ بتایا گیا کہ عید اور بقرعید کے موقعوں پر یہاں بہت ہی زیادہ مجمع ہوتا ہے۔" مفتی صاحب نے مزید کہا "روس میں اب پہلی سی پابندیاں نہیں رہی ہیں، اور آہنی پردہ ہٹ چکا ہے۔"

(دوسری و آخری قسط)

دسویں صدی ہجری کا باکمال محدّث

از: جناب شیخ فرید برہان پوری
(پروفیسر رابرٹسن کالج جبل پور)

پایۂ علم وفضل | شیخ کی ریاضت - زہد وتقویٰ - ظاہری اور باطنی علوم میں کمال کی وجہ سے مکہ معظمہ کے علماء وفضلاء اُن کے فضل وکمال کے معترف تھے۔

مفتیٔ حرم محترم ——— شیخ ابن حجر مکّی ——— ابتداءً ان کے استاد تھے اور آخر میں مرید بن کر خرقۂ خلافت ان سے حاصل کیا۔ اِن کی ذات سے اس مقدس مقام میں سینکڑوں طالبانِ علم کو فیض پہنچا۔ ان کی آغوشِ تربیت میں کئی ذرّے غیرتِ شمس و قمر ہو گئے۔ چند ہندی فضلاء اور خلفاء کے نام یہ ہیں

عبدالوہاب متقی۔ شاہ طاہر مُتنی۔ شیخ ابوجیو ہیمی۔ شیخ محمد فضل اللہ۔ حضرت مخدوم جیو قادری۔ شیخ عبداللہ۔ شیخ رحمت اللہ سندھی وغیرہ۔

طریقۂ درس وہدایت | طالب علموں کو رُشد وہدایت کا اِن کا طریقہ یہ تھا کہ طالب علم کو اُس کی ظاہری حالت پر چھوڑ دیتے تھے اور اس کے باطن کی طرف متوجہ ہو جاتے تھے۔ رفتہ رفتہ اس کے دل میں نور اور صفائی پیدا ہوتی اور وہ منزل تک پہنچ جاتا۔

شمس اللہ صاحب قادری نے تاریخ زبان اُردو میں لکھا ہے۔ کہ

"شیخ کے درس کا طریقہ یہ تھا۔ کہ آپ حرم میں تشریف رکھتے تھے۔ اور درس کے لئے طلباً جمع ہو جاتے اس کے بعد عربوں کو عربی میں۔ عجمیوں کو فارسی میں اور ہندیوں کو ہندی میں درس دیتے تھے۔" [1]

---

[1] تاریخ زبان اُردو ص ۲۹

شیخ کے طریقۂ درس کو ان کی وفات کے بعد ان کے شاگردِ رشید اور خلیفہ عبدالوہاب متقی نے جاری رکھا۔[۱] شیخ عبدالحق محدث دہلوی نے "زاد المتقین الی طریق سلوک الیقین" میں اس بات کی طرف اشارہ کیا ہے۔ تاریخ زبانِ اردو میں متعلقہ عبارت میں منقول ہے۔[۲]

تصانیف: فاضل اجل حضرت شیخ علی متقی کی عربی اور فارسی میں ایک سو سے زیادہ ادبی یادگاریں ہیں۔ ان سے اُن کے تبحرِ علمی اور پایۂ فضل و کمال کا اندازہ ہوتا ہے۔

حضرتِ موصوف کو علم کی ترویج و اشاعت کا بڑا شوق تھا۔ اس خاطر کتابیں لکھتے اور نقل کرواکے شائقینِ علم کی تشنگی کی تسکین کی خاطر دوسرے شہروں کو بھیجتے تھے۔

شیخ مکہ معظمہ میں ۹۵۷ھ / ۱۵۵۰ء سے ۹۷۱ھ / ۱۵۶۳ء تک کتبِ احادیث کی تصحیح و تقابل میں دن رات مصروف و مشغول رہا کرتے تھے۔ عبدالوہاب متقی تمام تصنیفات کی کتابت اور تصحیح کرتے رہتے تھے۔ ان کی کتابت کی مشق اس قدر بڑھ گئی تھی کہ حضرت شیخ کی ایک کتاب جس میں ۸ ہزار ابیات ہیں۔ بارہ راتوں میں نقل کرلیا۔

اُن کی تخلیقات میں سے چند کا ذکر سطور ذیل میں کیا جا رہا ہے۔ ان میں سے کچھ کتابوں کے خوش خط مخطوطات پیر محمد شاہ لائبریری احمد آباد میں محفوظ ہیں۔

(۱) عجالۃ المناسک فی انتخاب المناسک

فرائض۔ واجبات۔ محرمات۔ مکروہات۔ مباحات۔ سنن۔ مستحبات۔

حج و احرام کے بیان میں فارسی زبان میں ایک رسالہ مبتدیوں کے لئے ہے۔ حضرت رحمت اللہ بن قاضی عبداللہ سندھی کی لباب المناسک سے ماخوذ ہے۔

حمد و نعت کے بعد لکھا ہے۔

"می گوید احقر العباد اللہ علی ابن حسام الدین الشہیر بالمتقی کہ ایں رسالہ ایست در بیان فرائض و واجبات و محرمات و مکروہات و مباحات و سنن و مستحباتِ حج و احرام از کتاب لباب المناسک

---

[۱] نقوشِ سلیمانی ص ۵۶ [۲] تاریخ زبانِ اردو ص ۲۹

از تصنیفات حضرت رحمت اللہ بن قاضی عبد اللہ سندھی بزبانِ پارسی برائے مبتدیاں
انتخاب کردہ و نام وے "عجالۃ الناسک فی انتخاب المناسک" نہادہ شد"

(۲) البرہان :- ـــــ علامہ سیوطی نے امام مہدی آخرالزماں کے حالات میں "کتاب المعروف الوردی فی اخبار المہدی" تالیف کی اس کتاب میں ابواب وغیرہ کی ترتیب نہ تھی۔ علی متقی نے اس کو دوبارہ ترتیب دیا۔ اور اس میں جا بجا احادیث کے اضافے کئے۔ یہ احادیث جمع الجوامع اور عقدالدرر فی اخبار المختصر سے لی گئی ہیں۔
کتاب کا سنہ تصنیف سنہ ۹۲۴ھ / ۱۵۱۸ء ہے۔ ۱۰۷ صفحات پر مشتمل پاکیزہ نسخہ احمد آباد میں ہے۔

(۳) تبیین الطرق :- ـــــ علم تصوف پر یہ شیخ کی پہلی تصنیف ہے۔ منقول ہے کہ اس کتاب کی تصنیف کے لئے ان کو غیب سے الہام ہوا تھا۔ "تنویر الافق" کے نام سے اس کتاب کی شرح بھی شائع ہو چکی ہے۔

(۴) مجموعہ حکم کبیر :- ـــــ تصوف کی یہ دوسری کتاب ہے۔ اس میں تمام مشہور کتب تصوف کا خلاصہ ہے۔ اس کے متعلق شیخ متقی کا کہنا تھا کہ اس میں تصوف کے ہر مشکل مسئلہ کا حل ہے۔

(۵) شرح رسالہ اصول الطریق :- ـــــ شیخ احمد برزدق کی اصول الطریق کی شرح ہے

(۶) رسالہ وصایا :- ـــــ بمبئی سے شائع ہو چکی ہے۔ نایاب ہے۔

(۷) وسیلۃ الفاخرہ فی سلطنت الدنیا والآخرۃ :- ـــــ ۱۴ صفحات کا مختصر رسالہ ہے۔

(۸) الطب النبام لجمیع الاسقام :- ـــــ طب میں تصنیف ہے۔

(۹) رسالہ محتوی :- ـــــ دو ہزار احادیث پر مشتمل ایک رسالہ ہے۔

(۱۰) کنز العمال اور منہج العمال :- ـــــ کنز العمال شیخ کی علمی کوششوں کا شاہکار ہے۔
مکہ معظمہ میں ۹۵۷ھ / ۱۵۵۰ء سے ۹۷۱ھ / ۱۵۶۳ء تک وہ احادیث کی دائرۃ المعارف کی ترتیب و تدوین

میں مصروف رہے۔

شیخ نے سیوطی کی کتاب جمع الجوامع کو از سرِ نو ترتیب دی۔ اس کے ابواب قائم کئے۔ اور کنز العمال نام رکھا۔ دوبارہ کنز العمال سے مکرر احادیث کو علیحدہ کر کے عمدہ طریقہ پر ان کی ترتیب دی اور اس کا نام منہج العمال رکھا۔

ان کتابوں نے سیوطی کے مجموعوں پر خطِ نسخ پھیر دیا ان دونوں تصنیفات کو دیکھ کر شیخ ابوالحسن بکری نے کہا تھا۔

للسیوطی منۃ علی العالمین	سیوطی کا احسان تمام عالم پر ہے اور علی متقی کا
وللمتقی علی السیوطی	احسان سیوطی پر ہے۔

(۱۱) رسالہ التوکل فی الیقین والتوکل: ــــــ "کتاب التنویر فی اسقاط التدبیر" ابوالفضل تاج الدین احمد بن محمد بن عبدالکریم ابن عطاء اللہ اسکندری کی تصنیف ہے۔ علی متقی نے آخری دو فصلوں کا ترجمہ کر کے رسالہ التوکل فی الیقین والتوکل نام رکھا۔

ایک ۲۳ سطری ۵ x ۹ تقطیع کا آٹھ اوراق کا قلمی نسخہ احمد آباد کے پیر محمد شاہ کتب خانہ میں محفوظ ہے۔

مقدمہ کی عبارت درج ذیل ہے:۔

"علی بن حسام الدین چوں کتاب نام .... تالیفِ امام محقق ابی الفضل تاج الدین احمد بن محمد بن عبدالکریم بن عطاء اللہ اسکندری رضی اللہ واقف شد۔ بخاطر آمد کہ دو فصل آخر ترجمہ بپارسی کردہ شود فائدہ عام وخاص را باشد وایں را نام "رسالہ التوکل فی الیقین والتوکل نہادہ شد"

کتاب تنویر کا ایک قلمی نسخہ حضرت سید محمد مطیع اللہ صاحب راشد برہان پوری (مقیم کراچی) کے نادر کتب خانے کی زینت ہے موصوف نے اپنی خرابیٔ صحت اور گوناگوں مصروفیات کے باوجود از رہِ بندہ نوازی رسالہ مذکور کے متعلق جو تحریر کیا ہے۔ بجنسہٖ نقل ہے:۔

"تمہید یہ ہے

میگوید احقر عباد اللہ علی بن حسام الدین کہ مشہور است بمتقی کہ مشائخ رضی اللہ عنہم اتفاق کردہ اند کہ مرید راہیچ مانعی بطلب حق چنانچہ غم رزق است نیست۔ چوں ایں مانع از مرید دور شود و توکل بر خدائے تعالیٰ حاصل شد۔ بقوت توکل بر فضیلت دینی و دنیوی کہ خواہد بسہولت حاصل تواند کرد پس بنا بریں مضمون دہ فصل آخریں از کتاب تنویر کہ تصنیف ابن عطاء اللہ اسکندری است فارسی کردہ شود و خاتمہ مناسب رسالہ زیادہ کردہ شد تا فائدہ خاص و عام را باشد و ایں رسالہ را . . . . نام نہادہ آمد۔

چھوٹی تقطیع کے ۲۰ اوراق ہیں۔ اس رباعی پر خاتمہ ہے۔

شش بود انکار تحصیل توکل اے عزیز   علم و قدرت۔ نفی عجز و سہو نقص خلق ہیں
یگذ داں برخاطرت چنداں کہ مستولی شوند   نیک آساں باشد ایں برخاطر طبع گزیں

" خاتمہ بالخیر"

ترقیمہ اس کے سوا کچھ نہیں اور اس کے آگے

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم ۔ از فضیلت مہتر آدم صلوٰۃ اللہ علیہ در بیان سورۃ مائدہ ساعتے بود از یک جانب آوازے شنیدند۔ پیغمبر خدا مرا دستوری دہ تا درآیم ۔ بعدہٗ حضرت رسالت فرمودند۔ یاراں من شما میدانید کہ ایں آواز آں کیست ۔ یاراں گفتند مانمی دانیم گفت اے یاراں ایں آواز ابلیس لعین است ۔

حضرت عمر اور حضرت علی رضی اللہ عنہما نے عرض کی اجازت ہو تو ہم اس کو ہلاک کریں ۔ فرمایا خدائے تعالیٰ نے اس کو مہلت دے رکھی ہے ۔

بہر حال اس کو باریاب ہونے دیا گیا ۔ پھر شیطان کا حلیہ ہے اور اس کا مکالمہ آں حضرت صلعم سے ۔ لب لباب یہ ہے کہ حضور نے ابلیس سے تمام تلبیسات کا دریافت کیا کہ تو انسانوں کو کیسے ورغلاتا ہے ۔ کس کو پسند کرتا ہے اور کس کو ناپسند کرتا ہے ۔ تو کس

چیز سے خوش ہوتا ہے۔ کس سے ناخوش۔ تیرا مقام کہاں ہے وغیرہ وغیرہ۔

یہ رسالہ بھی ۱۴ اوراق میں ختم ہوا ہے۔ اس پر ترقیمہ یہ ہے۔

تمت تمام شد۔ کار من نظام شد۔ کاتب الحروف بندۂ درگاہ شیخ امان اللہ والد شیخ جمال محمد ابن شیخ محمود قوم شیخ زادہ قریشی ساکن اکبر آباد بوقت یک پہر روز برآمدہ روز جمعہ بتاریخ بست ودوم محرم الحرام سنہ ۴۲ جلوس والا تمام شد۔ فرد۔

ہر کہ خواند دعا طمع دارم   زانکہ من بندۂ گنہ گارم

یا یہ کوئی جداگانہ رسالہ ہے یا پھر اول الذکر ترجمۂ تنویر کا خاتمہ ہے۔ جس کو موصوف نے تمہید میں وعدہ فرمایا تھا۔ واللہ اعلم بالصواب۔

لیکن مذکورہ ہر دو رسائل سے قبل ایک اور رسالہ اسی ترکیب اسی انداز بیان میں اسی موضوع پر منسلک ہے۔ جس کا آغاز نہیں۔

خاتمہ پر صرف اس قدر تحریر ہے

تمت تمام شد کار من نظام شد

فرد

ہر کہ خواند دعا طمع دارم   زانکہ من بندۂ گنہ گارم

اس رسالہ کے ۱۴ اوراق ہیں اور اس میں حضرت موسیٰ علیہ السلام کے اللہ تعالیٰ سے مختلف سوالات اور بارگاہِ الٰہی سے ان کے جوابات ہیں۔ اور نتیجۃً حضرت محمد مصطفےٰ صلی اللہ علیہ وسلم کی فضیلت ثابت ہے۔

یہ پورا مجموعہ ایک ہی کاتب نے یکساں طور پر لکھا ہے۔

رسائل علی متقی

اس تحریر سے تو یہ ثابت ہوتا ہے کہ تینوں رسالے حضرت شیخ علی متقی کے ہیں۔

واللہ اعلم بالصواب

قسط ۱

فلسطین کی ممتاز شاعرہ: فدویٰ طوقان

حقانی القاسمی، نئی دہلی

فدویٰ طوقان ۱۹۱۷ء میں نابلس کے ایک ممتاز علمی خانوادے میں پیدا ہوئیں مدرسہ میں داخل ہونے کے بعد صرف کتاب اور معلمہ سے اپنا رشتہ رکھا۔ کتابیں بہت ہی ذوق، شوق اور لگن کے ساتھ پڑھنے کی عادی تھیں۔ ذہانت اور ادبی ذکاوت کی وجہ سے ان پر استانی کی خاص توجہ تھی گھر اور مدرسے دونوں ہی جگہوں میں انہیں ہمہ وقت علم اور معرفت کی پیاس رہتی تھی۔ اس لئے اعلیٰ تعلیم کے حصول کا شوق دل میں موجزن تھا۔ مگر نابلس میں لڑکیوں کے تعلیمی ادارے سماجی رسوم وقیود کی زنجیروں میں بندھے ہوئے تھے جس کی وجہ سے اعلیٰ تعلیم کے حصول سے لڑکیاں محروم تھیں، یہ صورتحال فدویٰ جیسی تخلیقی مزاج رکھنے والی لڑکی کے لئے انتہائی ناخوشگوار تھی، اس لئے انسانی آزادی کی معاندفضا اور سماجی جبر کے خلاف باغیانہ جذبہ اندرونی طور پر فدویٰ کے دل میں پیدا ہونے لگا جس کا بے باکانہ اظہار بعد میں انہوں نے کیا۔ اُس دوران اگر کتابوں سے لگاؤ نہ ہوتا تو شاید سماجی گھٹن سے مرجاتیں [1]

---

[1] وداد سکاکینی، نساء شہیرات فی الشرق والغرب (القاہرہ ۱۹۵۰ء) ص ۷۵، ۷۶۔

فدوی کے دل میں شعر کہنے کا جذبہ اس طرح بیدار ہوا کہ انہوں نے خورد عمری سے اپنے بھائی ابراہیم طوفان کو شعر و ادب کی دلچسپ سرگرمیوں میں منہمک پایا تو دل میں شعر کہنے کی خواہش کروٹ لینے لگی۔ چنانچہ اپنے بھائی سے مشورۂ سخن کی آرزو مند ہوئیں۔ اور پابندیوں کے باوجود ابراہیم نے ان کی شعری تربیت پر توجہ کی اور فدوی نے فن کو خوب صورتی اور آزادی کی خاطر اپنی خواہشات کا اظہار شروع کر دیا، ماحول کی جبریت اور پابندیوں کے تعلق سے اپنی ڈائری اور عہد طفل کی کیفیات فدوی نے یوں درج کی ہیں:

" اس (اجنبی دوست) نے میری زندگی اور لڑکپن کے زمانے کے حالات دریافت کئے تو میں نے اسے بتایا کہ کیسی کڑی پابندیاں تھیں جن میں میں نے اپنی زندگی کے وہ دن گذارے تھے، اور کیسے میری نسوانیت قفس میں بند ایک زخمی پرندے کی طرح پھڑپھڑاتی اور کراہتی تھی، اور نجات کی کوئی صورت نظر نہ پڑتی تھی گھر میں ہر چیز کی ممانعت تھی، ہنسنا، گانا اور عود بجانا جو میرا پسندیدہ مشغلہ تھا اور میں نے چوری چھپے سیکھا تھا، یہ سب باتیں ممنوع تھیں۔ میں ان دنوں ایک ایسے جوان رعنا کے خواب دیکھا کرتی جس سے میں رشتۂ محبت استوار کر سکوں۔ مجھے اپنی ہم جنس لڑکیوں کی صحبت میں کبھی لطف نہ آتا اور نہ میں کبھی خواہش کرتی میرا اجنبی دوست ہنسے بغیر نہ رہ سکا جب میں نے اسے یہ واقعہ سنایا کہ کیسے میرے والد باوجود گھر میں اتنی بندشوں، تنگیوں اور پابندیوں کے مجھے ترغیب دیتے کہ میں بھی اپنے بھائی ابراہیم کی طرح سیاسی اور قومی موضوعات پر شعر کہا کروں، چنانچہ جب بھی کوئی قومی یا سیاسی واقعہ رونما ہوتا، میرے والد مجھ سے نظم لکھنے کی فرمائش کرتے، اور میں اپنے نفس کی گہرائیوں سے ان کے اس مطالبے پر احتجاج کرتی اور اس کے خلاف بغاوت پر آمادہ ہو جاتی، وہ کیسے مجھ سے

یہ امید رکھتے ہیں، میں اپنے آپ سے کہتی، کہ سیاسی شاعری کروں جبکہ میں چہار دیواری میں مقید ہوں۔ میں ایسی شاعری کا مواد کہاں سے لاؤں؟ کیا محض اخباروں اور رسالوں کے مطالعے سے؟ اخباروں اور رسالوں کا مطالعہ اپنی جگہ اہم ہی لیکن اس سے شعر کی چنگاری تو نہیں بھڑک سکتی۔ ایک شاعر اپنے ارد گرد کی زندگی اور دنیا کے بارے میں لکھ ہی کیا سکتا ہے جب تک اسے ان چیزوں کا براہ راست علم نہ ہو؟ ——— میں اس کے برعکس دیواروں اور روایتوں کی قید میں ہوں۔ نہ میں مردانہ مجلسوں میں جا سکتی ہوں، نہ سنجیدہ قسم کی بحثیں سن سکتی ہوں اور نہ زندگی کی تگ و تاز میں حصہ لے سکتی ہوں، پھر کیسے ابو مجھ سے یہ امید رکھتے ہیں کہ میں ایک ایسے موضوع کے بارے میں لکھوں گی جسے میں اپنی اس عمر میں پوری طرح سمجھ بھی نہیں سکتی اور جسے میرے اندر برپا ہونے والی نفسیاتی ہلچل سے کوئی سروکار نہیں ہے۔ میری نفسیاتی زندگی کا دھارا اس دھارے سے بالکل مختلف تھا جس کے ساتھ بہنے کے لئے میرے والد مجھ سے کہتے تھے۔ اس طرح مجھے سیاست سے متنفر ہونے کا عارضہ لاحق ہو گیا اور کئی برس تک میری سیاسی حس ماؤف رہی ۲ ؎

فدوی کو اپنی زندگی میں تین چیزیں بہت پسند تھیں جس کے گہرے اثرات ان کی شاعری پر پڑے ہیں۔ "ڈائری" میں اس پر یوں روشنی ڈالتی ہیں:

"میرے نزدیک زندگی تین عناصر سے مرکب ہے محبت، کتابیں، اور سفر، میری نفسیاتی ترکیب اس تثلیث کے عین مطابق ہے۔ میں نے ان میں پہلی چیز کا تجربہ کیا ہے اور انتہائی گہرائی میں جا کر" رہی دوسری چیز تو وہ میری

---

۲ ؎ محمد کاظم، مضامین (لاہور، ۱۳۹۹ھ) ص ۱۶۳، ۱۶۴۔

زندگی کا جز ولازم ہے۔ اور تیسری چیز سفر سے بھی مجھے بہرہ وافر ملا ہے مجھے
سیرو تفریح سے جو کچھ حاصل ہوتا ہے وہ یہ کہ میرے اندر ہر اس چیز کے لئے جو
انسان سے تعلق رکھتی ہو، ایک دلچسپی اور آمادگی پیدا ہوتی ہے۔ سفر میرے
اندر ایک انبساط پیدا کرتا ہے۔ میں اپنے آپ کو آزاد اور خود مختار محسوس
کرتی ہوں اور مجھ میں اس زندگی کو شدت اور سرگرمی کے ساتھ بسر کرنے کی
خواہش پیدا ہوتی ہے۔" ۳ے

فدوی کو ادب سے گہری دلچسپی تھی ان کا خیال ہے کہ" ادب ہی ہے جو کسی قوم
کو اس کے مستقبل کے خواب دکھلاتا اور انکی صورت گری کرتا ہے ادب ہی کے
بدولت ہم اپنے شعور کی سطح پر بیدار ہوتے ہیں اور ایک آزاد، باعزت زندگی
کی خاطر ٹکر لینے پر کمر بستہ ہو جاتے ہیں۔ ادب و فن ہی سے ہمارے اندر جذبہ
افتخار جاگتا ہے۔ ہمارے عزائم بلند ہوتے ہیں۔ اور افراد قوم کا مورل ترقی کرتا ہے" ۴ے
اسی وجہ سے فدوی نے نہ صرف عربی ادب کا مطالعہ کیا تھا بلکہ عالمی ادبیات
پر خصوصی نگاہ رکھتی تھیں، انھوں نے جہاں سلامہ موسٰی (۱۸۸۷ - ۱۹۵۸) عباس
محمود العقاد (۱۸۸۹ - ۱۹۶۴) اور عبد القادر المازنی (۱۸۹۰ - ۱۹۴۹) کی تحریریں
خصوصی طور پر پڑھیں۔ وہیں علم نفسیات اور ناول سے بھی اپنے ذہنی افق کو وسعت
دینے کی کوشش کی۔ اور اعلیٰ سطح کے مغربی ناول نگاروں میں سے ٹالسٹائے
(L. TOLSTOY) دوستوویسکی (FYODOR DOSTOYEVSKEY) میکسے

۳ے محمد کاظم، مضامین (لاہور، ۱۳۹۹ھ) ص ۱۵۷۔
۴ے " " " " ۱۵۳۔

(HUXLEY) ڈی۔ایچ۔لارنس (D.H.LAWRANCE) گراہام گرین
(GRAHAM GREEN) سمرسٹ مام (   )
ارنسٹ ہنگوے (EARNEST HEMINGWAY) ولیم فاکنر
(WILLIAM FAULKNER) مارسیل پروسٹ (MARCELPROUST)
کو بھی پڑھا جس میں انہیں انسانی علم کا مجموعہ نظر آیا فکر وشعر، فلسفہ، تحلیل نفس
جیسی چیزیں بن نظر آئیں۔ اور جن کی تحریروں میں دنیا زندگی اور حرکت سے بھرپور
محسوس ہوئی۔[۵] اور نہ صرف ادبی بلکہ تاریخی، معاشرتی فلسفیانہ اور دیگر
علوم سے متعلق کتابیں پڑھیں۔ اور چہار دیواری میں مقید فدوی کے ذہنی دریچے
کھل گئے اور نئے فکری اور فلسفیانہ رجحانات سے آشنائی ہوئی، ابو العلا معری
اور عمر خیام کے ذریعے مجہولات کو جاننے کا شوق پیدا ہوا، اور خاص طور پر جسم سے
روح کی حرکت سے تعلق سے معری سے خاص دلچسپی ہوئی۔ اور خیام کی طرح ان کے دل میں
یہ خواہش پیدا ہوئی کہ ان کی قبر پر زیتون کے درخت اگیں اور پھول اور بیلیں پھوٹ
نکلیں[۶]

ایک زمانے تک فدوی نے خود کو سیاست سے دور رکھا۔ اور خود کو اپنی ذات
میں مقید کر لیا مگر فلسطین کی آزاد پسند خواتین (یاسمین زہران، لبیبہ صلاح
بشریٰ صلاح، سبا عرفات، اور عفاف جو امریکی اور برطانوی جامعات سے فارغ
التحصیل تھیں) کی ادبی صحبت اور معیت میں رہیں۔ اور جمیل البدیری، کمال ناصر

(جاری) (باقی صنہ ۲۰ پر)

[۵] فدوی طوقان: "صراعی فی الحیاۃ بین حبی للناس وخوفی منہم" مجلہ "الدوحہ" (مالو ۱۹۸۶ء)

[۶] دیکھئے: محمد کاظم، مضامین (لاہور ۱۳۹۹ھ) ص ۱۵۷ ۔

ہندوستان کی آزادی۔ کچھ ذمہ دار اسباب

مختار احمد مکی۔ ریڈر و صدر شعبۂ سیاسیات کریم سٹی کالج جمشید پور بہار

۱۵ اگست ۱۹۴۷ء کو ہندوستان انتقال اقتدار کا عمل مکمل ہوا اور ہندوستان و پاکستان آزاد ہوئے لیکن یہ آزادی اور تقسیم ہند کا معاملہ اس وقت بھی کافی مہنگا پڑا تھا جبکہ لیونارڈ موسلے کے مطابق صرف پنجاب میں ۶ لاکھ افراد مارے گئے ایک کروڑ ۴۰ لاکھ افراد پناہ گزیں بنے اور تقریباً ایک لاکھ عورتیں اغوا کی گئیں اور زبردستی ان کے مذہب کو تبدیل کروایا گیا (۱) برطانیہ نے اس سے قبل امریکہ کو بھی آزاد کیا تھا لیکن ان دونوں کی آزادی میں فرق ہے امریکہ میں آزادی کی جنگ باضابطہ ہتھیار کے ذریعہ لڑی گئی تھی جبکہ ہندوستان میں یہ جنگ عدم تشدد اور ستیہ گرہ کے ذریعہ لڑی گئی ہندوستان نے اس وقت کے چینی سفیر CHIALU ENT نے ایک پیاری سی نظم اس وقت لکھی تھی کہ ہندوستان آزاد ہو جائے گا یہ خام خیال ہی ہمالیائی خواب تھا جس طرح مشرق و مغرب کا مل جانا ایک معجزہ کہلائے گا۔ اس طرح تاریخ میں اس سے قبل ایسا کبھی نہیں ہوا کہ بغیر جنگ لڑے ہوئے آزادی مل جائے۔ (۲)

ہماری یہ آزادی ہماری مسلسل جدوجہد کا نتیجہ ہے یا اس زمانے کے حالات کے

مجبور ہو کر انگریز ہندوستان چھوڑ کر چلے گئے اس کو لیکر ماہرین دو گروپ میں بٹے ہوئے ہیں ایک خیمہ کا دعویٰ ہے کہ ہندوستانی آزادی مکمل طور پر ہندوستانی قومیت کی فتح ہے کیونکہ برطانیہ نے عرصہ تک ملایا اور بھاکے اپنا تسلط بنائے رکھا جبکہ دوسرے خیمہ کا کہنا ہے کہ یہ انگریزوں کی شرافت تھی کہ اس نے ہندوستان کو آزاد کر دیا اگر خدانخواستہ برطانیہ کے علاوہ ہندوستان کسی دوسرے قوم یا ملک کے قبضہ میں ہوتا تو اتنی آسانی سے آزادی حاصل نہیں ہوتی فرانس نے الجیریا پر بلجیم نے کانگو پر اور پرتگال نے خود گوا کو کافی عرصہ تک اپنے قبضہ میں رکھا ان دونوں نقطۂ نظر میں سچائی ہے۔ ڈاکٹر راجندر پرشاد کے لفظوں میں ہماری آزادی جہاں ہماری قربانیوں کا ثمرہ ہے وہیں دنیا کے حالات اور انگریزوں کے تاریخی روایات اور جمہوری آدرشوں میں یقین کا بھی نتیجہ ہے اسٹاک ہوم (Dee B) کے خیال میں ۱۹۴۷ء میں ہندوستان کی آزادی کئی اسباب کا نتیجہ ہے جس میں سب سے اہم دو عالمی جنگ کے نتیجہ میں برطانیہ کی قوت اور عزت میں کمی آنا شامل ہے لیکن لیڈر کی قیادت نے ایک منظم سیاسی تنظیم کی موجودگی نے اقتدار کی منتقلی کے عمل کو قدرے آسان بنا دیا۔ (۳)

آزادیٔ ہند کے سلسلہ میں جو اسباب رہے ہیں وہ مندرجہ ذیل ہیں:

ہندوستانی قومی تحریک کی قوت:- آزادی کے حصول کے سلسلہ میں سب سے اہم وجہ ہندوستانیوں کے ذریعہ شروع کی گئی قومی تحریک تھی دوسری جنگ عظیم کے بعد قومیت کی یہ تحریک اپنے نقطۂ عروج پر تھی ۱۹۴۲ء کا ہندوستان چھوڑو تحریک ایک واضح لفظوں میں انگریز ہندوستان چھوڑو کی وارننگ ہی تھی

اور اس تحریک نے گاندھی جی کی زبان سے کرو یا مرو Do or Die کا جو منتر دیا تھا آزاد ہند فوج کے ذمہ داروں پر لال قلعہ میں جو مقدمہ چلا اور بحری افواج میں جو بغاوت کے آثار نمودار ہوئے وہ قومی بیداری کی ہی علامت تھی برطانوی سیاستداں جو اپنی دور اندیشی کے لئے مشہور ہیں انہیں قبل از وقت ہندوستان کو باعزت طور پر آزاد کر دینے میں اپنی بہتری دیکھائی دی۔ مولانا آزاد کے لفظوں میں آزادی کی خواہش کے سلسلہ میں اب کوئی بھی بات خفیہ نہیں تھی دفاعی افواج کے افسران اور فوجیوں نے یہ بات پوری طرح واضح کر دی تھی کہ انہوں نے اپنا خون صرف اس امید اور یقین پر بہایا ہے کہ جنگ کے بعد ہندوستان کو آزاد کر دیا جائے گا اور اب اس یقین کو عملی جامہ پہنایا جانا چاہیئے۔ (۴)

جنگ کے خاتمہ پر برطانیہ کی خستہ حالت۔ پہلی جنگ عظیم سے قبل برطانیہ انتہائی طاقتور ملک تھا ملکہ معظمہ کی حکومت اس طرح خطہ زمین پر پھیلی ہوئی تھی کہ اس میں سورج غروب نہیں ہوتا تھا لیکن ان دو عالمی جنگ نے برطانیہ کو انتہائی کمزور کر دیا خاص طور پر دوسری جنگ عظیم کے بعد اس کے اقتصادی نظام درہم برہم ہو کر رہ گئے اور برطانیہ اس حالت میں نہیں تھا کہ ہندوستان پر قبضہ بنائے رکھنے کے خرچ کو مزید برداشت کر سکے مائیکل بریچر (جو نہرو کے سوانح نگار بھی ہیں) کے لفظوں میں برطانیہ کی کمزور حیثیت ہندوستان کے لئے اس حد تک موافق تھی کہ اگر ۱۹۴۵ء میں کنزرویٹو پارٹی بھی برسر اقتدار آجاتی تو وہ بھی ہندوستان کو آزاد کر دیتی۔ (۵) ہندوستان کے پہلے صدر ڈاکٹر راجندر پرشاد کا بھی یہی خیال ہے کہ برطانیہ کو جنگ میں بے انتہا نقصان اٹھانا پڑا تھا۔ گرچہ برطانیہ اس کے باوجود ایک عظیم قوت تھا لیکن اب وہ بے انتہا طاقتور نہیں تھا اور اسے

ہندوستان پر اپنا قبضہ بنائے رکھنا دشوار ہوتا چلا جارہا تھا برطانیہ کو اس کا احساس تھا اور جنگ کے خاتمہ سے قبل ہی ہندوستان کی آزادی کے کٹر مخالف وزیر اعظم چرچل نے وائسرائے لارڈ ویول کو اس ہدایت کے ساتھ روانہ کیا تھا کہ کانگریس سے سمجھوتہ کی کوشش کی جانی چاہیئے۔

ایشیا میں بیداری کی نئی لہر: بیسویں صدی میں ایشیا اپنی گہری نیند سے جاگ اٹھا تھا اسے اس بات کا احساس تھا کہ مغربی ممالک نے انہیں دھوکہ دے کر انکا کافی استحصال کیا ہے ان میں آزادی کی خواہش تھی اور اسی وجہ سے ان تمام ممالک میں آزادی کے لئے جدوجہد شروع ہو چکی تھی ہندوستان ان ممالک میں سر فہرست تھا انگریزوں کو اس کا احساس تھا کہ انھیں زیادہ دنوں تک کنٹرول میں نہیں رکھا اور ہندوستان کی آزادی ایشیائی ممالک کے لئے خوشی کا ایک موقعہ تھا

برطانیہ میں ہندوستان کے لئے رائے عامہ: دوسری جنگ عظیم کے قبل سے ہی برطانیہ کی رائے عامہ میں ہندوستانیوں کے لئے نرم گوشہ پیدا ہو رہا تھا اور یہ بات ۱۹۳۵ء کے ایکٹ کے کامیاب نفاذ سے واضح تھی پہلی اور دوسری عالمی جنگ میں جس طرح ہندوستانیوں نے برطانیہ کی مدد کی تھی اس سے ایک دوستی کا آغاز ہو چکا تھا اور برطانوی معاشرہ کا ایک بااثر طبقہ یہ محسوس کر رہا تھا کہ ہندوستان پر کنٹرول بنائے رکھنے کی کوئی خاص بنیاد نہیں ہے ۱۹۴۵ء میں لیبر پارٹی کی کامیابی کی ایک خاص وجہ ہندوستانیوں سے اس کی ہمدردی تھی۔

کمیونزم کا خواب: ۱۹۴۵ء اور ۱۹۴۶ء کے درمیان ہندوستانی کسانوں اور مزدوروں نے اپنے مفادات کی حفاظت کے لئے باضابطہ جدوجہد شروع کردی تھی برطانیہ کو اس بات کا خوف تھا کہ اگر کانگریس کا خاتمہ ہوتا ہے تو اس کی جگہ کمیونزم نہ

...نے کیمونزم کے

...کی اور بین الاقوامی

...کی کوئی غلطی نہیں کرنا چاہتا تھا

میدان میں بر...

دسمبر ۱۹۴۲ء میں وزیر اعظم اٹلی نے لارڈ ماؤنٹ بیٹن سے کہا تھا کہ کانگریس اور مسلم لیگ کو متاثر کرنے والی سیاسی حرکات سے حکومت انتہائی ناراض تھی اور اگر ہم نے کچھ ہوشیاری نہیں برتی تو ہم ہندوستان میں نہ صرف سول وار کو بڑھاوا دیں گے بلکہ کیمونزم کے حوصلہ افزائی کا باعث ہونگیں اس سے ان تمام سرگرمیوں کو بڑھاوا دینے کے لئے فوری کارروائی ضروری ہے۔

برطانیہ پر بیرونی دباؤ: ۱۹۴۷ء میں ہندوستان کی آزادی کی ایک ... وجہ برطانیہ پر بین الاقوامی خاص طور پر امریکی اور چینی دباؤ تھا جنگ کے دوران ہی امریکی صدر روز ویلٹ اور چین کے جنگ کائی شیک نے برطانیہ پر ہندوستان کی آزادی کے لئے دباؤ ڈالا تھا جنگ کے خاتمہ پر امریکی صدر ٹرومین نے دباؤ میں اضافہ کر دیا امریکی امداد کے باعث ہی برطانیہ نے جنگ جیتی تھی اور امریکی اقتصادی امداد کے باعث ہی برطانیہ اپنی تعمیر نو کر سکتا تھا اس لئے برطانیہ امریکہ کو نظر انداز نہیں کر سکتا تھا پارلیمنٹ میں سر اسٹیفورڈ کرپس نے خود ہی یہ تسلیم کیا ہے کہ بین الاقوامی سماج خاص طور پر امریکہ اور سوویت روس کے بڑھتے ہوئے دباؤ کی وجہ سے برطانیہ کے لئے ہندوستان پر اپنا اقتدار بنائے رکھنا انتہائی دشوار ہو گیا ہے۔

برطانیہ میں لیبر پارٹی کی حکومت: جنگ سے پیدا شدہ حالات کی وجہ سے ہندوستانیوں کو اقتدار منتقل کرنا ضروری تو تھا ہی لیکن ہندوستانیوں

کی خوش نصیبی سے لیبر پارٹی کی حکومت بن جانے کے باعث اس میں آسانی اور تیزی آگئی
لیبر پارٹی کے ذمہ داروں نے حکومت حاصل کرنے سے قبل ہندوستان کے مسائل
کو خوش اسلوبی سے سلجھانے کا وعدہ کیا تھا جسے اس نے پورا کیا مولانا آزاد کے
لفظوں میں ہندوستان کی حالت اس وقت اس طرح کی تھی کہ ہماری مخالفت
... پچاس سالوں تک ہندوستان پر حکومت کیا جا سکتا تھا فرانس گرچہ برطانیہ
... تھا اس کے باوجود دس سال تک وہ ہند چین پر اپنا اقتدار برقرار
... لیکن اٹلی (وزیر اعظم) ایسے شخص نہیں تھے جو کہ ہندوستانی حالات کا برطانوی
... کے لئے استعمال کرتے اس لئے آزادی کا حصول لیبر پارٹی کا بھی مرہون
منت ہے جس نے اقتدار کے منتقلی کے عمل کو باعزت طور پر آسان اور تیز کر دیا[۸]
... پی سینن بھی اس سے متفق ہیں ان کے ہی الفاظ میں اقتدار کی منتقلی کی ایک
خاص وجہ ۱۹۴۵ء میں برطانیہ میں لیبر پارٹی کے ذریعہ واضح اکثریت کے حصول کے بعد
اقتدار کا حاصل کرنا تھا۔ (۹)

فوجی بغاوت : انگریزوں نے جب سے ہندوستان پر اپنا اقتدار جمایا
تھا اس وقت سے ہی ہندوستانی افواج پر پورا اعتماد تھا۔ ہندوستانی افواج
انگریزوں کے وفادار تھے اور اس کی قوت سے ہی انگریزوں نے ہندوستان پر
اپنا اقتدار جمایا تھا اور ۱۸۵۷ء کے غدر کے بعد تمام عوامی بغاوتوں کو کچلا تھا
لیکن ۱۹۴۶ء میں فوجی بغاوت کی شکل میں جو حادثہ ہوئے برطانوی حکومت
کے ذریعہ ہندوستانی افواج پر زیادہ عرصہ تک اعتماد نہیں کیا جا سکتا تھا عالمی جنگ
کی وجہ سے انگریز فوجیوں کی تعداد بہت کم ہوگئی تھی اور ہندوستانی افواج
پر بھروسہ نہیں کیا جا سکتا تھا اس لئے انگریزوں کو جلد از جلد ہندوستان چھوڑ

لے لے کہ انہیں اس بات کا بھی خوف تھا کہ آزادی میں اگر مزید تاخیر کی جائے تو کیمونزم کے بڑھاوا کی یہ وجہ بن سکتا ہے ۱۹۴۶ء میں سرد جنگ کی ابتدا ہو گئی تھی اور بین الاقوامی میدان میں برطانیہ اپنی مخالف طاقت کے حوصلہ افزائی کی کوئی غلطی نہیں کرنا چاہتا تھا دسمبر ۱۹۴۲ء میں وزیر اعظم اٹلی نے لارڈ ماؤنٹ بیٹن سے کہا تھا کہ کانگریس اور مسلم لیگ کو متاثر کرنے والی سیاسی حرکات سے حکومت انتہائی ناراض تھی اور اگر ہم نے کچھ ہوشیاری نہیں برتی تو ہم ہندوستان میں نہ صرف سول وار کو بڑھاوا دیں گے بلکہ کیمونزم کے حوصلہ افزائی کا باعث ہونگیں اس سے ان تمام سرگرمیوں کو بڑھاوا دینے کے لئے فوری کارروائی ضروری ہے ۔

برطانیہ پر بیرونی دباؤ : ۱۹۴۷ء میں ہندوستان کی آزادی کی ایک خاص وجہ برطانیہ پر بین الاقوامی خاص طور پر امریکی اور چینی دباؤ تھا جنگ کے دوران ہی امریکی صدر روز ویلٹ اور چین کے جنگ کائی شیک نے برطانیہ پر ہندوستان کی آزادی کے لئے دباؤ ڈالا تھا جنگ کے خاتمہ پر امریکی صدر ٹرومین نے اس دباؤ میں اضافہ کر دیا امریکی امداد کے باعث ہی برطانیہ نے جنگ جیتی تھی اور امریکی اقتصادی امداد کے باعث ہی برطانیہ اپنی تعمیر نو کر سکتا تھا اس لئے برطانیہ امریکہ کو نظر انداز نہیں کر سکتا تھا پارلیامنٹ میں سر اسٹیفورڈ کرپس نے خود ہی یہ تسلیم کیا ہے کہ بین الاقوامی سماج خاص طور پر امریکہ اور سوویت روس کے بڑھتے ہوئے دباؤ کی وجہ سے برطانیہ کے لئے ہندوستان پر اپنا اقتدار بنائے رکھنا انتہائی دشوار ہو گیا ہے ۔

برطانیہ میں لیبر پارٹی کی حکومت : جنگ سے پیدا شدہ حالات کی وجہ سے ہندوستانیوں کو اقتدار منتقل کرنا ضروری تو تھا ہی لیکن ہندوستانیوں

کی خوش نصیبی سے لیبر پارٹی کی حکومت بن جانے کے باعث اس میں آسانی اور تیزی آگئی لیبر پارٹی کے ذمہ داروں نے حکومت حاصل کرنے سے قبل ہندوستان کے مسائل کو خوش اسلوبی سے سلجھانے کا وعدہ کیا تھا جسے اس نے پورا کیا مولانا آزاد کے لفظوں میں ہندوستان کی حالت اس وقت اس طرح کی تھی کہ ہماری مخالفت کے باوجود کچھ سالوں تک ہندوستان پر حکومت کیا جا سکتا تھا فرانس گرچہ برطانیہ سے بھی کمزور تھا اس کے باوجود دس سال تک وہ ہندچین پر اپنا اقتدار برقرار رکھے رہا لیکن اٹلی (وزیر اعظم) ایسے شخص نہیں تھے جو کہ ہندوستانی حالات کا برطانوی خودغرضی کے لئے استعمال کرتے اس لئے آزادی کا حصول لیبر پارٹی کا بھی مرہون منت ہے جس نے اقتدار کے منتقلی کے عمل کو باعزت طور پر آسان اور تیز کر دیا[۸] وی پی مینن بھی اس سے متفق ہیں ان کے ہی الفاظ میں اقتدار کی منتقلی کی ایک خاص وجہ ۱۹۴۵ء میں برطانیہ میں لیبر پارٹی کے ذریعہ واضح اکثریت کے حصول کے بعد اقتدار کا حاصل کرنا تھا۔(۹)

فوجی بغاوت: انگریزوں نے جب سے ہندوستان پر اپنا اقتدار جمایا تھا اس وقت سے ہی ہندوستانی افواج پر پورا اعتماد تھا۔ ہندوستانی افواج انگریزوں کے وفادار تھے اور اس کی قوت سے ہی انگریزوں نے ہندوستان پر اپنا اقتدار جمایا تھا اور ۱۸۵۷ء کے غدر کے بعد تمام عوامی بغاوتوں کو کچلا تھا لیکن ۱۹۴۶ء میں فوجی بغاوت کی شکل میں جو حادثہ ہوئے برطانوی حکومت کے ذریعہ ہندوستانی افواج پر زیادہ عرصہ تک اعتماد نہیں کیا جا سکتا تھا عالمی جنگ کی وجہ سے انگریز فوجیوں کی تعداد بہت کم ہو گئی تھی اور ہندوستانی افواج پر بھروسہ نہیں کیا جا سکتا تھا اس لئے انگریزوں کو جلد از جلد ہندوستان چھوڑ

دینے میں ہی عافیت سمجھی میں آئی ٹی کے مینن کے لفظوں میں ان حادثات نے
انگریزوں کی آنکھیں کھول دیں اور انہوں نے سمجھ لیا کہ ہندوستانی قومی جذبہ کو
اب فوجیوں میں داخل ہونے سے روکا نہیں جا سکتا ہے اور ہندوستان میں
انگریزی افواج اتنی بڑی تعداد میں نہیں ہے کہ انہیں ہر جگہ بھیجا جا سکے (۱۰)

ماؤنٹ بیٹن منصوبہ کی منظوری: ہندوستان کی آزادی کی راہ میں
ایک بڑی رکاوٹ کانگریس اور مسلم لیگ کے درمیان کا آپسی اختلاف تھا
لیکن جولائی ۱۹۴۷ء میں کانگریس اور مسلم لیگ دونوں نے ہی ماؤنٹ بیٹن
کے منصوبہ کو تسلیم کر لیا اور اس طرح اقتدار کی منتقلی کی آخری رکاوٹ بھی ختم
ہو گئی کانگریس دو قومی نظریہ پر ایمان لے آئی اور مسلم لیگ کٹا چھٹا پاکستان پر
آمادہ ہو گیا اس منظوری کے بعد ماؤنٹ بیٹن نے تقسیم ملک اور آزادی وطن
کا کام تین ماہ کے اندر ہی پورا کر دیا۔

References

1. Leonard Mosley - The last days of the British Raj (London 1961) P. 203.
2. Ibid P. 241-242
3. De Bary - Sources of Indian Tradition P. 802
4. M. A. Azad - India wins Freedom P127.
5. Michael Brecher - Nehru's Political Biography P32
6. Rajendra Prasad - At the feet of Mahatma Gandhi P31
7. Michael Brecher - op cit P372
8. M. A. Azad - op cit P108
9. V. P. Menon - Transfer of Power P436.

تبصرہ

نام کتاب : چمن در چمن : قیمت : ساٹھ روپیے

مرتبہ : جناب منظور عثمانی صاحب سابق پرنسپل شفیق میموریل سینئر سکنڈری اسکول دہلی۔

ملنے کا پتہ : ۱۷/۶ ہملٹن روڈ کشمیری گیٹ دہلی ۶

" (۲) آزاد کتاب گھر اردو بازار، جامع مسجد دہلی ۶

" (۳) تاج پبلشرز، بیری والا باغ، دہلی ۶

" (۴) دارالکتاب، دیوبند (یوپی)

یہ کتاب چمن در چمن دراصل قدیم و جدید اور معلوم و نامعلوم شعراء کے منتخب اشعار کا مجموعہ ہے۔ غضب کے اشعار ہیں۔ بڑے ہی مزے دار، چٹخارے والے اور پھڑک دار اس میں کچھ اشعار تو ایسے ہیں جو اپنے گہرے معنوی لحاظ سے دل و دماغ کی گہرائیوں تک میں گھر کر جاتے ہیں۔

حصۂ اوّل ہی سے قاری کی دلچسپی جسطرح شروع ہوتی ہے وہ کتاب کے آخری صفحہ تک برقرار رہتی ہے۔ اور جب کتاب ختم ہوتی ہے تو ایسا معلوم ہوتا ہے کہ کسی نے سامنے سے لذیز کھانوں سے بھرا سجا دسترخوان ایکدم سے ہٹا دیا ہے۔ شروع میں مرتب کے قلم سے اپنے طلباء اور طالبات کے نام پر انتساب ہے اور پھر حرف آغاز میں مرتب نے کتاب کے سلسلے میں کہا ہے کہ "یہ شعری انتخاب میری برسوں کی کاوشوں کا حاصل یا لاحاصل ہے اس کے پیچھے تقریباً ہر معروف استاد کے دیوان کا مطالعہ اور ہر دستیاب

ادبی جریدہ کی ورق گردانی رہی ہے"

کتاب چمن در چمن میں حصہ اول میں حروف تہجی کے تحت اشعار کا انتخاب دیا گیا ہے حصہ دوم تلخ و شیریں کے عنوان سے دیا گیا ہے جو تین ابواب پر مشتمل ہے، باب اول غالب خستہ کی شگفتہ بیانی باب دوم شاعر طریقت اکبر الہ آبادی کے تیر و نشتر۔ باب سوم ۔۔۔۔ کے اڑیں گے پرزے جس میں اردو شاعری کے طنز و مزاح کے معروف ہدف یعنی واعظ، زاہد، صوفی و مُلّا، شیخ، ناصح، قاصد و دربان وغیرہ پر چنیدہ اشعار دیئے گئے ہیں۔ سچ تو یہ ہے کتاب چمن در چمن میں ہر منتخب شعر لاجواب ہے۔

موزوں ہے ہر زمانہ پر، ہر چیز پر، عوام و خواص پر، امیری غریبی پر، عشق و محبت کی وفاداریوں پر اور داغ مفارقت پر، لیڈری اور لیڈروں پر ان کے کردار و عمل پر، جب جی چاہے یا ضرورت پڑے جھٹ سے اس مجموعہ چمن در چمن سے نکال کر چسپاں کر ڈالئے اور دل و زبان اور دماغ سے خوب خوب چٹخارے لیجئے اور واہ! واہ! بٹوریئے۔ اور اب یہ کیا بتایا جائے کہ کتاب میں موجود اشعار پڑھتے ہوئے کسی بھی طرح کتاب ہاتھ سے چھوڑنے کو دل نہیں کرتا ہے۔ اتنے بڑھیا اشعار کا حسن سلیقہ سے انتخاب کر کے کتابی صورت میں شائع کرنے کے لئے فاضل مرتب اردو داں طبقہ کی طرف سے ہر طرح کی ستائش و سراہنا اور مبارکباد کے بجا مستحق ہیں۔ یقیناً کتاب چمن در چمن اردو ادب میں ایک قابل قدر اضافہ کا باعث ہے۔ (م۔س۔پ)

○ نماز پڑھتے رہو اور زکوٰۃ دیتے رہو اور پیغمبر خدا کے فرمان پر چلتے رہو، تاکہ تم پر رحم کیا جائے۔ (قرآن)

وفیات

ماہِ صفر المظفر ۱۴۱۷ھ کے اواخر میں ہندوستان و بیرون ہندوستان کی اہم علمی و مذہبی شخصیت قاضی اطہر مبارک پوری کی وفات سے دل و دماغ ہل کر رہ گیا۔ قاضی صاحب مرحوم کی شخصیت کا تصوراتی خاکہ ہر وقت نظروں کے سامنے گھوم پھر رہا ہے وہ ندوۃ المصنفین دہلی میں تشریف لاتے اور اپنی خداداد قابلیت وافکار سے دفتر میں موجود ہر شخص کو متأثر کر دیتے۔

قاضی اطہر مبارک پوری کا قبلہ ابا جان مفکر ملت حضرت مفتی عتیق الرحمان عثمانی رحمۃ اللہ علیہ کے دار العلوم دیوبند سے زمانہ طالب علمی ہی سے خصوصی تعلق و لگاؤ رہا ہے۔ حضرت مفتی صاحبؒ نے ندوۃ المصنفین دہلی میں ان کو بلا کر ان سے کئی علمی وادبی کتابیں تصنیف کرائیں۔ قاضی اطہر مبارک پوری کی تاریخ خلافت عباسیہ، تاریخ خلافت راشدہ، تاریخ بنو امیہ، دیار پورب جیسی اہم کتابیں ادارہ ندوۃ المصنفین دہلی ہی سے شائع ہوئیں اور علمی حلقہ میں قبولیت کا باعث بنی۔

ادارہ ندوۃ المصنفین دہلی سے وابستگی سے قاضی اطہر مبارک پوری کی شخصیت علمی وادبی حلقوں خصوصاً عالم اسلام میں خوب خوب متعارف ہوئی۔ احقر نے رسالہ "برہان" دہلی کے صفحہ اوّل پر قاضی اطہر مبارک پوری کا نام نمایاں طور پر شائع کرانیکا اہتمام رکھا جس سے میرا قاضی صاحب سے لگاؤ والنسبت کا پتہ چلتا ہے۔

قاضی صاحب کی علمی خدمات کے لئے صدر جمہوریہ ہند نے عربی اسکالرشپ کا اعزاز خصوصی بھی دیا۔

بہت ساری خوبیوں، صلاحیتوں قابلیت کے باوجود قاضی صاحب انکساری کے پیکر مجسم تھے۔ مفتی صاحبؒ کے انتقال کے بعد دفتر ادارہ ندوۃ المصنفین دہلی سے برابر رابطہ وتعلق قائم رکھا اور راقم عمید الرحمان عثمانی کی موقع بہ موقع تعریف و ستائش کرتے رہے جس سے احقر راقم عمید الرحمان عثمانی کے لگن وجذبہ اور حوصلہ میں اضافہ ہی ہوا۔

بہر کیف قاضی اطہر مبارک پوری بڑی نیک و برگزیدہ شخصیت تھے۔ ان کی وفات سے تاریخ کا ایک زرین علمی باب بند ہوگیا ہے۔

اللہ رب العزت کروٹ کروٹ جنت نصیب فرمائے آمین۔

ادارہ ندوۃ المصنفین دہلی اور احقر راقم عمید الرحمان عثمانی قاضی اطہر مبارکپوری کے انتقال پُرملال پر اظہار تعزیت کرتا ہے۔ اور بارگاہِ عالی میں مغفرت کے لئے دعاگو ہے۔

بقیہ: فلسطین کی ممتاز شاعرہ : فدوی طوقان

کی موجودگی میں جب حالات حاضرہ، شعر، محبت، موت اور جدوجہد کے متعلق تبادلۂ خیال ہوا تو ان لوگوں نے فدوی کو انسان کے انفرادی اور اجتماعی احساس و فکر کے درمیان فرق سے روشناس کرایا۔ اور مشترک اجتماعی شعور کی لذت سے آگاہ کیا، تو وہ اپنی ذات کے خول سے نکل کر اجتماعیت کی طرف آگئیں۔ لے مگر اپنی فردیت اور اجتماعی جذبات کے درمیان کشمکش کو دور اور اجتماعیت سے دلچسپی مکمل طور پر جون ۱۹۶۸ء کے بعد ہی ہوسکی۔

سرپرست اعلیٰ
عالیجناب حکیم عبدالحمید
چانسلر جامعہ ہمدرد
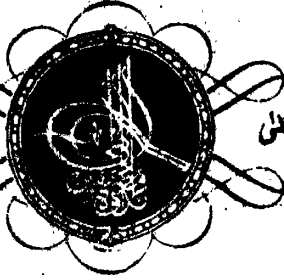
اگست ۱۹۹۶ء

نگرانِ اعلیٰ
حضرت مولانا حکیم محمد زماں حسینی

برہان

جلد ۱۱۹ شمارہ ۸

اس شمارے میں

دفتر رابطہ
Nadwatul-Musannefeen
4136, Urdu Bazar, Jama Masjid, Delhi-110006

نظرات

آزاد ہندوستان کی تاریخ میں ماہِ اگست کی جو اہمیت ہے وہ ظاہر ہی ہے اس ماہ ہندوستان نے انگریز سامراج کی دو سو سالہ غلامی سے نجات حاصل کی تھی اور انگریزی حکمرانیت کی جگہ ہندوستانی عوام کی حکمرانی قائم ہوئی تھی ۱۹۴۷ء سے ہمارا ملک آزادی کی فضا میں سانس لے رہا ہے۔ یہ ہندوستان کے ہر باشندے کے لیے خوشی و مسرت کی بات ہے۔

مقام مسرت ہے کہ ہم اس سال اپنی آزادی کے ۴۹ ویں سال میں داخل ہو گئے ہیں۔ یہ آزادی ہمیں بڑی ہی جد و جہد اور قربانیوں کی بدولت نصیب ہوئی ہے۔ ہمارے قائدین و رہنماؤں نے انگریزی سامراج کی غلامی کے مصائب برداشت کئے جیل کی سلاخوں میں اپنی قیمتی زندگی کے دن سخت مشکلات میں بسر کئے، کتنوں ہی نے ہنسی خوشی پھانسی کے پھندوں کو گلے لگا کر جام شہادت نوش کیا، کتنوں ہی نے جلا وطنی کی زندگی کو لبیک کہا۔ لیکن کسی بھی قیمت پر آزادی کی جد و جہد و تحریک کو ختم کرنے کی حامی نہ بھری۔ آج ہمارے ان ہی راہنماؤں کی قربانیوں، جد وجہد، کوششوں سے یہ ملک آزاد ہوا ہے اور ہم یہاں آزادی کی خوشگوار فضا میں ہم اپنی زندگی گذار رہے ہیں۔ جہاں پھول ہوتے ہیں وہاں کانٹے بھی ہوتے ہیں۔ پھولوں کی

چاہت میں کانٹوں کی چبھن بھی محسوس وگوارہ کرنی پڑتی ہے۔ وہ ہی بات ہمیں آج اپنی آزادی کی ۴۹ ویں سالگرہ مناتے ہوئے محسوس ہو رہی ہے۔ آزادی کے بعد ہندوستان میں افراط زر بڑھا ہے۔ مہنگائی سے لوگوں کا برا حال ہوا ہے۔ ضروریات زندگی کی حصولیابی ایک اوسط درجہ کے شخص کے لئے مشکل ترین مرحلہ سر کرنے کے برابر ہے، لیکن اس کے باوجود بھی اسے اس بات کا تو ہر وقت خیال رہتا ہی ہے کہ یہ صورتحال بدلنا اس کے اختیار میں ہے ہر پانچ سال بعد انتخاب کے موقع پر وہ اپنی مرضی پسند شخص یا پارٹی کو حکومت بنانے کا حق تفویض کر دیگا۔ لیکن آزادی سے پہلے کوئی شخص اس کا تصور بھی نہیں کر سکتا تھا کہ حکمرانی میں اس کی ساجھے داری کا بھی کوئی دخل ہو سکتا ہے۔ اسی لئے آزادی کو ایک نعمت کہا گیا ہے۔ اور ہندوستانیوں کو یہ آزادی کی نعمت حاصل ہے یہ کوئی کم اہم بات نہیں ہے۔

اب دیکھئے کل تک ہندوستان کی حکمرانی پر کانگریس جماعت کا قبضہ و دبدبہ تھا لیکن ہندوستانی عوام کو حاصل ووٹ کی طاقت نے اسی حکمراں جماعت کو حزب اختلاف کی صف میں لا کھڑا کیا اور کل کی حزب اختلاف جماعتوں کو حکمرانی کے مقام پر لا بٹھایا۔ گذشتہ سال ۱۹۹۵ء تک ۱۵ اگست یوم آزادی کے موقع پر ہندوستانی عوام سے بحیثیت وزیر اعظم پی وی نرسمہا راؤ نے خطاب کیا تھا اور عوام و ملک کے سامنے اپنی پالیسیوں کی تفصیل بیان کی تھی اور اس بار ۱۹۹۶ء ۱۵ اگست یوم آزادی کی سالگرہ منانے کے وقت ہندوستانی عوام سے لال قلعہ سے بحیثیت وزیر اعظم جناب دیوگوڑا ہندوستانی عوام سے مخاطب ہوں گے۔ اور ملک وعوام کی جس طرح رہنمائی کریں گے اس کی تفصیلات سے آگاہ کریں گے ہندوستانی عوام کو یہ طاقت جو حاصل ہے اس پر ہندوستانی عوام اگر فخر

محسوس کرتے ہیں تو یہ کوئی بے جا بات نہیں ہے ـــ آزادی انسان کا بنیادی حق ہے اور شکر ہے کہ ہندوستانی عوام کو یہ حق حاصل ہے ۔

لیکن ہم ہندوستان کے ارباب حل وعقد سے یہ بات بھی کہے بغیر نہ رہیں گے کہ انہوں نے ہندوستانی عوام کی چاہت کو کبھی صحیح طور پر نہیں سمجھا ہے وہ ہندوستان کے خوشحال طبقہ کو دیکھ کر ہی نظام حکومت چلانے کے لیے اکثر ایسے فیصلے کرتے ہیں جس سے ہندوستان کا جو غریب و پسماندہ طبقہ ہے وہ بُری طرح متاثر ہوتا ہے اور اس کی زندگی جو پہلے ہی مشکلات میں گھری رہتی ہے اور مزید مشکلات و پریشانیوں میں گھر جاتی ہے ۔ عام آدمی کا جس چیز سے روزمرہ کا تعلق و واسطہ رہتا ہے اس چیز میں کبھی سدھار کی طرف توجہ نہیں دی جاتی ہے ۔ مہنگائی کی مار نے غریب عوام کا کچومر ہی نکال دیا ہے پھر سرکاری محکموں میں جس طرح بدعنوانیوں کی شکایات کی بھرمار ہے اس کے سدباب کے لیے کسی کا دھیان ہی نہیں جاتا ہے ۔ معمولی کام کے لیے بھی ہفتوں مہینوں بلکہ بعض معاملات میں سالوں چکر پہ چکر کاٹنے پڑتے ہیں تب بھی کام کا ہو جانا ناممکن ہی دکھائی دیتا ہے ۔ پانی بجلی کے مسائل سے عوام پریشان ہیں سڑکوں پر ٹریفک کی وجہ سے گھنٹوں عوام کا قیمتی وقت ضائع ہو جاتا ہے ۔ کوئی بھی کام کسی سرکاری محکمہ سے عوام کا پڑ جائے تو لمبی لمبی قطاریں اسے روزی روٹی کمانے سے محروم کر دیتی ہیں ۔ بجلی پانی ٹیلی فون کے بلوں کو جمع کرانے کوئی جاتا ہے تو اسے گھنٹوں لمبی لمبی قطاروں میں کھڑا ہونے پر مجبور ہونا پڑتا ہے ۔ عدالتوں میں مقدمات کی بھرمار ہے ۔ سالوں کچہریوں کے چکر ہی کاٹ کاٹ کر عام آدمی اپنی زندگی کے دن تمام کر ڈالتا ہے ۔ آزادی بیشک نعمت ہے لیکن

اگر اس قسم کی لا حاصل پریشانیوں و مشکلات اور مصیبتوں سے عوام کو ہر وقت گذرنا پڑ جائے تو پھر اسے آزادی کی یہ نعمت ایک بوجھ محسوس نہ ہونے لگے کبھی ارباب اقتدار نے اس طرف اپنی توجہ مرکوز کرنے کی زحمت گوارہ نہیں کی تو پھر اس ملک اور اس کے عوام کا ہم یہ ہی کہیں گے کہ خدا ہی حافظ ہے!
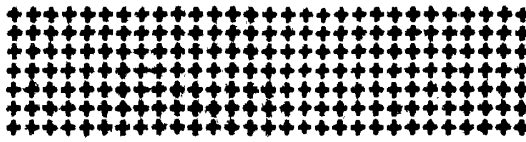
بقیہ: فلسطین کی ممتاز شاعرہ: فدوی طوقان

اور اس میں انسانی پہلوؤں کو واضح کرتی ہیں۔ فطرت دراصل ان کے لئے ایک بدل ہے۔ جس سے انہیں اصل تک پہنچنا ہے [۸]

فدوی (اشواق حائرہ) میں زندگی کے جنسی پہلو اور اس کے ساتھ خود کو کائنات میں مدغم کرنے کی کوشش کا اظہار کرتی ہیں۔ جنسی اعتبار سے وہ احساس دلاتی ہیں کہ ان کا دل اس کنواری لڑکی کی طرح ہے جس کی زندگی میں مختلف میلانات ملتے ہیں اور جو کسی ایسے نوجوان کا خواب دیکھتی ہے جو اس کے قریب آئے گا اور اسے دور بہت دور لے جائے گا: (جاری)

---

[۸] شاکر النابلسی؛ فدوی تشتبک مع الشعر۔ ص ۳۵-۳۷۔

مفتی صاحب کے بیرونی اسفار

مفکرِ ملت مفتی عتیق الرحمن عثمانی" نمبر ۱۹۸۷ء میں شائع ہوا تھا اس کے بقایا مضمون ترتیب و اشاعت کے مراحل میں

جس طرح ہندوستان کی وسعتوں میں علمی، سیاسی اور سماجی حلقوں نے مفتی صاحب کی جوہری شخصیت اور اُن محاسن و فضائل کو سر آنکھوں پر رکھا، اور ان کی فکری بصیرتوں سے مدتوں استفادہ کیا، اسی طرح عالمی سطح پر بھی ان کی قدر و منزلت کا برملا اعتراف کیا گیا۔ اور ان کی ممتاز صلاحیتوں کو خراج تحسین و تصدیق پیش کیا گیا۔

اس طرح مفتی صاحبؒ کے بیرونی اسفار اور عالمی اجتماعات میں ان کی شرکت و سیاحت کی داستان بھی کافی طویل ہے۔ جو بحدِ ضرورت اختصار کے ساتھ ہم ذیل میں پیش کر رہے ہیں۔ افسوس کہ ہجوم مشاغل اور کاموں کے تسلسل نے مفتی صاحبؒ کو کبھی اس کا موقعہ نہ دیا کہ وہ اپنے ان تمام یادگار سفروں کی رُوداد خود لکھتے یا قلمبند کرا دیتے جو اہلِ علم اور دینی و اجتماعی دلچسپی رکھنے والے عوام و خواص کے لئے "بہارستان فکر و نظر" ثابت ہوتی۔ اور جس کا ایک واضح نمونہ صرف ان دو سفرناموں میں نظر آتا ہے جو روس اور عراق کے سفر میں لکھے ہوئے مفتی صاحبؒ ہی کے خطوط سے مرتب کر کے ہم ان صفحات کے بعد شامل اشاعت کر رہے ہیں۔

یوں تو مناسک حج و عمرہ کی ادائیگی اور حرمین مقدس کی زیارت کے لئے مفتی صاحب اپنی نوعمری ہی میں سعودی عرب تشریف لے گئے تھے۔ یہ تقسیم ہند سے پہلے کی بات ہے اور اُن کا یہ پہلا سفر خالص ذاتی نوعیت کا تھا۔

اِدھر تقسیم ہند کے بعد برصغیر ہند و پاک پر کشت و خون اور تبادلہ آبادی کا جو طوفان گذرا، اس کے بعد صورت حال بہت سنگین ہو گئی تھی۔ ان نو آزاد و نو زائیدہ مملکتوں کی باہم کشمکش بھی شباب پر تھی اور بیرونی دنیا میں اُس کا ردِ عمل بھی بہت کچھ بے سر و پا، خاص طور پر مسلم ممالک میں یہ خیال عام تھا کہ تقسیم ہند کے بعد ہندوستان میں مسلمان نام کا نہ کوئی

فروغ پاتی رہا ہے، نہ اسلامی آثار و مساجد کا کوئی نام ونشان۔ یہ بھیانک غلط فہمی ہندوستان کی عزت وناموس کے لئے بھی، اور خود کروڑوں فرزندانِ توحید کے حق میں بھی جو اپنے خدا پر بھروسہ رکھتے ہوئے، حالات کی انتہائی بے رحمی کے باوجود، اپنے وطن ہندوستان اور اس میں پھیلے ہوئے اسلامی مآثر وشعائر سے دستبردار ہونے کے لئے تیار نہیں تھے، ناقابل برداشت تھی۔ چنانچہ ملک و وطن کے صاف دماغ رہنماؤں نے سنجیدگی سے اس پر غور کیا اور اس کے تدارک کے لئے یہ ضروری سمجھا کہ مسلمانانِ ہند کے سرکردہ و منتخب اکابر پر مشتمل ایک وفد سب سے پہلے قلب عالم اسلامی۔ سعودی عرب۔ کا دورہ کرے، اور وہاں کے عوام وخواص کو واقعی صورت حال سے باخبر کرکے اِس پھیلائے ہوئے مغالطہ کا ازالہ کر سکے۔

اس وقت کے وزیر اعظم ہند پنڈت جواہرلال نہرو اور مولانا ابوالکلام آزادؒ، مفتی اعظم حضرت مفتی کفایت اللہ صاحبؒ اور مجاہدِ ملت مولانا حفظ الرحمٰن صاحبؒ اس فکر کے محرک اور داعی تھے۔ اور اُن ہی کے فیصلہ کے مطابق مسلمانانِ ہند کا ایک مؤقر وفد ۱۹۴۹ء میں سعودی عرب روانہ کیا گیا۔ اس وفد میں مفتی عتیق الرحمٰن صاحب۔ مولانا عبدالحق مدنی۔ مولانا حبیب الرحمٰن لدھیانوی۔ قاضی محمد احمد کاظمی ایڈوکیٹ۔ مولانا زین العابدین میرٹھی۔ مولانا وحیدالزماں کیرانوی وغیرہ شریک تھے۔ حجاز مقدس میں ان حضرات نے کافی وقت گذارا۔ اور عالم اسلام کے سرکردہ حضرات سے ملاقاتیں کرکے اُن کو اصل حقیقت حال سے آگاہ کیا۔ بحمداللہ اس کوشش کے بہت مفید نتائج سامنے آئے۔ اور عالم اسلام میں ہندوستان اور مسلمانان ہند کے متعلق پھیلائی ہوئی گمراہ کن اور بے بنیاد کہانیوں کا بڑی حد تک ازالہ ہوسکا۔

وسط ایشیا اور روس کا سفر

اگست ستمبر سنہ ۱۹۶۳ء میں سوویت یونین کے تسلیم شدہ اِدارۂ دینیات وسط ایشیا و تاجکستان کی پُر اصرار دعوت پر مفتی صاحب نے تاشقند۔ سمرقند۔ بخارا۔ دوشنبہ۔ ماسکو اور لینن گراڈ کا طویل سفر کیا۔ اور روس کی بدلتی ہوئی سیاست کے دَور میں سب سے پہلی بار ان

علاقوں کی بچی کھچی مسلم آبادیوں، اُن کے مآثر اور دینی جذبات واحساسات سے ربط قائم کیا۔

اس سفر کی یادداشت بڑی دلچسپ ہے۔ جو خود مفتی صاحب ہی کے قلم سے جستہ جستہ بُرہان میں شائع ہوئی تھی۔ اور جس کو مرتب شکل میں آئندہ صفحات میں پیش کیا جارہا ہے۔

۱۹۷۴ء میں جبکہ بڑے اہتمام کے ساتھ امام المحدثین حضرت امام بخاری رح کا بارہ سو (۱۲۰۰) سالہ جشن منایا گیا۔ اور بڑے پیمانے پر اس یادگاری تقریب کے انتظامات عمل میں لائے گئے۔ اس موقعہ پر بھی ہندوستان کی نمائندگی کے لئے مفتی صاحب رح اور دہلی کے امام الجامع سید عبداللہ بخاری صاحب کو بلایا گیا تھا۔ ان حضرات نے بڑے ذوق وشوق کے ساتھ اس مبارک تقریب میں شرکت کی۔ اور ہندوستان کی نمائندگی کا حق ادا کیا۔ اس طرح وسط ایشیا میں مفتی صاحب کا یہ دوسرا دورہ تھا۔

۱۹۶۵ء ہی میں انڈونیشیا کی راجدھانی جاکرتا و بینڈونگ میں افریقن، ایشین ممالکِ اسلامیہ کی ایک کانفرنس بُلائی گئی تھی۔ اس میں شرکت کے لئے ہندوستان سے ایک وفد مفتی صاحب کی سربراہی میں گیا۔ اس کانفرنس کا صدر سوکارنو نے افتتاح کیا تھا اور مفتی صاحب کو بھی اس میں خطاب کرنے کا موقعہ ملا تھا۔ کانفرنس سے فارغ ہو کر ملیشیا کے بعض شہروں کی بھی اس وفد نے سیر کی تھی۔

فروری ۱۹۷۵ء میں عراق کے دارالخلافہ بغداد میں "مؤتمر علماء المسلمین" کا عالمی اجتماع ہوا تھا۔ مفتی صاحب نے نہ صرف اس مؤتمر میں شرکت فرمائی، بلکہ اسی سفر میں عراق کے اہم تاریخی مقامات اور اسلامی یادگاروں کی زیارت بھی کی۔

اس سفر کی یادداشت خود مفتی صاحبؒ نے برہان کے لئے تحریر کی تھی ۔جو آئندہ صفحات میں نقل کی جا رہی ہے۔

پھر اسی سال ستمبر میں رابطۂ عالم اسلامی نے مکہ مکرمہ میں "موتمر رسالۃ المسجد" کے نام سے علماء اسلام کا ایک اجتماع بلایا تھا۔جس کا خاص موضوع اسلامی زندگی میں مسجد کی اہمیت اور اس کے موقف و مقاصد کی وضاحت تھی۔مفتی صاحب نے اس مؤتمر میں بھی شرکت فرمائی۔اور ساتھ ہی مناسک عمرہ کی ادائیگی سے بھی مشرف ہوئے

اہم علمی اور دینی اجتماعات کے متعدد مواقع پر مفتی صاحب پاکستان بھی کئی مرتبہ تشریف لے گئے۔مولانا ابوالاعلیٰ مودودی کی وفات پر اکتوبر ۱۹۸۱ء میں پنجاب یونیورسٹی لاہور کے تاریخی ہال میں عالم اسلام کے نامور فضلاء کا ایک عظیم تعزیتی اجتماع منعقد ہوا تھا جس میں مولانا مودودی کی عظیم علمی و فکری کاوشوں کو خراج تحسین پیش کیا گیا تھا۔اس اجتماع میں مفتی صاحب کی مختصر لیکن بہت پُرمغز اور بے لاگ تقریر کو بہت پسند کیا گیا تھا۔

"نفاذِ شریعت" کے عنوان پر ایک عظیم الشان کانفرنس پاکستان میں منعقد ہوئی جس میں اطراف واکناف عالم سے نامور فضلاء کو دعوت دی گئی تھی۔اس کانفرنس میں بھی مفتی صاحبؒ نے شرکت فرمائی۔اور 'علم اور اسلام' کے موضوع پر اپنا مبسوط اور بصیرت افروز مقالہ پڑھا۔(یہ مقالہ بھی اس شمارہ میں نقل کیا جا رہا ہے)

امریکہ سے ایک بُلاوا

نیویارک سے فیڈریشن آف اسلامک ایسوسی ایشنز آف یو۔ایس۔اے اینڈ کناڈا (الاتحاد العام للجمعیات الاسلامیہ فی الولایات المتحدہ وکناڈا) نے اپنے ستائیسویں سالانہ اجلاس میں شرکت کے لئے (جو جولائی ۱۹۷۸ء میں چارلسٹن میں ہونے والا تھا)

باصرار واہتمام مفتی صاحب کو دعوت دی تھی۔ لیکن اپنی صحت اور بعض اہم مصروفیات کی وجہ سے مفتی صاحب یہ سفر نہ کرسکے تھے۔ اور فیڈریشن مذکور کو اپنا پیغام بھیجنے پر اکتفار کیا تھا۔

ایک ہفتہ ری یونین میں

بحرِ ہند کے جنوب کا ایک سرسبز وشاداب جزیرہ "ری یونین" کہلاتا ہے جو فرانس کی نوآبادیات میں شمار کیا جاتا ہے۔ اس کی آبادی اور تجارتی ترقی میں گجرات کے بہت سے خاندانوں کی جفاکشی اور مہم جوئی کو بڑا دخل ہے۔ اگرچہ علاقہ کی پوری زندگی مغربیت میں ڈوبی ہوئی ہے۔ تاہم گجرات کے جو مسلمان گھرانے آباد ہیں۔ بحمداللہ انھیں اپنی دینی زندگی اور شعائر اسلامیہ سے آج بھی پوری وابستگی ہے۔ جزیرہ میں جابجا خوشنما مسجدیں بھی ان لوگوں نے بنائی ہیں اور دینی ارشاد و رہنمائی کے لئے اکثر ہندوستان سے اپنے علمار اور بزرگوں کو بلاتے رہتے ہیں۔ چنانچہ کئی سال سے اُن کی یہ کوشش تھی کہ مفتی عتیق الرحمٰن صاحب ایک بار ری یونین تشریف لائیں۔ اور ان کے بصیرت افروز خطبات وخطابات سے جزیرہ میں بسنے والے مسلمانوں کو فیض حاصل ہو اسیٹھ ابراہیم بُلبلیہ۔ احمد انگار اور دوسرے مخلصین کی یہ کوششیں بارآور ہوئیں۔ اور ۱۹۷۰ء میں مفتی صاحب ری یونین تشریف لے گئے۔ جہاں ایک ہفتہ سے کچھ زیادہ قیام رہا۔ مختلف مقامات کی سیر بھی کی۔ اور بیشتر وقت دینی مواعظ اور مسائل حاضرہ پر اسلام کی انسانیت نواز رہنمائی کی وضاحت وتلقین میں گذرا۔ جگہ جگہ فرمائشی پروگرام ہوئے تقریریں ہوئیں۔ سوال وجواب ہوئے اور دین سے وابستہ ذہنوں کو اپنی پیاس بجھانے کا موقعہ ملا۔

مشرقِ وسطیٰ کا ایک یادگار سفر

اپریل ۱۹۶۶ء میں رابطہ عالم اسلامی کا ایک غیر معمولی اجلاس مرحوم و مغفور ملک فیصل کے ایماء پر بلایا گیا تھا جس کا اہم مقصد پوری دنیا میں اُمت مسلمہ کے مسائل و حالات پر دینی اُخوت کے تقاضوں کو بروئے کار لانا تھا۔ یہ معرکۃ الآرا اجلاس وسط ذی الحجہ میں خاص مکہ مکرمہ میں رکھا گیا تھا۔ کہ مختلف ممالک سے آنے والے وفود مناسکِ حج و زیارت سے بھی مشرف ہو سکیں۔ اجلاس کا افتتاح بھی مرحوم ملک فیصل نے خود اپنی ایک مہتم بالشان تقریر سے کیا تھا۔ رابطہ کے سکریٹریٹ نے مفتی صاحب کو براہِ راست اس اجلاس کی دعوت بھیجی تھی اور ساتھ ہی حکومت ہند سے بھی یہ چاہا تھا کہ مسلمانانِ ہند کی نمائندگی کے لئے اس اجلاس میں ایک منتخب وفد بھیجا جائے۔ چنانچہ وزارت خارجہ حکومت ہند نے غور و فکر کے بعد اس دعوت پر لبیک کہتے ہوئے اپنا وفد بھیجنے کا فیصلہ کیا جس کے ارکان مفتی صاحب، الحاج یونس سلیم صاحب، کلکتہ مدرسہ کے پرنسپل عبدالعلی برکتی صاحب اور ملک کے نامور وکیل اور اُس وقت دہلی کے میئر بیرسٹر نورالدین صاحب تھے۔ اور راقم السطور (انیس الحسن) وفد کا عربی ترجمان تھا۔ بیرسٹر صاحب وفد کے لیڈر بنائے گئے تھے۔ راقم السطور کو چونکہ بذات خود شروع سے آخر تک اس سفر میں اور اس کے تمام پروگراموں میں ساتھ رہنے کا موقعہ ملا تھا۔ اس لئے ذہن میں اس کی یادیں کچھ محفوظ رہ گئی ہیں۔ اور یوں بھی یہ سفر اپنے کوائف و لطائف کے لحاظ سے اس لائق تھا کہ اس کی رُوداد قدرے تفصیل سے بیان کی جائے۔

بیرسٹر صاحب۔ برکتی صاحب اور یونس سلیم صاحب کے لئے سفر حجاز کا یہ پہلا موقعہ تھا۔ اس لئے انھوں نے بھی مفتی صاحب کی رفاقت و رہنمائی کو اس مبارک سفر

باصرار واہتمام مفتی صاحب کو دعوت دی تھی ۔لیکن اپنی صحت اور بعض اہم مصروفیات کی وجہ سے مفتی صاحب یہ سفر نہ کرسکے تھے ۔اور فیڈریشن مذکور کو اپنا پیغام بھیجنے پر اکتفا رکیا تھا۔

ایک ہفتہ ری یونین میں

بحرِ ہند کے جنوب کا ایک سرسبز و شاداب جزیرہ "ری یونین" کہلاتا ہے جو فرانس کی نو آبادیات میں شمار کیا جاتا ہے ۔اس کی آبادی اور تجارتی ترقی میں گجرات کے بہت سے خاندانوں کی جفاکشی اور مہم جوئی کو بڑا دخل ہے ۔اگرچہ علاقہ کی پوری زندگی مغربیت میں ڈوبی ہوئی ہے ۔تاہم گجرات کے جو مسلمان گھرانے آباد ہیں۔ بحمداللہ انھیں اپنی دینی زندگی اور شعائر اسلامیہ سے آج بھی پوری وابستگی ہے ۔جزیرہ میں جابجا خوشنما مسجدیں بھی ان لوگوں نے بنائی ہیں اور دینی ارشاد و رہنمائی کے لئے اکثر ہندوستان سے اپنے علماء اور بزرگوں کو بلاتے رہتے ہیں۔چنانچہ کئی سال سے ان کی [illegible] کہ مفتی عتیق الرحمٰن صاحب ایک بار ری یونین تشریف لائیں۔ اور ان کے [illegible] خطبات وخطابات سے جزیرہ میں بسنے والے مسلمانوں کو فیض [illegible] بلبلیہ ۔احمد انگار اور دوسرے مخلصین کی یہ کوششیں بار آور ہوئیں [illegible] مفتی صاحب ری یونین تشریف لے گئے ۔جہاں ایک ہفتہ سے [illegible] مختلف مقامات کی سیر بھی کی ۔اور بیشتر وقت دینی مواعظ اور [illegible] کی انسانیت نواز رہنمائی کی وضاحت وتلقین میں گذرا [illegible] تقریریں ہوئیں ۔سوال وجواب ہوئے اور دین سے وابستہ [illegible] بجھانے کا موقعہ ملا ۔

❊ ——————— ❊

مشرقِ وسطیٰ کا ایک یادگار سفر

اپریل ۱۹۶۵ء میں رابطہ عالم اسلامی کا ایک غیر معمولی اجلاس مرحوم و مغفور ملک فیصل کے ایماء پر بلایا گیا تھا جس کا اہم مقصد پوری دنیا میں اُمت مسلمہ کے مسائل و حالات پر دینی اُخوت کے تقاضوں کو بروئے کار لانا تھا۔ یہ معرکۃ الآرا اجلاس وسط ذی الحجہ میں خاص مکہ مکرمہ میں رکھا گیا تھا۔ کہ مختلف ممالک سے آنے والے وفود مناسکِ حج و زیارت سے بھی مشرف ہو سکیں۔ اجلاس کا افتتاح بھی مرحوم ملک فیصل نے خود اپنی ایک مہتم بالشان تقریر سے کیا تھا۔ رابطہ کے سکریٹریٹ نے مفتی صاحب کو براہِ راست اس اجلاس کی دعوت بھیجی تھی اور ساتھ ہی حکومت ہند سے بھی یہ چاہا تھا کہ مسلمانانِ ہند کی نمائندگی کے لئے اس اجلاس میں ایک منتخب وفد بھیجا جائے۔ چنانچہ وزارت خارجہ حکومت ہند نے غور و فکر کے بعد اس دعوت پر لبیک کہتے ہوئے اپنا وفد بھیجنے کا فیصلہ ... کے ارکان مفتی صاحب، الحاج یونس سلیم صاحب، کلکتہ مدرسہ کے پرنسپل ... صاحب اور ملک کے نامور وکیل اور اُس وقت دہلی کے میئر بیرسٹر نورالدین ... اور راقم السطور (انیس الحسن) وفد کا عربی ترجمان تھا۔ بیرسٹر صاحب ... گئے تھے۔ راقم السطور کو چونکہ بذات خود شروع سے آخر تک اس سفر ... ہم ... کاموں میں ساتھ رہنے کا موقعہ ملا تھا اس لئے ذہن میں ... محفوظ رہ گئی ہیں ... یوں بھی یہ سفر اپنے ... لطائف کے ... تھا کہ اس کی رُوداد ... تفصیل سے بیان کی جائے۔

... صاحب ۔ برکتی صاحب اور یونس سلیم صاحب کے لئے سفر حجاز کا یہ پہلا ... تھا اس لئے انھوں نے بھی مفتی صاحب کی رفاقت و رہنمائی کو اس مبارک سفر

میں باعث خیر وسعادت سمجھا۔ روانگی سے ایک روز قبل وزارت خارجہ میں رسمی بریفنگ ہوئی اور ۵ اپریل کو ہم لوگ دہلی سے اڑ کر بمبئی پہونچے۔ اور وہاں کچھ دیر ٹھہر کر ایر انڈیا کی فلائٹ سے عدن روانہ ہو گئے۔

عدن پہونچے تو ایر پورٹ پر انڈین کمشنر اپنے اسٹاف کے ساتھ وفد کے خیر مقدم کے لئے موجود تھے۔ مگر وہاں اُترنے پر جب یہ معلوم ہوا کہ بیرسٹر صاحب کا سوٹ کیس جس میں ان کے کپڑے بھی تھے اور ضروریات سفر بھی، غلطی سے اس جہاز پر لادا ہی نہیں گیا، بلکہ کسی اور فلائٹ پر لوڈ ہو گیا۔ (جو تقریباً دو ماہ کے بعد بیرسٹر صاحب کو دہلی میں واپس دستیاب ہوا) تو بڑی تشویش ہوئی کہ ابھی غیر ملکی سفر میں ایک مہینہ گذارنا ہے اور بیرسٹر صاحب کا پورا سامان گم ہو گیا۔ صرف ایک شولڈر بیگ جس میں ان کی حمائل شریف تھی اور پاسپورٹ اور چشمہ، ان کے ہاتھ میں رہ گیا۔ ایر انڈیا کا عملہ بھی اس فروگذاشت پر بہت ہراساں تھا۔ اس کی طرف سے بھی، اور انڈین کمیشن کی طرف سے بھی باصرار پیشکش ہوئی، کہ بیرسٹر صاحب جس طرح چاہیں اور جتنی چاہیں رقم لے کر اپنی ضروریات خرید لیں، لیکن بیرسٹر صاحب نے کوئی پیشکش قبول نہ کی۔ اور اللہ کے بھروسہ پر سفر جاری رکھنے کا فیصلہ کیا ـــــ اس روز عدن میں کئی گھنٹے گذارے۔ شہر کی بھی سیر کی، اور پھر دوسری فلائٹ سے جدّہ روانہ ہو گئے۔ جہاں رابطہ کی جانب سے وفد کی پذیرائی اور ٹھہرنے کے اعلیٰ درجہ کے انتظامات تھے۔ رات آرام سے جدّہ میں گذاری۔ مگر سب ہی ارکانِ وفد کو اشتیاق تھا کہ جلد سے جلد مکہ مکرمہ پہونچکر زیارت بیت اللہ سے مشرّف ہوں۔ چنانچہ اپنے میزبانوں سے اصرار کر کے صبح ہی ہم سب کاروں کے ذریعہ بلد امین پہونچ گئے۔ اور عمرہ و زیارت بیت کی سعادت سے بہرہ مند ہوئے۔

دوسرے ممالک کے وفود بھی آچکے تھے۔ ہمارا قیام مکہ کے شبرا ہوٹل میں رہا، اور حج کے بعد فندق الحرمین میں منتقل ہو گئے۔ جہاں پہلے سے خالد کشمیر شیخ محمد عبداللہ

اور مرزا افضل بیگ بھی فروکش تھے۔

مناسکِ حج سے فراغت کے بعد بیرسٹر صاحب کے لئے یہ بڑا مسئلہ تھا کہ اپنے سائز کے کپڑے کیوں کر فراہم کریں۔ اس کو غیبی مدد ہی کہا جائے گا کہ دہلی کے ایک تاجر حاجی محمد موسیٰ رانی کھیت والے مل گئے۔ وہ حج کے لئے آئے ہوئے تھے اور بیرسٹر صاحب کے قدر دانوں میں سے تھے۔ انھوں نے جب سوٹ کیس کے گُم ہوجانے کا ماجرا سُنا، تو اپنے کئی جوڑ کپڑے پیش کردیئے جو بیرسٹر صاحب کے قد وقامت پر صحیح آگئے۔ ان دنوں انڈین سفارت خانہ میں میرے رفیق شفیق مولانا خالد سیف اللہ کلچرل اٹیچی تھے، اور شہاب الدین صاحب آئی ایف ایس فرسٹ سکریٹری۔ یہ دونوں پہلے ہی سے مفتی صاحب کے مخلص نیازمندوں میں سے تھے۔ اور قدرتی طور پر ہمارے وفد کے ساتھ انھیں غیر معمولی دلچسپی رہی۔ مولانا سیف اللہ تو اپنا کافی وقت ہم لوگوں کے ساتھ گذارتے تھے۔ اتفاق سے ان کی شیروانی بیرسٹر صاحب کے فِٹ آگئی اور اس طرح احرام کھولنے کے بعد بیرسٹر صاحب کے لئے کپڑوں کا کوئی مسئلہ باقی نہ رہا۔

درمیان میں یہ بھی لکھتا چلوں کہ زعیم کشمیر شیخ محمد عبداللہ اور ان کے دست راست مرزا افضل بیگ ان دنوں متعدد غیر ممالک کا سفر کرتے ہوئے حجاز مقدس پہونچے تھے۔ رابطہ کی طرف سے اُن کو اجلاس کی باقاعدہ دعوت دی گئی تھی۔ سیاست کی دنیا میں موسم جلدی جلدی بدلتے رہتے ہیں۔ شیخ صاحب سے اُن دنوں حکومتِ ہند کے روابط بڑی حد تک روٹھے ہوئے تھے اور خاص طور پر بیرونی دنیا میں جگہ جگہ ان کے بیانات اور کشمیر کے متعلق اپنے موقف کی وضاحت نے کشیدہ روابط کو تلخ تر بنا دیا تھا۔ چنانچہ نئی دہلی میں یہ طے کرلیا گیا تھا کہ شیخ صاحب کا انڈین پاسپورٹ اِمپاؤنڈ کردیا جائے۔ اور ہندوستانی سفیر کے ذریعہ اس فیصلہ کی اطلاع بھی شیخ صاحب کو مکہ مکرمہ میں دیدی

گئی تھی۔ انڈیا مخالف لابی اس صورت حال سے پورا پورا فائدہ اٹھانا چاہتی تھی۔ اس نے شیخ صاحب پر گھیرا ڈال رکھا تھا۔ اور پوری کوشش تھی کہ شیخ صاحب کو انڈیا اور کشمیر سے اُچک لیا جائے۔ جوں ہی وہ انڈین پاسپورٹ سرنڈر کریں، دوسری کوئی نیشنلٹی اُن کو پیش کر کے انڈین فورن پالیسی کو کھلی شکست دیدی جائے۔ اس وقت جو صورت حال تھی۔ اس میں کچھ بعید نہ تھا کہ شیخ صاحب کو اُچکنے کی کوشش کامیاب ہو جاتی، مگر بھلے ہی کو اس وقت مفتی صاحب اور بیرسٹر صاحب بھی وہاں موجود تھے ان دونوں حضرات سے شیخ صاحب اور مرزا افضل بیگ کی گفتگو اور مذاکرات کئی دن تک چلتے رہے اور شب و روز ملکی مسائل و مشکلات پر باتیں ہوتی رہیں، اور کھلے دل سے معاملات کے تمام پہلوؤں کا جائزہ لیا گیا۔ اور بالآخر مفتی صاحب اور بیرسٹر صاحب کے نقطۂ نظر اور مخلصانہ مشوروں سے متاثر ہو کر شیخ صاحب نے پوری پختگی کے ساتھ یہ فیصلہ کیا کہ وہ سعودی عرب سے ہندوستان ضرور واپس جائیں گے اور حکومت ہند کچھ بھی رویہ اپنائے وہ اپنی قومیت کو تبدیل نہیں کریں گے۔ چنانچہ رابطہ کے اجلاس سے فارغ ہونے کے بعد موصوف مئی کے وسط میں دہلی واپس آئے۔ اور جیسا کہ نظر آ رہا تھا دہلی ایرپورٹ پر اُترتے ہی بڑے وسیع انتظامات کے ساتھ ان کو گرفتار کر کے کوڈے کینال لے جایا گیا۔ اور نظر بند کر دیا گیا۔ مفتی صاحب نے اور بیرسٹر صاحب نے جس خیر خواہی وطن کے جذبہ سے شیخ صاحب کا ذہن بنانے کے لئے کامیاب محنت کی تھی۔ اس کے بعد حکومت ہند کا یہ سخت اور تنگدلانہ اقدام ہندوستان کے ان مخلص خیر اندیشوں کے لئے قدرتی طور پر تکلیف و ملال کا باعث ہوا۔ مگر ان مردانِ باوفا کے صبر و ثبات کو ہراساں نہ کر سکا۔ اور حکومت ہند کو بھی جلد یا بدیر اپنی غلط اندیشی کی تلافی کرنی پڑی۔ اور شیخ موصوف سے ہاتھ ملا کر ایک بار پھر کشمیر کی وزارت عظمیٰ انھیں کو سونپنی پڑی۔

———— ※ ————

بیتُ اللہ میں داخلہ کی اجازت

۱۴ ذی الحجہ سے رابطہ عالم اسلامی کے اجلاس شروع ہوئے۔ مندوبین مناسکِ حج سے فارغ ہو چکے تھے مگر یہ آرزو سب کے دلوں میں بیتاب تھی کہ ایک بار بیت اللہ کے اندر داخلہ کی سعادت سے مشرف ہوں۔ مرحوم ملک فیصل سے مندوبین نے جب اس دلی تمنا کا اظہار کیا تو شہید مرحوم نے بڑی خوشدلی سے منظور کیا۔ اور اس کے لئے نصف شب کا وقت مقرر کر کے ضروری انتظامات کر دیئے گئے۔ مفتی صاحب کی طبیعت اس دن ناساز تھی۔ اور میں نے دہلی کے رہنے والے ایک دوست کے ہاں مفتی صاحب کے لئے ہلکی کھچڑی پکوانے کا بندوبست کیا تھا۔ وہ عشاء کے بعد مفتی صاحب کو اپنی قیام گاہ لے گئے، اور کھانے کے بعد وہیں آرام کرایا مگر یہ طے کر لیا گیا تھا۔ کہ وقت مقررہ سے پہلے وہ دوست مفتی صاحب کو ساتھ لے کر حرم شریف آجائیں گے، تاکہ زندگی کی اس بے بہا اور بے اختیار نعمت عظمیٰ سے مفتی صاحب بھی بہرہ مند ہو سکیں۔ اِدھر ہم سب مقررہ وقت پر سرکاری اہتمام میں حرم پاک پہونچ گئے۔ کعبۃ اللہ کا دروازہ کھولا گیا۔ اور بیت اللہ کے آغوش میں وفور شوق سے اُبلتی ہوئی جبینیں سربسجود ہو گئیں۔ سب ہی کو زندگی کے ان حاصل لمحات اور بے حساب خوش بختی کا احساس تھا کم و بیش پندرہ بیس منٹ ہم سب نے اپنے پروردگار کے پیارے گھر میں گذارے، باہر آنے لگے تو بیرسٹر صاحب نے مجھے پکار کر پوچھا کہ مفتی صاحب آسکے یا نہیں، میں پھر لوٹا۔ اور کعبۃ اللہ میں نگاہ دوڑائی، تو بحمد اللہ سجدہ سے سر اُٹھاتے ہوئے مفتی صاحب کی ٹوپی مجھے نظر آگئی، میں نہیں کہہ سکتا اس وقت ان پر کیا کیفیات طاری تھیں۔ سہارا دیتے ہوئے میں اُن کو اپنے ساتھ باہر لایا۔ اور سب اپنی اپنی قیام گاہ واپس ہو گئے۔

———— ※ ————

رابطہ کانفرنس کے اختتام کے بعد فیصل مرحوم نے اپنے خاص محل قصر جدہ میں
میں تمام مہمانوں کی شاہانہ ضیافت کی اور مختلف ممالک کے وفود کو الگ الگ خصوصی
ملاقاتوں کا بھی موقعہ دیا۔ چنانچہ ہندوستان کا وفد بھی مقررہ تاریخ اور وقت پر ملک
موصوف کے ہاں باریاب ہوا۔ مفتی صاحب نے مختصر الفاظ میں ان کو ہندوستان آنے
کی دعوت دی۔ اور ملک موصوف نے خندہ پیشانی سے اس کے لئے آمادگی ظاہر کی۔
مگر افسوس کہ تھوڑے ہی دن بعد اُن کی شہادت کا دردناک حادثہ پیش آگیا۔

بہرحال مکہ مکرمہ میں اپنے پروگرام پورے کر کے ہمارا قافلہ رسول رحمت (صلی اللہ
علیہ وسلم) کے آستانہ قدسی پر حاضر ہوا۔ چند روز مدینۃ الرسول کی معطر و منور فضاؤں
میں گذارے۔ مفتی صاحب کے رفیق قدیم مولانا سید بدر عالم میرٹھی ثم المدنی۔ ان
دنوں علیل تھے۔ ان کے پاس حاضری ہوئی تو خوشی سے اُٹھ کر بیٹھ گئے۔ دیر تک بٹھایا
اور دوسرے دن باصرار دعوت پر بُلایا۔ نورالدین صاحب بھی مولانا موصوف سے
مل کر بہت ہی محظوظ ہوئے۔ ہمارے ساتھی یونس سلیم صاحب اور برکتی صاحب حرمین پاک
میں کچھ اور وقت گذارنے کے خواہشمند تھے۔ اس لئے وہ رُک گئے۔ میں مفتی صاحب، اور
بیرسٹر نورالدین صاحب کے ہمراہ سعودی عرب سے اُردن روانہ ہو گیا۔

اُردن کا سفر۔ مسجد اقصیٰ کی حاضری

جدہ سے پرواز کر کے ہم اُردن کی راجدھانی عمّان پہونچے تو والیٔ اُردن ملک حسین
کے کرم تواضع نے شاہی مہمان بنالیا اور عمان کے ایک قابل دید عالیشان ہوٹل میں جو
دَورِ حاضر کے پُر تکلف ساز و سامان اور آسائشوں سے بھرپور ہے، ہمیں ٹھہرایا گیا۔
ساتھ ہی مراسم ملکی (پروٹوکول ڈپارٹمنٹ) کی طرف سے ایک ڈپٹی سکریٹری مسٹر
نیشا شیبی کو مقرر کر دیا گیا۔ کہ شاہی اہتمام میں ہماری سیر و زیارت کے پورے پروگرام

میں ساتھ رہیں۔ اس روز خاص عمان شہر کی سیر کی۔ اور خاص خاص مساجد، مدارس اور تعلیم گاہوں کو دیکھا۔ اور اگلے روز القدس الشریف پہونچکر قبلۂ اولیٰ مسجد اقصیٰ کی زیارت سے بہرہ مند ہوئے۔ وہاں کم وبیش دو گھنٹے گذارے۔ محراب اقصیٰ میں اور صخرۃ المعراج پر نوافل ادا کئے۔ دعائیں مانگیں۔ مرحوم مولانا محمد علی جوہر کے مزار پر فاتحہ پڑھی۔ دیوار گریہ بھی دیکھی اور شہر القدس کی تنگ گلیوں کوچوں سے بھی گذرے۔ مسجد سیدنا عمرؓ کی زیارت کی۔ پھر القدس سے سیدھے بیت اللحم پہونچکر گہوارۂ مسیحؑ پر عقیدت و نیاز کی سلامی پیش کی۔ یہ حضرت عیسیٰؑ کی پیدائش گاہ ہے۔ اور یہاں شب و روز مسلمان اور مسیحی زائرین کا تانتا بندھا رہتا ہے۔ بیت اللحم سے واپسی میں برکہ سلیمانی اور کچھ دوسرے تاریخی آثار سے گذرتے ہوئے عمان واپس آئے۔ شب وہیں گذاری۔

مدینۃ الخلیل

اگلے روز ہم لوگ خلیل اللہ سیدنا ابراہیم علیہ الصلوٰۃ والسلام کے آبائی شہر الخلیل کی زیارت کے لئے نکلے۔ کیا ہی سرسبز و شاداب کتنا پُرسکون اور پُر کیف شہر ہے یہ، سبحان اللہ، جہاں پروردگار دوعالم کی رحمت برستی ہوئی آنکھوں کو نظر آتی ہے۔ خانوادۂ ابراہیمی کے کتنے ہی انبیاء و رسل کی پاکیزہ روحیں اس شہر کی خاک پاک میں آسودۂ رحمت ہیں۔ جہاں ہم نے بہزار عقیدت و نیاز، دعائیں کیں اور زیارتوں سے مشرف ہوئے۔

دمشق اور بیروت

اُردن کا پروگرام کرکے ہم عمان سے سیدھے بیروت پہونچے وہاں بھی انڈین سفارت خانہ نے قیام اور نقل و حرکت کے لئے ضروری انتظامات کر رکھے تھے۔ بیروت میں تین دن قیام رہا۔ خاص شہر بیروت اور اس کے قرب و نواح کی صاف ستھری اور سجی بنی بستیوں کی سیر کی۔ بیروت سے تھوڑے فاصلہ پر بعلبک کی پرانی آبادی ہے جہاں سنگ تراشی کے دیوہیکل نمونے اور دور اصنام پرستی کے قدیم آثار شکستہ حالت میں آج بھی موجود ہیں۔ چند گھنٹے

وہاں بھی گذارے۔ خود بیروت کو مشرق وسطیٰ کا عروس البلاد کہا جاتا ہے۔ اور واقعی یہ شہر اور اس سے متصل دُور تک پہاڑوں پر پھیلی ہوئی آبادیاں اپنی آب وتاب اور دَورِ حاضر کے لوازماتِ عیش وعشرت میں فرانس اور سوئٹزر لینڈ کا مقابلہ کرتی ہیں۔

یوں بھی قدرت نے ارضِ فلسطین کے ان خطّوں کو جو آج چھوٹے چھوٹے متعدد ملکوں میں تقسیم ہو کر رہ گئی ہے۔ اپنی بخششوں سے خوب خوب نوازا ہے۔ تمام علاقہ نہایت زرخیز، سرسبز و شاداب۔ پھلوں پھولوں سے لدا ہوا، اُونچے نیچے سبزہ پوش پہاڑوں، صاف شفاف پانی کے جھرنوں اور سرد آب وہوا کے لحاظ سے جنت ارضی کہا جاتا ہے۔ پورے علاقہ کی زبان، لب ولہجہ کے اختلاف کے ساتھ عربی ہے۔ اور بیشتر آبادی مسلمانوں کی، دوسرے نمبر پر عیسائیوں اور کچھ یہودیوں کی ہے۔ مگر اپنی قدیم تہذیب وتمدن کو چھوڑ کر سب ہی مغربی تمدن کو اپنا چکے ہیں۔

بیروت سے دمشق کا فاصلہ لگ بھگ ۷۵ کلومیٹر کا ہے۔ یہاں تک آنے کا اصل مقصد بھی لبنان سے زیادہ دمشق کی زیارت کرنا تھا۔ چنانچہ اسی دوران کار کے ذریعہ ہم لوگ دمشق بھی گئے۔ جو اُموی خلافت کا مرکز اور عرب تاریخ میں علم وتہذیب کا گہوارہ رہا ہے۔ آج بھی یہ ملک شام (سیریا) کا دار السلطنت ہے۔ اور اپنے قدرتی حسن و جمال باغات۔ اور مہکی ہوئی فضاؤں میں دنیا کے منتخب شہروں میں شمار کیا جاتا ہے۔

مفتی صاحب کے رفیق قدیم الحاج مسعود احمد صدیقی صاحب جنھوں نے اپنی عمر عزیز بیشتر فورن سروس میں گذاری۔ برسوں سعودی عرب بھی رہے۔ یورپ کے مختلف ملکوں میں بھی وقت گذارا، اِن دنوں سیریا کے ہندوستانی سفارت خانہ میں مدار المہام تھے۔ ٹیلی فون پر اُن کو پروگرام کی اطلاع کردی گئی تھی۔ اپنے ان جانے پہچانے مہمانوں کی آمد سے بہت خوش تھے۔ خود ساتھ رہ کر دمشق کی سیر کرائی۔ دوپہر کو اپنے بنگلہ پر لنچ کا اہتمام بھی کیا۔ اور بیروت تک واپسی کے لئے اپنی مرسی ڈیز کار بھی پیش کی۔

دمشق کے اسلامی آثار میں سب سے اہم جامع اُموی ہے۔ اس روز ظہر کی نماز ہم نے اسی بابرکت مسجد میں ادا کی جس کے ایک گوشہ میں تاریخ اسلام کا نامور مجاہد اور فتحمند غازی سلطان صلاح الدین ایوبی آسودۂ رحمت ہے۔ اُن کی قبر پر فاتحہ پڑھی، اور اُن کے سرہانہ رکھا ہوا قرآن پاک کا وہ نسخہ بھی دیکھا جو سلطان مرحوم تلاوت کیا کرتے تھے۔ جامع اُموی کے ایک دروازہ میں ایک گول دائرہ کا چھوٹا سا مدفن ہے جس کے بارے میں عام طور پر بتایا جاتا ہے کہ یہاں سیدنا حسین رضؓ کا سر دفن ہے جو کربلا میں شہادت کے بعد یزید ابن معاویہؓ کی ہدایت پر دمشق لایا گیا تھا۔ جامع اُموی سے متصل ہی دمشق کی مشہور مسقّف مارکیٹ سوق حمیدی ہے، جہاں شامی مصنوعات اور خاص طور پر شامی سلک کے کپڑے بکتے ہیں۔ اس مارکیٹ سے گذرتے ہوئے کچھ مختصر سی شوپنگ کر کے مشہور مفسر و فیلسوف اسلام فخر الدین رازی کی قبر پر گئے۔ فاتحہ پڑھ کر سیدھے الشیخ محی الدین ابن العربی کی درگاہ پہونچے جو شیخ موصوف سے منسوب مسجد جامع الشیخ کے ایک گوشہ میں واقع ہے اور دن رات زائرین کی آمد و رفت سے آباد رہتی ہے۔

یہاں کافی دیر تک قیام رہا۔ مفتی صاحب خاص طور پر شیخ مرحوم کی تصنیفات اور علوم دینیہ میں ان کے بیش قیمت کنٹری بیوشن کا تذکرہ کرتے رہے۔ مفتی صاحب نے یہ بھی فرمایا کہ میں نے اپنے بزرگوں سے اس مزار پاک کی برکتوں کے متعلق یہ بھی سُنا ہے کہ شیخ کی قبر پر فاتحہ پڑھنے کے بعد دعا کی جائے تو منجانب اللہ قوت حافظہ کی نعمت عطا ہوتی ہے۔ دل بہت چاہتا تھا کہ اس بارونق اور پُرفضا علاقہ میں اور کچھ دن گذارنے کا موقعہ ملے لیکن سفر کے شب و روز میں پورا ایک مہینہ گذر چکا تھا۔ اور اسی روز شب کی فلائٹ پر ہمیں دہلی واپس ہونا تھا۔ اس لئے پروگرام کو مختصر کر کے دمشق سے بیروت واپس ہوئے اور ۴ر مئی کو علی الصباح دہلی پہونچ گئے۔

قسط ۔ ۲

فلسطین کی ممتاز شاعرہ: فدوی طوقان

حقانی القاسمی، نئی دہلی

وہ خود لکھتی ہیں! ..... وھکذا ظللت کتاباتی للشعر أسیرۃ الحالات العاطفیہ والنفسیہ التی تباعت فجاۃ - وقد ذھب فجأۃ ولم اعرف الاحساس الذی الم بالواقع واذا لتصاق الوجدانی الملازم بالقضیۃ الجماعیۃ الا بعد حرب حزیران"۔[۸]

گوکہ ایک زمانے تک ظاہری طور پر سیاست سے دور رہیں مگر دل ودماغ میں عرب قوم کا مسئلہ ہمیشہ گونجتا رہا۔ اس کے بارے میں وہ اپنی ڈائری میں اس کی وضاحت یوں کرتی ہیں:

وہ (اجنبی دوست) مجھ سے کہنے لگا: "میرا خیال تھا کہ تم عرب ملکوں کے موجودہ حالات کے بارے میں ایک رواقی قسم کی بے نیازی (لامبالاۃ) میں مبتلا ہو!" میں نے جواب دیا "سیاست کے اس ہنگامے سے کنارہ کشی اور اس میں عدم شرکت کے معنیٰ یہ تو نہیں ہیں کہ میں سیاسی حالات کے بارے میں بے حس ہوں۔

[۷] فدوی طوقان: "مرائی فی الحیاۃ" مجلہ "الدوحہ" (مایو ۱۹۸۴ء)

[۸] ______ ،

میں اس لعنت کو، جو ہمارے سروں پر چھائی ہوئی ہے بسر نہیں کر رہی۔ میں بھی دوسرے لوگوں کی طرح، جن کی تعداد خاصی زیادہ ہے، یہ کوشش کرتی ہوں کہ اس عرب تجربے کی گہرائیوں میں اتر کر اپنے فن کے لئے کوئی بنیادیں ڈھونڈھ نکالوں، لیکن میں اس میں عاجز اور ناکام رہتی ہوں۔ دراصل ہم اپنے اردگرد کی حقیقت کے سامنے دم بخود ہیں۔ اور ایک دکھے ہوئے دل کی جلن کے ساتھ ہم اپنے آس پاس ہونے والے واقعات میں معانی تلاش کرنے کی کوشش کرتے ہیں لیکن کر نہیں پاتے یہ "حقیقت" جسے ہم بسر کر رہے ہیں، اس کا حاصل دکھ اور ہلاکت کے سوا اور کچھ نہیں، اور ہمیں زندگی کے ہر ہر لمحے میں اس نامسعود "حقیقت" کے ساتھ نباہ کرنا پڑ رہا ہے۔ [۹]

اس لئے وداد سکاکینی کا یہ خیال صحیح ہے کہ اپنی خاندانی وجاہت اور سکون و مسرت کے باوجود وہ مینارۂ عاج (IVORY TOWER) میں مقید نہیں ہیں، بلکہ معاشرہ کے انقلابی تحریکوں کے دوش بدوش رہیں [۱۰] اور اپنے قومی شعروں سے لوگوں کے سوئے ہوئے جذبات میں بیداری کی لہر دوڑائی۔۔ یہ اس وجہ سے ہے کہ ایک شاعر نہ تو خلاء میں زندگی بسر کر سکتا ہے اور نہ ہی مینارۂ عاج میں۔ کیونکہ اس کی پیدائش بنیادی طور پر ایک سماجی مظہر (social phenomenon) ہے اور ہر شاعر پہلے آدمی بعد میں شاعر ہوتا ہے۔ علاوہ ازیں شاعری بذات خود علیحدگی پسندانہ شئی نہیں ہے بلکہ اس کا سماج اور معاشرے سے گہرا ارتباط ہے۔ شاعر کا بنیادی منصب سماجی اقدار و تصورات کو بدلتے ہوئے سماجی نظام سے مربتط کرنا اور دونوں نظاموں میں مفاہمت ہم آہنگی اور موزوں تبدیل پیدا کرنا ہے۔ فدوی طوقان نے بھی سماج کے ایک فرد کے ناطے عرب المیے کو اپنا کرب سمجھا اور اسے شاعری کا موضوع بنایا۔

۹۔ محمد کاظم، مضامین (لاہور، ۱۹۹۹ء) ص ۱۶۲

۱۰۔ وداد سکاکینی، انساء شہیرات فی الشرق والغرب (القاہرہ: ۱۹۵۰) ص ۷۹

گو کہ کبھی نفسیاتی و وجودی کشمکش کی وجہ سے اس سے بے تعلق رہیں۔ مگر بنیادی طور پر وطن سے محبت اور رشتہ ہمیشہ برقرار رہا۔ فدوی کہتی ہیں: "میں نے آج فیروز کا ایک نیا گیت "القدس کی پرانی گلیوں!" سنا۔ فیروز کی آواز ہمیں یہ احساس دلاتی ہے کہ ہماری زندگی کو ثبات حاصل ہے، اور حالات ہمیں کیسے ہی تہس نہس کیوں نہ کر دیں اس زمین کے ساتھ ہمارا رشتہ ہمیشہ قائم رہے گا۔[۱]

(۲)

فدوی طوقان عرب دنیا کی ان معدودے چند خواتین شاعرات میں سے سمجھی جاتی ہیں، جن کی شاعری کو خاص امتیاز حاصل رہا ہے۔ اور یہ خواتین کے ادبی حلقوں میں نسوانی احساسات کی ایسی نمائندہ شاعرہ جانی جاتی ہیں جو پردے سے نکل کر روشنی، آزادی اور ثقافت کی دنیا میں داخل ہوئی ہیں، جو یونانی شاعرہ سافو اور عرب شاعرہ خنساء کی صفات سے متصف ہیں۔

ان کے اب تک کے شعری مجموعوں میں وحدی مع الایام (۱۹۵۵ء) وجدتھا (۱۹۵۷ء) اعطنا حبا (۱۹۶۰ء) امام الباب المغلق (۱۹۶۷ء) اور اللیل والفرسان (۱۹۶۹ء) قابل ذکر ہیں۔

فدوی ایک جدت پسند شاعرہ ہیں۔ اور یہ اس وقت مکمل طور پر جدیدیت پسند (Modernist) شاعرہ کہلائیں، جب "اعطنا حبا" اور "وجدتھا" جیسے شعری مجموعے سامنے آئے۔ جس میں جدید عربی شاعری کے تمام فنی پہلو در آئے ہیں، پہلے مجموعے "وحدی مع الایام" میں انہوں نے عمومی انداز کے شعر کہے ہیں یعنی وحدت ابیات کا دارومدار تفعیلہ کے بجائے بحر پر رکھا ہے جس میں ہر بیت کی

---

[۱] محمد کاظم، مضامین، (لاہور ۱۳۹۹ھ) ص ۱۵۵۔

ایک علیحدہ کامل وحدت ہے۔ قصیدے کے دس ابیات کے دس مختلف معانی ہیں۔ اور ہر وحدت قائم بالذات ہے۔ اس مجموعے کے قصیدوں میں "وحدت کاملہ" نہیں پائی جاتی، یعنی ایک بیت یا دو ابیات کے حذف کر دینے کے باوجود قصیدے کی معنویت مطلقاً اثر انداز نہیں ہوتی ہے۔ یہاں تک کہ اگر ایک قصیدے میں صرف ایک بیت یا دو تین ابیات رہ جائیں تب بھی وہ فدوی کے مطلوبہ مقصد کو پورا کرنے کے لئے کافی ہیں اس کے باوصف کہ ہر قصیدے کا عنوان ہوتا ہے، جو کہ نئی شاعری کی خصوصیت ہے۔ جبکہ قدیم شعروں میں متعین عنوانات کے تحت قصیدے نہیں لکھے جاتے تھے۔ [۱۲]

مذکورہ دیوان کے بیشتر قصیدوں کی بنیاد قصیدے کی وحدت کے بجائے بیت کی وحدت پر ہے۔ جسکی وجہ سے زیادہ تر قصیدے جدید عربی شاعری کی اہم خصوصیات سے عاری و خالی ہیں۔ مثال کے طور پر "ازدحام فی الزیتون" میں کسی قسم کی فنی وحدت نہیں ملتی ہے۔ ہر بیت کے معنی مابعد والے بیت سے مختلف اور الگ ہیں۔ پہلے بیت میں وہ کہتی ہیں:

هنا؟ هنا في ظل زيتونة ✻ تحطم الروح قيود الثرى

یہ اپنے معنی کی تکمیل کے لئے اس بیت ثانی کا محتاج نہیں ہے۔

وتطلع النفس الى غزلة ✻ يغفو فيها الصمت لغو الورى

"وجدتها" میں فدوی نے بیشتر قصیدوں میں عمودی روایتی ہیئت سے انحراف کرتے ہوئے وحدت قصیدہ کو پیش نظر رکھا ہے۔ ان میں مکمل فنی وحدت بھی

۱۲۔ شاکر النابلسی، فدوی تشتبک مع الشعر (جدہ، ۱۹۸۵) ص ۱۳

پائی جاتی ہے۔ اس طور پر کہ ایک حرف حذف کر دینے کی وجہ سے بھی قصیدے کی مکمل فنی وحدت ختم ہو جاتی ہے۔ "الندم" اس کی نمایاں مثال ہے [13]

فنی وحدت کے ساتھ "ارتکاز" بھی جدید عربی شاعری کی ایک اہم خصوصیت ہے، جس کا کلی دار و مدار اس کیفیت / کمیت پر ہے جو وجدانی پہلوؤں کیساتھ کشمکش میں ذات تک پہونچتی ہے۔ اور ارتکاز کا تجربہ دراصل وہ لفظی اجتماع ہے جس سے قصیدے تشکیل پاتے ہیں، اور اس کے لئے ضروری ہے کہ وہ اس متعلقہ نقطے میں جمع ہوں۔ جس سے فکری، ثقافتی، فنی، معاشرتی اور تہذیبی پہلوؤں کی شعاعیں پھوٹتی ہیں۔ اس لحاظ سے دیکھا جائے تو فدوی صرف ایک رومانی شاعرہ نظر آتی ہیں جو اپنے تجربات بہت سادگی سے بیان کرتی ہیں جس میں گہرائی نہیں ملتی، رومانوی سے مراد یہ ہیکہ ان کے بیشتر موضوعات محبت، فراق اور پشیمانی کے ارد گرد گھومتے ہیں۔ اور یہ خصوصیات ایسی ہیں جو اعلیٰ سطح پر ارتکاز کے محتاج نہیں ہیں۔ گو کہ کچھ قصیدے اس طرح کے ضرور ہیں جن میں کامل توجیہ و تاکید پائی جاتی ہے: "وحدی مع الایام" میں سطحی فنی تجربات ہیں۔ اور زیادہ تر قصیدے فکری، ثقافتی پس منظر سے عاری ہیں۔ اس لئے یہ جدید عربی شاعری کی ایک اہم خصوصیت "ارتکاز" سے محروم ہیں [14]

فدوی جزوی تصویروں پر اعتبار کرتی ہیں اور کون و وجود کی جامع تصاویر میں اسے شامل نہیں کرتیں اس لئے رومانوی انداز سے ایسی تصویر پیش کرتی ہیں۔

---

[13] تفصیل کے لئے دیکھئے، شاکر النابلسی: "فدوی تشتبک"، ص ۱۷

[14] شاکر النابلسی؛ فدوی تشتبک مع الشعر، ص ۱۹۔

جس میں سادگی، درخشانی ہو اور جو گہرے انسانی مدلولات سے بوجھل نہ ہو۔

اس سے اس بات کا بھی اشارہ ملتا ہے کہ فدوی کے پاس کوئی خاص انسانی مسئلہ نہیں ہے یا کوئی ایسا فلسفیانہ فکری یا اخلاقی مسئلہ نہیں ہے جو کہ تپش، ٹیس، ارتکاز اور کامل توجہ کا محتاج ہو جبکہ ان کے معاصر شاعروں میں سے صلاح عبدالصبور، عبدالمعطی حجازی، بدر شاکر السیاب، عبدالوہاب البیاتی، خلیل حاوی، احمد سعید ادونیس کے یہاں اس کی مثالیں بکثرت موجود ہیں۔ ان تمام شاعروں کے یہاں واقعیت، مثالی فکر، ناستلجیائی (Nostalgiac) کیفیت فلسفہ انکار و بغاوت، اور اساطیر ملتے ہیں۔ اور فدوی کا دیوان صوفیانہ خیالات اور رومانوی تصویروں کا ایک مجموعہ نظر آتا ہے [۱۵]

دوسرے دیوان (وحدھا) میں انہوں نے صوفیانہ آستانے سے چلتی پھرتی دنیا کی طرف لوٹنے کی کوشش کی ہے۔ گو کہ اس تبدیلی میں بھی گہری توجہ شامل نہیں ہے، اس دیوان میں رومانوی افکار و خیالات کی کثرت ہے۔ یہاں تک کہ ان کا قصیدہ "وحدھا" کو جسے توجہ وارتکاز کی وجہ سے سب سے عمدہ تصور کیا جاتا ہے، اگر وجودی مسئلے پر مشتمل کسی جدید عربی قصیدے کے مقابلے میں رکھا جائے تو اس میں بھی عدم ارتکاز کی صفت در آئے گی، شاکر نابلسی کے خیال میں "فدوی طوقان کے مشقت کے تجربات میں توجہ اور گہرائی اس وجہ سے نہیں ہے کہ وہ بدر شاکر السیاب اور خلیل حاوی کی طرح اپنے شعروں میں اسطوری عناصر کا استعمال نہیں کرتیں، یا حد سے بڑھی ہوئی رومانویت

---

[۱۵] شاکر النابلسی: فدوی تشتبک مع الشعر، ص ۱۸-۲۰)

سے خود کو دور نہیں رکھتی ہیں۔ جیسا کہ صلاح عبد الصبور اور عبد المعطی حجازی نے کیا ہے۔ حد سے بڑھی ہوئی یہی رومانویت ہی دراصل گہرائی اور فنی ارتکاز کے خلاف ہے[16]

فدوی ایک رجائیت پسند شاعرہ ہیں جو اپنی محبت کے راستے پر بہت دور تک چلتی ہیں۔ کیونکہ وہ اس مستقبل پر یقین رکھتی ہیں جو ماضی اور حال کی تلخیوں سے بہتر ہو گا۔ ان کے یہاں شعری فضا زندگی کے ماحول سے ماخوذ ہے اور دونوں کے درمیان گہرا ربط ہے۔ اور یہی تعلق حیاتیاتی تجربے اور فنی تجربے کو ہم آہنگ آوازوں کے انضمام پر مجبور کرتا ہے۔ وہ اس بات سے واقف ہیں کہ شعری ماحول میں کسی کلمہ کو عام کرنے کے لئے کیا کیا جائے، چنانچہ (بعد عشرین عاماً) میں جہاں کی نفسیاتی فضا سیاہ اور غمگین ہے۔ اور شاعرہ بیس سال بعد اس وقت کی تصویر کشی کر رہی ہے۔ جبکہ جوانی ڈھل چکی ہے زندگی کے بہار مرجھا چکے ہیں، تو شاعرہ نے وہی کیفیت پیدا کرنے کے لئے ایک زمانی پہلو اختیار کیا، جس میں ہر چیز الم ناک نظر آتی ہے۔ آسمان سیاہ اور مہیب بادلوں سے گھرا ہوا ہے۔ اور اس کے نیل گوں پن کو اس سیاہی نے ڈھانپ رکھا ہے اور یہ زمانی پہلو سردی ہے جس سے شاعرہ کی مراد غمگینی اور رنج والم ہے۔ اس سیاق وسباق میں دیکھا جائے تو فدوی کے اندر جدید شاعری کی تمام تر صلاحیتیں نظر آتی ہیں۔ اور انہوں نے بتدریج جدید عربی شاعری کے تمام فنی نقوش ظاہر کئے ہیں جو ان کے تین دواوین پر محیط ہیں۔ اور ان تینوں کے بعد وہ مکمل طور پر جدید شاعرہ کہلانے کی مستحق ہیں[17]

---

[16] شاکر النابلسی؛ فدوی تشتبک مع الشعر، ص ۲۱، ۲۳۔

[17] " " " ص ۲۸، ۳۲۔

(۳)

محبت فدوی کے نزدیک ایک عام انسانی مسئلہ ہے۔ اپنے تینوں دواوین میں انہوں نے محبت کے سلسلے کے مختلف تجربات بیان کئے ہیں۔۔۔ (وحدی مع الایام) میں وہ آغاز جوانی یا مراہقت کے دور کی محبت کے اوّلین نقوش کو واضح کرتی ہیں۔ اور خود کو مشتعل جذبات اور مضطرب احساسات کا مجموعہ سمجھتی ہے۔ اس مرحلے میں ان کی پہلی خواہش کسی غمگسار اور رفیق کی تلاش تھی، جو انہیں تنہائی، گوشہ نشینی (loneliniou) اور اس عذاب سے نجات دلائے جوان کے وجود کو کھائے جارہا ہے۔ ہر قصیدے میں اپنی تنہائی کی شکایت خاموشی کے ساتھ کرتی ہیں۔ اور اپنے احوال واقعی کے اظہار کے لئے اس بچی کا مرثیہ پڑھتی ہیں جو بغیر کسی رفیق کے اس دنیا سے تنہا گزر گئی جسے یاد کرنے والا کوئی بھی نہیں:

الصمت والظل وافکارھا

رفاقھا والسرحة الحانیه

فاذا؟ تموتین؟ فواحسرتاہ

علیٰ عروس الروض بنت الربیع

تلاش کی اس منزل میں فدوی جوان دوشیزاؤں کی طرح کسی رفیق کی تلاش کو پہلا مسئلہ مانتی ہیں۔ اور اسے سب سے حسین خواہش قرار دیتی ہیں۔ اس مرحلہ میں جب فدوی ناکام ہوگئیں تو اپنی ذات کی طرف لوٹ گئیں، اور اس مسئلے کو بھولنے کی ہر ممکن تدبیر کرتی ہیں۔ اپنے وجود کو عالمی اور کائناتی پہلوؤں میں منضم کی کوشش کی تاکہ وہ یہ بھول جائیں کہ وہ ایک عورت ہیں، تنہا ہیں اور عذاب سہہ رہی ہیں۔ ایک ایسے مرد کی تلاش میں ہیں جو اس کی زندگی کو خوشگوار کر دے چنانچہ غم اور ناکامی بھلانے کی خاطر فطرت کی آغوش میں پناہ لیتی ہیں۔"

(باقی صفحہ پر)

تبصرہ

نام کتاب : کتاب المعلم (دروس اللغۃ العربیۃ لغیر الناطقین بھا)

تالیف : الدکتور ف۔ عبد الرحیم۔

ناشر : اسلامک فاؤنڈیشن ٹرسٹ، مدراس ۱۲

قیمت : پہلا حصہ (۳۰) روپے، دوسرا حصہ (۳۶) روپے تیسرا حصہ (۵۰) روپے

صفحات : پہلا حصہ (۵۷) دوسرا حصہ (۱۳۱)، تیسرا حصہ (۹۰)

یہ کتاب مصنف کی کتاب "دروس اللغۃ العربیۃ" کیسے پڑھائی جائے، اس موضوع پر ہے۔ مصنف کا نام جنوبی ہند کے طریقہ پر وی عبد الرحیم تحریر ہے (وی) کس کا اختصار ہے واللہ اعلم، (V) کو عربی رسم الخط میں (ف) تحریر کیا گیا ہے، جو غالباً درست نہیں ہے، مزید یہ کہ اردو کے اخبار (دعوت، دہلی) ۱۹-۱۰-۱۹۹۵ء میں بھی مصنف کا نام "ف۔ عبد الرحیم" ہی آیا ہے۔

ہمارے یہاں (V) اور (W) میں کوئی فرق نہیں کرتے، دونوں کے لئے (و) ہی سے استعمال کرتے ہیں لیکن عربی میں (V) کو تین نقطے والی فا (ڤ) اور (W) کو (و) لکھتے ہیں، اس لئے کتاب میں عربی رسم الخط میں اصل نام کا پہلا حرف عربی حروف تہجی کے مطابق ہونا چاہیئے تھا۔ ہمارے یہاں عام طور پر وَقار (بفتح الواو) کو غلط طور پر وِقار لکھنے کا رواج ہے جیسے بہت لوگ انگریزی میں (VIKAR) لکھتے ہیں، چنانچہ

Vikaruddin نام کے ایک صاحب کے نام دعوت نامہ میں ایک عرب نے ان کا نام ڤیکارالدین لکھا کیونکہ کوئی بھی عرب اس اسپیلنگ کے ساتھ اس کو وقارالدین نہیں پڑھ سکتا۔

حقیقت میں تو ان ہدایات برائے معلم کا بہتر مطالعہ اس وقت ہو سکتا تھا جب اصل کتاب "دروس اللغۃ۔۔۔" بھی ساتھ میں ہوتی لیکن ایسا نہ ہو سکا، مجھے صرف مکتبۃ الشباب الاسلامیہ لکھنؤ کے شائع کردہ دروس اللغۃ۔۔کے دو حصے پائے جس میں (۶+۶) = ۱۲ سبق ہیں جبکہ کتاب المعلم کے مطابق پہلے حصہ میں (۱-۲۳) دوسرے میں (۱-۳۱) اور تیسرے میں (۱-۳۴) اسباق ہیں مکتبۃ الشباب کا ایڈیشن چھپائی کے اعتبار سے خراب ہے جو مبتدیئن کے لئے مناسب نہیں، امید ہے کہ یہ کتاب مصنف کی تقسیم کے مطابق اسلامک فاؤنڈیشن مدراس سے چھپی ہو گی جس کا معیار طباعت "کتاب المعلم" سے کم نہ ہو گا۔

کتاب کے مصنف عرصۂ دراز سے درس و تدریس سے وابستہ ہیں مزید برآں ۱۹۶۹ سے جامعہ اسلامیہ مدینہ منورہ میں اپنے میدان میں کام کر رہے ہیں، اور فی الحال مرکز الترجمۃ العربیہ میں خدمات انجام دے رہے ہیں (کچھ مزید تفصیل کے لئے دیکھئے مذکورہ اخبار "دعوت")

تدریسی کتاب لکھنے والے کے کچھ نظریات ہوتے ہیں اور اسلوب و مقاصد کی وضاحت، اس مثل کے مطابق " أھل مکۃ أدری بأشعابھا" اہل مکہ اپنی وادیوں کے بارے میں زیادہ واقف کار ہوتے ہیں، خود مصنف ہی اچھی طرح سے کر سکتا ہے، اس لئے یہ کتاب ان مدرسین کے لئے بہت مفید اور ضروری ہے جو اس کتاب کو پڑھا رہے ہیں۔ یہ کتاب حقیقت میں اچھی کوششوں میں ہے جو ہندوستانی علماء عربی

تدریس کو بہتر بنانے کے لئے کر رہے ہیں۔ کتاب کافی اچھے انداز میں لکھی گئی ہے، مصنف نے اپنے طویل تجربہ سے مستفید کرنے کی کوشش کی ہے، اگرچہ مصنف کی ہر رائے سے اتفاق نہیں کیا جاسکتا، پھر بھی عربی تدریسی میدان کے لوگوں کو اپنے تجربات کے ساتھ ساتھ اس کتاب اور اس جیسی کتابوں سے مستفید ہونا چاہیئے، آجکل اس موضوع پر یعنی غیر اہل زبان کو عربی پڑھانے کے موضوع پر کافی کتابیں دستیاب ہیں، سعودیہ کی وزارت تعلیم نے بھی اس موضوع پر بڑی اچھی (کتاب المعلم) کے ساتھ کئی جلدوں میں شائع کی ہے۔

ہندوستان میں عربی کی تدریس کی تاریخ بہت پرانی ہے، لیکن منظم طور پر عربی پڑھانے کا رواج شاذ و نادر ہی رہا ہے چونکہ یہ خدمت انجام دینے والے اکثر وبیشتر مدارس اسلامیہ یا اس سے وابستہ حضرات ہی رہے ہیں اور ان کا مقصد براہ راست زبان کبھی بھی نہیں رہا اس لئے عربی بھی عملاً علوم آلیہ ہی میں شمار ہوتی رہی، عربی پڑھانا ہمارے یہاں کوئی فن نہیں بلکہ پڑھانے والے کے رجحان و خیالات پر منحصر ہے ۸-۷۷،۱۹ کی بات ہے کہ ایک اردنی سفارت کار نے جن کی "ہندوستان میں عربی" پر بڑی گہری نظر تھی، اور انھوں نے روس میں تعلیم حاصل کی تھی، مجھ سے دریافت کیا تھا آخر کیا بات ہے کہ آپ کے یہاں لوگ دس دس سال تک عربی مدارس میں تعلیم حاصل کرتے ہیں اور عربی کی دس سطر صحیح نہیں لکھ سکتے اور نہ گفتگو کر سکتے ہیں، جبکہ روس میں دو تین سال کا کورس کرنے کے بعد طلبہ بڑی اچھی عربی بولنے لگتے ہیں، میرا جواب یہی تھا کہ مدارس کا اصل مقصد اسلام کی خدمت کے لئے کادر (Cadre) کارکن، اہل کار) تیار کرنا ہے اور چونکہ ان کا میدان عمل خطۂ ہند و پاک ہوتا ہے اس لئے ان کے لئے اتنا کافی ہوتا ہے کہ وہ اسلامی عربی نصوص سمجھ کر اپنے اہل وطن کو سمجھا دیں، بلکہ انکو عربی

نصوص کو سمجھنے کی بھی ضرورت نہیں ہوتی، مقامی زبانوں میں اسلامی مواد کی بنیاد پر بھی وہ کام چلا لیتے ہیں، ان کی ضرورت کا دارو مدار فراغت کے بعد ملنے والی ملازمت یا اختیار کرنے والے پیشے پر ہوتا ہے، کسی بھی مشہور یا گمنام بڑے یا چھوٹے مدرسہ کو لے لیجئے، فارغ ہونے والوں میں بڑی تعداد صحیح عربی نہ جاننے والوں کی ہوتی ہے۔

یہاں ان کوششوں کو نظر انداز نہیں کیا جا سکتا جو بعض اداروں یا جامعات نے کی ہیں اور اپنے نصاب کے اندر مختلف تبدیلیاں کی ہیں لیکن ابھی تک بہت کام باقی ہے۔ پڑھانے کے ترقی یافتہ وسائل کا استعمال ہمارے یہاں نہ ہونے کے برابر ہے، ہمارے یہاں عربی پڑھانے کے لئے لیبارٹریز اور کیسٹس کا استعمال کہاں ہے، عربی سن کر سمجھنے کی مشق کہاں کرائی جاتی ہے جو آجکل کے دور میں ترقی یافتہ زبانوں کے پڑھانے کے اہم وسائل ہیں۔ بلکہ ہمارے یہاں تو اچھے عربی داں بھی یائے مقصورہ اور عام یا کے لکھنے میں کوئی فرق نہیں کرتے بلکہ درسی کتابوں میں بھی ان کے درمیان کوئی فرق نہیں کیا جاتا، مثال کے طور پر دیکھئے " دروس اللغة العربية الخ مطبوعہ مکتبہ الشباب، لکھنؤ، جس کے پڑھانے کی ہدایت میں یہ کتاب لکھی گئی ہے۔ یہی نہیں بلکہ ابھی تک ہمارے یہاں قرآنی جزم (د) کا رواج عام جزم (ہ) کا نہیں، جبکہ پہلی جزم عربی میں صرف قرآن مجید کے ساتھ مخصوص ہو کر رہ گئی ہے۔

تبصرہ نگار
ڈاکٹر محمد لقمان خاں
ریڈر شعبۂ عربی دانش گاہ دہلی۔ دہلی ۷

ضروری تصحیح

برہان کے تازہ شمارہ بابت اپریل ۔ مئی ۱۹۹۶ء میں شائع شدہ مضمون " قرآن حکیم میں ہندی الاصل الفاظ " میں حضرت یوسف علیہ السلام کے کنوئیں میں پھینکے جانے اور پھر مصر میں فروخت کئے جانے سے متعلق غلطی سے دو تاریخیں درج ہو گئی ہیں (دیکھئے ص ۱۰) ایک کے مطابق یہ واقعہ ۱۷۰۰ ق م میں پیش آیا جبکہ دوسری کی رو سے یہ ۱۸۹۰ ق۔م کے قریب کے زمانے میں وقوع پذیر ہوا۔ پہلی تاریخ غلط ہے اور دوسری تاریخ جو مولانا مودودی صاحب کی تفہیم القرآن (جلد دوم، دہلی ۱۹۷۵، ص ۳۸۱) کے حوالے سے درج ہے صحیح ہے۔

پہلے میں نے ۱۷۰۰ ق۔م ہی لکھا تھا لیکن بعد کو جب تفہیم القرآن (جلد دوم) میں ۱۸۹۰ ق م لکھا ہوا دیکھا تو ایک خط کے ذریعہ آپ کی توجہ اس کی جانب مبذول کرائی اور یہ درخواست بھی کی کہ ۱۷۰۰ ق م کو قلم زد کر کے اس کی جگہ ۱۸۹۰ ق م لکھ دیا جائے۔ کاتب صاحب نے ۱۸۹۰ ق۔م تو درج کر دیا مگر ۱۷۰۰ ق۔م کو قلم زد کرنا بھول گئے۔ اس طرح ایک واقعہ سے متعلق دو مختلف تاریخیں درج ہو گئیں۔

قارئین کرام تصحیح فرمالیں۔

سرپرست اعلیٰ
عالیجناب حکیم عبدالحمید چانسلر
جامعہ ہمدرد
ستمبر و اکتوبر ۱۹۹۶ء
برہان
جلد ۱۱۸، ۱۱۹ شمارہ ۹، ۱۰
نگران اعلیٰ
حضرت مولانا حکیم محمد زماں حسینی
مجلس ادارت اعزازی
سید اقتدار حسین
ڈاکٹر معین الدین بقائی
محمود سعید بلالی
ڈاکٹر جوہر قاضی
نظرات — عمید الرحمن عثمانی ۲
قفا نبک من ذکری حبیب و منزل ۱۰
تاریخ کے ساتھ یہ ناانصافی کیوں؟
مترجم: محمد نوشاد عالم چشتی ۱۷
تحریر: پروفیسر ڈاکٹر بی این پانڈے
فلسطین کی ممتاز شاعرہ: فدوی طوقان
حقانی القاسمی، نئی دہلی ۲۸
دفتر رابطہ
Nadwatul-Musanneefeen
4136, Urdu Bazar, Jama Masjid, Delhi-110006

نظرات

جھوٹ فریب، عیاری و مکاری، چالاکی و ہوشیاری اور حوصلہ و ہمت جس میں بھی یہ سب چیزیں مشترکہ جمع ہوں تو پھر اسے سمجھ لینا چاہیئے کہ آج کے "ماڈرن سیاسی دور" میں اسے کسی بھی چیز کی کمی نہیں ہو سکتی ہے چاہے وہ بیروزگار ہو یا مال و اسباب سے خالی ہی کیوں نہ ہو۔ بس اسے چاہیئے کہ وہ کسی بڑی سیاسی جماعت کی ممبرشپ کسی بھی طرح سے حاصل کرے۔ پھر آہستہ آہستہ وہ بڑے سیاسی لیڈر کی قربت و رفاقت میں میونسپلٹی، اسمبلی، پارلیمنٹ کا الیکشن لڑے اور اس میں کامیابی کی منزلیں سر کرے۔ اگر وہ حکمراں پارٹی کا ممبر ہے تو اسے سمجھ لینا چاہیئے کہ اس کے ہاتھ میں "چراغ الہ دین" آگیا! اور اگر وہ کسی حزب اختلاف ہی کا ممبر ہے تو تب بھی وہ گھاٹے میں نہیں ہے۔ "چھوٹا چراغ الہ دین" اس کے بھی ہاتھ میں ہے اب سمجھ جائیے گا کہ جسکے بھی ہاتھ "الہ دین کا چراغ" اس کے لئے مال و دولت دونوں ہاتھوں سے خوب خوب بٹور لینا کوئی مشکل یا حیران کن مرحلہ نہیں رہ جاتا ہے۔ آج کے سیاسی رہنماؤں کا حال یہ ہے کہ جو غربت و افلاس کی چکی میں ہمیشہ پستے رہے ہیں وہ سیاسی اڑن کھٹولہ میں بیٹھ کر لکھ پتی، کروڑ پتی بلکہ ارب پتی ہو گئے ہیں۔ جنہیں ایک وقت کی روٹی پیٹ بھرنے کو میسر نہیں تھی وہ اب سونے کے فرش پر چلتے ہیں انکے باتھ روم میں کروڑوں روپے کا سامان لگا ہوا ہے ان کے بیڈ روم میں کیا کچھ نہیں ہوگا جنات و پریوں کے محلوں کے قصے لوگوں نے سنے ہوں گے انکی کہانیاں پڑھی

ہوں گی اور تصوراتی دنیا کا خاکہ ذہن میں ان کے کوند رہا ہوگا۔ اب انھیں جنات و پریوں کے ملکوں کے قصے افسانے پڑھنے کی ضرورت نہیں ہے روزانہ صبح اخبارات کے اوراق الٹے پلٹئے ایک سے بڑھ کر ایک آپ کو کسی نہ کسی سیاسی رہنما کے نامۂ اعمال کا خلاصہ پڑھنے کو ملے گا جسے آپ پڑھ کر حیران و ششدر رہ جائیں گے۔ اور آپ یہ کہنے پر مجبور ہوں گے کہ بیکار میں جنات و پریوں کے قصے کہانیاں پڑھیں۔ جیتی جاگتی دنیا میں سیاسی رہنماؤں کے جیتے جاگتے اعمال پڑھیئے مزے لیجئے چٹخارے لے لے کر پڑھیئے دل و دماغ کے کسی کونے میں تفریح کا سامان جمع کر ڈالئے۔

سابق مرکزی حکومت کے وزیر جناب پنڈت سکھ رام اس وقت لندن میں براجمان ہیں ان کی غیر حاضری میں جب سی بی آئی کے افسران نے ان کی عالیشان کوٹھی ــ ارے کوٹھی نہیں کوٹھیوں میں جب چھاپہ مارا تو انھیں وہاں کروڑوں روپئے نقد موجود ملے۔ اور جب سی بی آئی کے افسران ایک دوسری کوٹھی میں گئے تو وہ وہاں عیش و آرام کے بے پناہ سامان دیکھ کر حیرت زدہ رہ گئے اس کوٹھی کے باتھ روم میں بیش قیمت سامان لگا ہوا تھا جس کی قیمت اندازاً ڈیڑھ کروڑ روپے سے کیا کم ہوگی ــ کہاں گئے پرانے دور کے نواب راجہ و مہاراجہ ان بیچاروں کے نصیب میں بھی یہ عیش و آرام کے سامان نہیں تھے، اور اس سے بھی پہلے مغلیہ دور کے حکمرانوں کے عیش و آرام کے بیش قیمت سامان بھی اس دور کے سیاسی راہنماؤں کے عیش و آرام کے اسبابوں کے آگے شرمندہ ہیں ــ آج ایک غریب انسان مہنگائی کی مار سے بے پناہ نڈھال ہو چکا ہے پیٹ بھرنے تک کو اس کو روٹی میسر نہیں ہے۔ آٹا اس قدر مہنگا ہو چکا ہے کہ

ایک ایک روٹی کا حصول غریب کے لئے ایک مشکل مسئلہ بنا ہوا ہے اور امیروں سیاسی راہنماؤں کے پاس روپیہ بیکار پڑا سڑ رہا ہے۔ یہ ہے اس دور میں انسان انسان کی زندگی میں فرق و امتیاز، کسی کے ہاں رات میں دن کی چکا چوند ہے اور کسی کے یہاں دن بھی رات کی طرح اندھیرے میں ڈوبا ہوا ہے۔ انسانی حقوق کے شور میں کمیونزم کے نعرۂ مساوات میں عیش و آرام کی رونق ہی رونق اور کسی کے یہاں غربت وافلاس کی اندھیری کوٹھری کیا یہ ہی جدید دور کی دین جس پر انسان کو شرم تک نہیں آرہی ہے۔

۱۹۹۱ء میں اقوام متحدہ میں متفقہ طور پر قرار دادیں منظور ہو چکی ہیں کہ کسی ایک ملک کو کسی بھی طرح کا اختیار نہیں ہے کہ وہ من مانے ڈھنگ سے کسی ملک پر اس کی اندرونی چپقلش پر اس پر حملہ کرے۔ لیکن موجودہ دور میں طاقت کا نشہ امریکہ پر اس قدر سوار ہو چکا ہے کہ وہ اپنے مفاد کے آگے کسی دوسرے ملک کے مفاد کو ذرا بھی نہیں گردانتا ہے۔ عراق پر تازہ امریکی حملہ اسی سلسلے کی ایک کڑی ہے۔ امریکہ نے طاقت کے گھمنڈ میں چور ہو کر جس طرح عراق پر ہوائی حملہ کیا ہے اور جسکی وجہ سے عراق کے شہر بغداد میں کئی شہریوں کی جانیں تلف ہو گئی ہیں اسے کسی بھی طریقہ سے حق بجانب نہیں ٹھہرایا جاسکتا ہے۔ کمزور ملک پر طاقتور ملک کا قہر برپا ہو جانا بیسویں صدی کے قانون میں جائز ہو تو ہو لیکن صحیح معنوں میں کسی بھی انسانی، اخلاقی امذہبی قانون میں اس کا کوئی جواز نہیں ہے اور اس کی جتنی بھی مذمت کی جائے کم ہی ہے۔ امریکہ اپنی طاقت کے غرور میں اس قدر اندھا ہو چکا ہے کہ اس نے کمزوروں کو دبوچنے میں ہٹلر کی تاریخ کو

بھی مسخ کر دیا ہے۔ آج امریکہ تھانیدار بن کر جس ملک پر چاہے بم گرا کر اسکے امن و چین کو غارت کر ڈالتا ہے۔ اس نے ہندوستان کو بھی کسی نہ کسی ڈھنگ سے پریشان کر رکھا ہے۔ اگر ہندوستان اپنے دفاع کے لئے کوئی دفاعی تیاری یا سامان بناتا ہے تو ہندوستان پر امریکہ کی آنکھیں گڑ جاتی ہیں جبکہ اس کا خود کا حال یہ ہے کہ وہ مہلک سے مہلک ہتھیاروں کی ایجاد پہ ایجاد کر رہا ہے، انسانیت کی ہلاکت کے سارے سامان اس کے پاس پہلے سے تیار شدہ ہیں۔ لیکن وہ اپنے گریبان میں جھانکے بغیر ہندوستان کی دفاعی تیاریوں پر نظر گاڑے ہوئے ہے۔ یہ کہاں کی انصاف پسندی ہے اچھا ہوا کہ ہندوستان کی حکومت نے امریکہ کی داداگیری کو ماننے سے انکار کر دیا ہے۔ اپنے ملک کے مفاد کے پیش نظر ہماری دفاعی تیاریاں ہر حال میں جاری رہنی چاہئیں چاہے وہ کسی دیگر ملک کو کتنی ہی ناگوار گذرے جبکہ حکومتِ ہند یہ یقین دلا چکی ہے کہ ہندوستان کی دفاعی تیاریاں کسی دیگر ملک کے لئے کسی بھی قسم کی تشویش و خطرے کا قطعاً باعث نہیں ہیں۔

امریکہ نے شاید عراق پر حملہ کر کے دیگر ملکوں کو یہ سبق سکھانے کی کوشش کی ہو کہ امریکہ کی ہر حال میں بات مانی جائے ورنہ عراق کی طرح اس کا بھی ایسا ہی حشر کیا جائے۔ غنیمت ہے کہ عراق پر امریکی حملے کی روس و چین نے سخت ترین مذمت کرتے ہوئے کہا ہے کہ کردوں کا معاملہ عراق کا اندرونی معاملہ ہے اس میں کسی کو مداخلت کرنے کا حق نہیں ہے ہر حال میں عراق کی علاقائی خود مختاری کا احترام ہونا چاہیئے۔ ماضی قریب تک ہٹلر کا دبدبہ تھا آج امریکہ جس طرح کمزور ملکوں پر حملہ و یلغار کر ڈالتا ہے وہ ہی خاصہ ہٹلر کا بھی رہا ہے مگر دنیا

نے دیکھا کہ ہٹلر جس سے اکثر ملک خوف زدہ تھے اس ہٹلر کا شرمناک حشر ہوا ہے اور
حشر کو اگر امریکہ اپنی یادداشت میں لے آئے تو یقیناً اسے یہ بات باور کرنی پڑے
گی کہ طاقت سے کوئی مسئلہ حل نہیں ہوتا اور جسے طاقت کا غرور و گھمنڈ ہوتا ہے
اس کا ایک نہ ایک دن بیڑہ غرق ہو کر رہتا ہے۔

اسلام امن و سلامتی کا مذہب ہے اور جو اس کا پیروکار ہے اسے یہ حقیقت ہمیشہ اور ہر حال میں ذہن نشین رکھنی چاہیئے۔ مقام شکر ہے کہ کشمیر جیسے صوبے میں جہاں ایک عرصہ تک خوف و دہشت کا ماحول چھایا رہا اب امن و امان کی فضا میں کسی حد تک سانس لے رہا ہے۔ اور انشاء اللہ اب وہاں کی صوبائی اسمبلی کے انتخاب کے بعد نمائندہ حکومت کے قیام کے بعد مکمل امن و امان کا ماحول قائم ہو کر رہے گا۔

کشمیری عوام انتہائی سیدھے سادے اور نیک انسان ہیں وہ غلط راہنماؤں کی غلط چالوں میں ہمیشہ نہیں پھنسے رہ سکتے تھے جب انھیں احساس ہوا کہ ہمارے غلط راہنما ہمیں غلط راستے پر لیجا رہے ہیں وہ بیدار ہو گئے اور انھوں نے صحیح سمت اختیار کر لی۔

کشمیر ہمیشہ ہی سے ہندو مسلمان اتحاد و بھائی چارگی کا گہوارہ رہا ہے ہر مذہب کے راہنماؤں کو وہاں عزت و وقار حاصل رہا ہے۔ ہندو مسلمانوں دونوں کی اہم عظمت اور باوقار نشانیاں موجود ہیں جہاں درگاہ حضرت بل ہے تو بابا امرناتھ مقدس تیرتھ بھی ہے اسی طرح وقس علی اور حاجی عبداللہ خان مرحوم مغفور جیسی [illegible]

ہوا ہے جس کی شرافت، انسانیت، ہمدردیٔ فریاد، فراخدلی، اعلیٰ ظرفی
بلند اخلاق و کردار کے قصے و واقعات زبان زد عام ہیں۔ حاجی احمد اللہ
مرحوم و مغفور نے ہر اس شخص کی خدمت و مدد کی ہے جو مستحق مدد تھا اس
میں چاہے کوئی ہندو ہو یا مسلمان۔ آر ایس ایس کے بڑے لیڈر اور جن سنگھ کے
بانی ڈاکٹر شیاما پرشاد مکھرجی جب اپنے خاندانی افراد کے ساتھ سری نگر سیر و تفریح
کی غرض سے گئے تو وہ اچانک حادثہ کا شکار ہو گئے ایسے موقع پر حاجی احمد اللہ
خاںؒ نے اپنی جان کی پرواہ کئے بغیر ان کو بچایا اور اپنے خرچ اور اخراجات
سے ان کا علاج و معالجہ کرایا آج اس پر بڑی بڑی کتابیں لکھی جا سکتی ہیں شاباشی
ہے اس مردِ مجاہد حاجی احمد اللہ خاںؒ کو جس نے شریعت محمدیہ اور اسلامی تعلیمات
کی رو سے ایک مصیبت زدہ ہندو پریوار کی مسافرت میں ہر طرح مدد دلجوئی و تیمار
داری کی ــــ جنت میں آج انھیں اپنی اس نیک اعمال کا صلہ مل رہا ہوگا۔
اللہ تعالیٰ ان کے صاحبزادگان حاجی حشمت اللہ خاں، حاجی اکرام اللہ خاں اور ہمشیرہ
سے وہ نیک کام لے رہا ہے جسے صدقۂ جاریہ کہا جا سکتا ہے اور صدقۂ جاریہ وہ
ہے جس کا ثواب و اجر قیامت تک ملتا رہتا ہے خوش نصیب حاجی احمد اللہ خاںؒ
اور خوش نصیبان کی قائم و سالم اولاد حاجی حشمت اللہ خاں، اکرام اللہ خاں و
ان کی ہمشیرہ ــ جس کشمیر میں ایسی ہستیاں پیدا ہوئی ہوں اور جس کشمیر میں ایسی
شخصیتیں موجود ہیں اس کشمیر میں تشدد کا ماحول زیادہ دیر ٹک ہی نہیں سکتا ہے
وہاں امن ہوگا، امن رہے گا اور انشاء اللہ وہاں کے باشندے خوش و خرم
کامران و کامیاب رہیں گے۔

گجرات میں بی جے پی کی آپسی لڑائی نے بی جے پی کی ڈسپلن کی قلعی کھول دی ہے

بابری مسجد کو منہدم کرنے کے بعد جس طرح خدا نے بھاجپا کو بے نقاب کیا ہے وہ قابل دید ہے اس کے اوپر نیک نامی کا جو لبادہ پڑا ہوا تھا وہ جب اس کے اوپر سے اٹھا تو معلوم ہوا کہ بدنظمی جس قدر دوسری جماعتوں میں ہے اسی طرح کی بدنظمیاں اس میں بھی ہیں بلکہ اس میں تو اور زیادہ ہیں۔ جو برائیاں وہ دوسری جماعتوں میں بتلاکر اپنی شرافت و نیک نامی کا ڈھنڈورہ پیٹتی تھی اب اس میں ذرا بھی شرم ہے تو اپنے گریبان میں جھانکے اپنی خامیوں کو دوسروں کے سر نہ باندھے اور نہ وہ اپنی تخریبا کاریوں کے راستے سے توبہ کرے عوام کو دھارمک تعروں میں نہ الجھائے۔ دوسرے مذاہب کا احترام کرے۔ بابری مسجد کے انہدام پر معافی مانگے تو پھر شاید اس کا وقار دوبارہ بحال ہو جائے۔"

خدا خدا کرکے یوپی اسمبلی کا انتخاب بخیر و خوبی سے انجام پذیر ہو گیا۔ اس انتخاب نے جہاں فسطائی طاقتوں کو سبق سکھایا ہے وہیں سیکولرازم کی دہائی دینے والی جماعتوں کے لئے بھی عبرت کا سامان پیدا کر دیا ہے۔ جو جماعتیں ایک پلیٹ فارم پر مل جل کر بیٹھنے کو تیار نہیں ہیں وہ کیا فسطائیت کے خلاف جدوجہد یا جنگ کر سکتی ہیں۔ بکھری ہوئی جماعتیں جب ایک منظم فسطائی طاقت کے خلاف میدان میں اترتی ہیں تو یہ کیسے ہو سکتا ہے کہ اس منظم فسطائی طاقت سے لوہا لیا جا سکے۔ لیکن پھر بھی ہندوستانی عوام کی یہ خوبی ہے کہ اس نے اپنے فرائض کو نبھایا اور فسطائی طاقتوں کو اقتدار کی دہلیز سے دور ہی رکھا۔

سابق وزیر اعظم پی۔ وی۔ نرسمہا راؤ کی یہ خوش نصیبی ہے کہ وہ ابھی تک عدالتی

شکنجے سے بچے ہوئے ہیں اور اس معاملہ میں ان کی کسی نہ کسی طرح غیبی مدد ہی ہوتی رہتی ہے۔ ورنہ جبکہ چندرا سوامی ان ہی جیسے ایک مقدمہ میں ملوث ہو کر جیل کی سلاخوں میں بند ہیں۔ مگر وہ ابھی تک جیل خانے سے محفوظ ہیں۔ بہرحال ہم یہاں یہ کہے بغیر نہ رہیں گے کہ۔ بکرے کی ماں کب تک خیر منائے گی۔

بعض حالات و دفتری مجبوریوں کی وجوہات کی بنا پر کچھ سالوں سے برہان وقت وقت پر نہیں شائع ہو رہا ہے۔ ادارہ کی کتابیں بھی نہیں طبع ہو پا رہی ہیں جس کے لیے ادارہ معذرت خواہ ہے۔ زیر نظر شمارہ ماہ ستمبر و اکتوبر ۱۹۹۶ء کا مشترکہ شائع کیا جا رہا ہے امید ہے کہ قارئین برہان ہماری مجبوریوں کا خیال کریں گے۔ انشاء اللہ حالات جلد از جلد معمول پر آجائیں گے۔ دعا کی درخواست ہے۔ (ادارہ)

بقیہ: فلسطین کی ممتاز شاعرہ: فدویٰ طوقان

ولو قدرت اودعته منایا | الضلوع وضمت علیه الکبد

عساها تقیه بلاف الحنان | ضراوة ذاك المساء الصرد

وعانقها وهو یصغی الی | تلاحق انفاسها المطرد

وغمغم ام دراحت یداه | تفتشان مابین لحد وخد

فاهوت علی الطفل تشتم فیه | روائح فردوسها المفتقد

(جاری)

پہلی بات — انیس الحسن

قِفا نبکِ مِن ذکریٰ حبیبٍ و منزلِ

مفکرِ ملت مفتی عتیق الرحمن عثمانی" نمبر ۱۹۸۷ء میں شائع ہوا تھا اس کے بقایا مضمون ترتیب وار شائع کئے جا رہے ہیں۔

اِدارہ ندوۃ المصنفین جو آج زندگی کے پچاس سال پورے کر رہا ہے، اَپنے بانی۔ اپنے معمار۔ اپنے سربراہ و رُوحِ رواں۔ مُفکرِ ملّت مفتی عتیق الرحمٰن صاحب عثمانی رح کی یادوں سے منسوب یہ خصوصی شمارہ ناظرین کرام کی خدمت میں پیش کر کے اپنے اُس فریضۂ منصبی کی تکمیل کر رہا ہے جو حضرت مفتی صاحب رح کی وفات حسرت آیات نے اُس پر عائد کیا تھا۔ اور جس کے لئے اِدارہ کے قدردان احباب و مخلصین کی جانب سے طلب و فرمائش برابر جاری تھی۔ فالحمد للہ اوّلاً و آخراً

*

مفتی صاحب رح کو اس دنیا سے رخصت ہوئے آج تین سال ہو رہے ہیں۔ اس لحاظ سے یقیناً اس شمارہ کی اشاعت میں غیر معمولی تاخیر ہو چکی ہے۔ لیکن پے در پے حوادث و مشکلات جو اس درمیان پیش آتی رہیں۔ اُن کا مختصر تذکرہ بھی اس لئے ضروری معلوم ہوتا ہے کہ ناظرین کرام ہماری مجبوریوں کا پورا اندازہ کر سکیں۔

*

مفتی صاحب رح سے قریبی تعلق رکھنے والے مخلصین کو بھی عام طور پر یہ معلوم نہیں کہ مفتی صاحب رح کی اہلیہ (افسوس کہ آج اُن کو بھی مرحومہ لکھنا پڑ رہا ہے) بہت برسوں سے مختلف عوارض میں مبتلا اور مستقل طور پر صاحبِ فراش تھیں۔ قدرتی بات ہے کہ اُن کی طویل علالت کا مفتی صاحب رح کے قلب و ذہن پر گہرا

اثر تھا، مگر وہ پیکرِ صبر و ثبات شاذ و نادر ہی اپنی اس پریشانی کا کبھی کسی سے اظہار کرتے تھے۔ یہاں تک کہ وہ خود بھی فالج کے حملہ سے بے بس ہو کر رہین بستر ہو گئے۔ خود ان کی علالت نے بھی کافی طول کھینچا۔ اس طرح گھر میں دو مستقل اور بدیست و پا مریضوں کی خدمت اور اس پر مستزاد علاج معالجہ کی بھاگ دوڑ۔ عیادت اور مزاج پرسی کے لئے آنے والوں کا تسلسل، خیریت طلبی کے مراسلات اور ان کی جوابدہی اور دوسرے ناگہانی کاموں نے ایسی ہنگامی شکل اختیار کر لی جس کا اثر گھریلو حالات کے ساتھ ساتھ ندوۃ المصنفین اور بُرہان کے ادارتی نظام پر بھی پڑنا ایک قدرتی بات تھی۔ پھر بالآخر مقررہ ساعت سامنے آئی اور مفتی صاحب اپنی زندگی بھر کی تھکن ساتھ لے کر اس دنیا سے رخصت ہو گئے اور پسماندگان کے غم زدہ دلوں کو پوری طرح صبر کا سہارا ملنے بھی نہ پایا تھا کہ مفتی صاحبؒ کی اہلیہ بھی آسودۂ رحمت ہو گئیں۔

یکے بعد دیگرے ان حوادث کے ساتھ ساتھ خود مفتی صاحبؒ کے رفیق عزیز بُرہان کے ایڈیٹر مولانا سعید احمد اکبر آبادی کی خطرناک علالت کا سلسلہ شروع ہو گیا۔ اور وہ بھی کچھ مہینوں بعد دارالخلد کو سدھار گئے۔

———※———

الغرض دو ڈھائی سال کی مدّت ایسی گذری کہ ادارہ کے کارکنوں کو سر اٹھانے اور اپنے ہوش و حواس سنبھالنے کا موقعہ نہ مل سکا۔ احباب اور کرم فرماؤں کے تقاضے بھی برابر جاری رہے اور ناگہانی حالات کی یہ نیرنگیاں بھی۔

اب بگڑے ہوئے کاموں کو سنبھالنے اور اپنے معمولات کو برقرار رکھنے کے لئے کچھ کوشش شروع کی تو ایک اور الجھن یہ پیش آئی کہ اب ماہنامہ بُرہان کے سرپرست اعلیٰ (حضرت مفتی صاحبؒ کے رفیقِ خاص) مولانا حکیم محمد زمان الحسینی القاسمی تھے۔

جن کا مستقل قیام کلکتہ رہتا ہے۔ مدیر اعزازی مولانا قاضی اطہر مبارک پوری صاحب جو بیشتر اپنے وطن مالوف میں قیام پذیر رہتے ہیں۔ اور مدیر مسئول برادر مکرم جمیل مہدی صاحب جو روزنامہ "عزائم" لکھنؤ کی ادارت تحریر کا مستقل بوجھ سنبھالے ہوئے ہیں۔ اور اس ذمہ داری کی وجہ سے لکھنؤ میں اقامت کے پابند ہیں۔

اس عرصہ میں کئی بار بُرہان کے "مفکر ملت" نمبر کا اعلان بھی شائع کیا گیا۔ لیکن عملاً یہ دشواری ناقابل عبور تھی کہ تینوں مذکورہ حضرات دہلی سے دور رہتے ہوئے اس خاص شمارہ کی تیاری مکمل کرا سکیں۔

چنانچہ اکتوبر ۱۹۸۶ء میں ان تینوں بزرگوں نے دہلی آکر ندوۃ المصنفین کی ایک خاص نشست میں باہم مشورہ کے بعد یہ ضروری سمجھا۔ کہ مفکرِ ملت نمبر کی تیاری جو ایک مستقل کام ہے، تب ہی عمل میں آسکتی ہے کہ دہلی میں رہنے والے مفتی صاحبؒ کے کچھ مخلصین کا تعاون حاصل کیا جائے اور اس مہم کی ذمہ داری در و بست ان کے سپرد کر دی جائے ـــــ تب ہی یہ بیل منڈھے چڑھ سکے گی۔ چنانچہ راقم سطور انیس الحسن کو اور مولانا فقیہ الدین صاحب کو (شاید اس وجہ سے کہ ہم دونوں پچھلے چالیس برسوں میں مسلسل، شب و روز، سفر و حضر میں مفتی صاحبؒ کے کرم، شفقت و اخلاص سے بہرہ مند رہے ہیں) اس خدمت کے لئے موزوں سمجھا گیا۔ اور قرعہ فال بنام من دیوانہ زدند۔

اپنی بات اگر کہوں تو واقعہ یہ ہے کہ میری بے مائیگی اور حالات اس بار عظیم کے متحمل نہ تھے۔ لیکن عمر بھر مفتی صاحبؒ نے جس کرم و اختصاص اور تعلق خاطر سے نوازا، اس کے بعد کسی پس و پیش کی گنجائش بھی نہ تھی۔ اللہ کے بھروسہ پر میں نے اور مولانا فقیہ الدین صاحب نے اس ذمہ داری کو سنبھالا۔ اور کام کی شروعات کے لئے ان

ارباب علم وفضل کی فہرست تیار کرنی چاہی جو اپنے دیرینہ تعلق اور قدر دانی کے ساتھ مفکر ملت نمبر کے لئے مفتی صاحبؒ سے متعلق اپنے تاثرات و مشاہدات قلمبند کر سکیں مگر یہ دیکھ کر کچھ ہمت ٹوٹی کہ مفتی صاحبؒ کی ہمعصر جوہر شناس ہستیاں، جیسے ڈاکٹر ذاکر حسین۔ مولانا سید محمد بدر عالم میرٹھی۔ مولانا حفظ الرحمٰن۔ سید فخر الدین علی احمد۔ مولانا محمد عثمان فارقلیط (ایڈیٹر الجمعیۃ) مولانا سعید احمد اکبرآبادی۔ مولانا محمد مسلم (ایڈیٹر دعوت) مولانا عبد الماجد دریابادی۔ قاضی عبد الغفار۔ شیخ محمد عبد اللہ خالد کشمیر۔ بیرسٹر نور الدین احمد۔ ڈاکٹر عبد الجلیل فریدی۔ مولانا عبد السلام قدوائی۔ ڈاکٹر آر۔ اے حکیم۔ مولانا قاری محمد طیب وغیرہ جنہیں مفتی صاحبؒ پر قلم اٹھانے کا حق حاصل تھا، آج اس دار فانی میں موجود ہی نہیں ہیں، اور کچھ اگر باقی بھی ہیں (جیسے مولانا ابو اللیث صاحب۔ بدر الدین طیب جی۔ مولانا محمد یوسف۔ الحاج محمد یونس سلیم۔ مولانا حامد الانصاری غازی۔ مولانا قاضی سجاد حسین وغیرہ) تو وہ اپنی عمر طبعی اور اعذار و ناتوانی کی اس منزل میں ہیں کہ ان سے صرف دعائیں ہی طلب کی جا سکتی ہیں۔

پھر بھی جہاں تک نظر جا سکی۔ مفتی صاحبؒ کے مخلصین اور قدر دانوں کی ایک طویل فہرست تیار کر کے اُن سے مراسلت کی۔ ریمائنڈر بھیجے۔ مکرر یاد دہانیاں کیں اور جو کچھ حاصل ہو سکا سر آنکھوں سے لگایا۔

ساتھ ہی یہ بھی کوشش کی کہ خود مفتی صاحبؒ کے اپنے دفتری ریکارڈ سے جو متعلقہ مواد مل سکے چھانٹ کر نکالا جائے۔ مگر اس ارادہ سے جب ندوۃ المصنفین کی الماریوں اور فائلوں پر نگاہ ڈالی، تو یقین کیجئے کہ چکر سا آگیا۔ اور تیس پنتیس سال کے جمع شدہ ریکارڈ۔ بیشمار خطوط۔ ٹیلی گرامس۔ دعوت ناموں۔ پورٹلوں اخبارات و رسائل کے تراشوں اور بے ترتیب و منتشر کاغذات کی گڈیوں کا ایک طومار دیکھ کر یکبارگی جگرؔ مراد آبادی مرحوم کا شعر یاد آگیا :-

یہ عشق نہیں آساں، بس اتنا سمجھ لیجئے
ایک آگ کا دریا ہے، اور ڈوب کے جانا ہے

یہ صورت حال میری اپنی ہمت اور حوصلہ کے لئے بڑا چیلنج تھی مگر اللہ بھلا کرے مولانا فقیہ الدین صاحب کا کہ انہوں نے بڑی مستعدی کے ساتھ یہ تمام ذمہ داری اپنے ذمہ لے لی۔ اور واقعہ یہ ہے کہ اپنی صحت و معمولات کے تقاضوں کو انگیز کر کے انھوں نے جس دیدہ ریزی۔ تندہی۔ پابندی اور اخلاص و تحمل کے ساتھ پانچ ماہ تک مسلسل اس لق و دق جنگل کی جادہ پیمائی کی، ان کی وہ تمام محنت بلاشبہ شکر و سپاس کے پیمانوں میں نہیں سما سکتی۔ تقبل اللہ منہ وجزاہ خیراً۔

———※———

یوں تو اسلاف اور بزرگوں کے نقوش زندگی اور کارناموں کو سمیٹ کر محفوظ کرنا بجائے خود عالم انسانی کی ایک تعمیری خدمت اور آنے والی نسلوں کے لئے وسیلۂ ہدایت اور نشانِ خیر اندیشی ہے۔ مگر اس شمارہ کے مرتبین کا مطمح نظر ایک عظیم شخصیت کی سوانح نگاری اور سرگذشت حیات کی تدوین سے بھی کچھ زیادہ وسیع ،،، درحقیقت ایک طرح سے اس پون صدی کی واردات اور وقائع نگاری ہے جس سے تاریخ کے وہ مضمحل گوشے بھی ریکارڈ پر آجائیں جو بصورت دیگر گردش لیل و نہار کے ہاتھوں دماغوں اور ذہنوں سے بالکل فراموش ہو جاتے۔ اور آنے والے مؤرخ کو بڑی جستجو کرنی پڑتی کہ اس انقلابی دور کا پس منظر کیا تھا۔ عالمِ اسلام میں پھیلی ہوئی ملتِ اسلامیہ کو اور خود ہندوستان کی قومی اور اجتماعی زندگی کو کس کس نشیب فراز سے گذرنا پڑا۔ کن کن تحریکوں نے اس پون صدی میں سر اٹھایا اور ان کے عوامل و نتائج کیا تھے۔ ہمارے حال و مستقبل پر ماضی نے کیا اثرات قائم کئے اور ہمیں کن مسائل و افکار کے سپرد کیا۔!

حقیقت یہ ہے کہ بیسویں صدی کی ابتدار (جو مفتی صاحب رحمۃ اللہ علیہ کی پیدائش کا زمانہ ہے) انسانی تاریخ کا سب سے زیادہ ہنگامہ خیز اور طوفانی دَور تھا۔ جس نے روئے زمین پر زندگی کے اطوار و انداز یکسر بدل کر رکھدیئے۔ اور پوری انسانی دنیا کو فکر و مزاج کے ایک نئے ماحول اور نئی آب و ہوا کے آغوش میں دے دیا۔ اس دَور میں عالمِ اسلام کی صدیوں سے برسرِ اقتدار مرکزیت (خلافت) دَم توڑ رہی تھی۔ اناطولیہ۔ طرابلس اور بلقان کے آخری مورچے منہدم ہو رہے تھے تو دوسری طرف اسی دَور میں جمال الدین افغانی، محمد عبدہٗ، رشید رضا۔ عبیداللہ سندھی۔ ڈاکٹر محمد اقبال جیسے بیدار مغز مصلحین اور نبض شناسانِ انقلاب اُمت کو حرکت و بیداری کا پیغام سنا رہے تھے۔

اِدھر اندرونِ مُلک غیر ملکی غلامی سے آزاد ہونے اور خود کو سنبھالنے کی تحریک پروان چڑھ رہی تھی شیخ الہند مولانا محمود حسن۔ راجہ مہندر پرتاب۔ جمشید جی ٹاٹا۔ سی آر داس گوکھلے۔ موتی لال نہرو۔ سیف الدین کچلو۔ حسرت موہانی اور مولانا ابوالکلام آزاد۔ اس تحریک کے نقیب تھے۔ جو بالآخر ۱۵ اگست ۱۹۴۷ء کو بامراد اپنی منزل کو پہونچ سکی ــــ ملک آزاد ہوا۔

مگر آہ! کہ آزادی اپنے ساتھ آگ اور خون کا ایک سیلاب بھی لائی جس کے داغ دھبوں سے ملک کا دامن ــــ آج چالیس برس کے بعد بھی ــــ صاف نہیں ہو سکا ہے۔

مفتی صاحبؒ ٹھیک اِسی انقلابی دَور میں پیدا ہوئے۔ پلے۔ بڑھے اور پروان چڑھے تھے۔ ان کی آنکھوں نے وقت کی بدلتی ہوئی کروٹوں کو بڑی گہری نظر سے دیکھا تھا۔ ان کے شعور و احساس نے اپنے گرد و پیش سے پورا اثر لیا تھا۔ انھوں نے وقت کی پکار کو پورے دھیان سے سُنا، اور عافیت پسندی کی بجائے جہد و عمل

کی زندگی اختیار کی۔ اور وہ پچاس سال سے زیادہ حرکت وعمل کے اسٹیج پر ایک انتہائی سرگرم کار ایکٹر رہے۔

اس لحاظ سے ہمیں امید ہے کہ اس دَور کی تاریخ لکھنے والوں کو مفتی صاحبؒ کی سرگذشت حیات سے بہت کارآمد مواد مل سکے گا اور حال وماضی کے سرشتوں کو جوڑنے میں بڑی سہولت ہوگی۔

شیریں تراز حکایت مانیست قصۂ
تاریخ روزگار سراپا نوشتہ ایم

—— ※ ——

ہم تہِ دل سے شکر گذار ہیں اُن تمام اکابر واحباب کے، جن کی کاوش فکر وقلم اِس یادگار شمارہ کی زینتِ اوراق ہیں۔ یا کسی بھی شکل میں ان کے تعاون سے ہمیں حوصلہ ملا ہے۔

یہ بھی اعتراف ہے کہ اپنی محدود ضخامت اور گنجائشوں کے پیشِ نظر دیر سے موصول ہونے والے کچھ مضامین جزوی یا کلّی طور پر شاملِ اشاعت نہ کئے جا سکے ان میں سے کچھ مضامین کتابت شدہ رکھے ہیں۔ انشاء اللہ تعالیٰ موقعہ بموقعہ وہ بُرہان کے عادی شماروں میں ہدیۂ ناظر بن کئے جاتے رہیں گے۔

—— ※ ——

اپنی ترتیب کے لحاظ سے یہ شمارہ چار حصوں پر مشتمل ہے۔ پہلا حصہ ان مقالات، تأثرات، خطوط، پیغامات اور بیانات پر مشتمل ہے۔ جو مفتی صاحبؒ کے قدردان اکابر واحباب کی طرف سے موصول ہوئے۔ دوسرا حصہ مفتی صاحب رح کی سرگذشت حیات اور ان کے کارناموں کا ایک واقعاتی جائزہ ہے۔ تیسرے حصہ میں مفتی صاحب کے غیر ملکی اسفار و روابط کا تذکرہ ہے۔ اور چوتھے باب میں خود مفتی صاحب کے چند علمی مقالات۔ تقریریں اور مذاکرات پیش کئے گئے ہیں۔

پہلی قسط

تاریخ کے ساتھ یہ ناانصافی کیوں؟؟

ہندی تحریر: پروفیسر ڈاکٹر بی. این پانڈے، مورخ و سابق گورنر صوبہ اڑیسہ
مترجم: محمد نوشاد عالم چشتی. کوروکھیشتر یونیورسٹی، ہریانہ

ایک اہم وضاحت: (مترجم) برصغیر کی (ہند و پاک) تاریخ کو فرنگی حکمرانوں نے اپنے مفاد کے پیش نظر دور استعمار میں اپنے پالتو مؤرخوں کے ذریعہ اس طرح توڑ موڑ کے پیش کیا ہے جس کا ہم تصور نہیں کر سکتے ہیں۔ مقامی باشندگان ہند (مسلمانوں اور ہندوؤں) کو باہم لڑانے کے لئے ایک ایسی بھیانک سازش کی گئی جس کی آگ میں ہم آج بھی جلتے ہوئے نظر آتے ہیں۔ ایک دوسرے کے خلاف دلوں میں سلگتے ہوئے نفرتوں کے انگارے اور متعصبانہ زعم پرستی کی آتش کدہ میں نہ جانے کتنے وجود جل کر بھسم ہو گئے اور نہ جانے کتنے بھسم ہوتے جائیں گے۔

کذب و افترا پر مبنی بغض و حسد سے پُر یہ بھیانک قسم کے "تاریخی واقعات" (جن کا حقیقت سے کوئی تعلق نہیں) دراصل اس نوعیت ہی کے ہیں کہ جنہیں پڑھ کر ایک سادہ لوح عام قاری بھی بھڑک اٹھتا ہے۔ تو پھر اس طرح کے "منگھڑت روایات" سے سماج دشمن عناصر کیوں نہیں فائدہ اٹھائیں گے؟ — لیکن سب سے بڑا المیہ تو یہ ہے کہ انگریزنے جو "پھوٹ ڈالو اور سیاست کرو" کے نظریہ

کے تحت اس طرح کی تاریخ رقم کرائی تھی ـــــ آج آزادی کے بعد بھی اسی تاریخ کو بین وعن ابتدائی اسکولوں سے لیکر اعلیٰ تعلیمی اداروں تک میں نہ صرف پڑھائی جاتی ہے بلکہ حفظ کرائی جاتی ہے ــــــ جس کے نتیجے میں "ذہن سازی" کے اس عمل سے گذر کر سیکڑوں نہیں بلکہ لاکھوں افراد ماہ بہ ماہ اور سال بہ سال ایسے پیدا ہوتے ہیں جو دنگا، فساد، لوٹ مار اور قتل و غارت گری کی محفلوں کو سرگرم رکھنے میں خصوصی مہارت رکھتے ہیں۔

مگر! ان فتنہ پرور عناصر کے مکروہ عزائم کے تار پود کو بکھیرنے والے کچھ سنجیدہ لوگ بھی ہوتے ہیں جو "حق" کو "حق" اور "باطل" کو "باطل" کہنے کی صلاحیت بھی رکھتے ہیں۔ یہ اپنے موقف کی حمایت میں ایسے ٹھوس اور ناقابل تردید دلائل و دستاویزی ثبوت رکھتے ہیں جن کی اسنادی حیثیت کو ایک منصف مزاج شخص "چیلنج" کرنے سے خود کو مجبور پاتا ہے۔ ان حضرات کے دلائل اتنے قوی ہوتے ہیں جن کی حق و انصاف کی روشنی میں تردید نہیں کی جا سکتی کیونکہ ان لوگوں کا مطمح نظر یہ ہوتا ہے کہ : ع

ہم پرورش لوح و قلم کرتے رہیں گے

حق و انصاف کی بنیاد پر لوح و قلم کی پرورش کرنے والوں میں دور حاضر کی ایک شخصیت جناب ڈاکٹر پروفیسر وشمبھر ناتھ پانڈے کی بھی ہے۔ نام کے ساتھ "پانڈے" کے لاحقے سے یہ واضح ہے کہ ڈاکٹر صاحب کا تعلق ایک "برہمن" خاندان سے ہے۔ لیکن باوجود اس کے آپ ایک صاحب علم اور مورخ ہونے کی حیثیت سے ہمیشہ مسلم حکمرانوں، سلطنت مغلیہ کے سلاطین نیز اورنگ زیب و دیگر مسلم بادشاہان ہند کے خلاف، اسلام اور مسلمان دشمن تاریخ نگاروں کی

پھیلائی ہوئی غلط فہمیوں کے ازالے کا فریضہ بحسن وخوبی انجام دیتے ہیں۔

پیش نظر تحریر دراصل ڈاکٹر صاحب کی ایک ہندی تقریر کی اردو میں مکتوبی شکل ہے جسے راقم نے ایک تاریخ کا طالب علم ہونے کے ناطے اردو کا جامہ پہنانے کی اپنی سی کوشش کی ہے۔ تاکہ ڈاکٹر صاحب کے خیالات اور ان تاریخی حقائق سے اردو داں طبقہ بھی بھرپور استفادہ کر سکے ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ (محمد نوشاد عالم چشتی)

اڑیسہ کے سابق گورنر، راجیہ سبھا کے رکن (رکن صوبائی اسمبلی) اور مورخ پروفیسر بشمبھر ناتھ پانڈے نے اپنی تقریروں اور مقالوں میں اُن" تواریخی حقائق" اور" روایات" کو اجاگر کیا ہے جن سے یہ اچھی طرح وضاحت ہو جاتی ہے کہ تاریخ کو من مانے ڈھنگ سے توڑا مروڑا گیا ہے۔ دوران تقریر انہوں نے کہا۔

اب میں کچھ ایسی مثالیں پیش کرتا ہوں: جن سے یہ واضح ہو جائے گا کہ تاریخی حقائق کو کیسے مسخ کیا جاتا رہا ہے۔

جب میں الہ آباد میں ۱۹۲۸ء میں ٹیپو سلطان کے متعلق (ریسرچ) تحقیق کر رہا تھا تو" اینگلو بنگالی کالج" کے" طلبہ یونین" کے کچھ اراکین میرے پاس آئے اور اپنے "ہسٹری ایسوسیشن (History Association) کی افتتاح کرنے کے لئے مجھکو دعوت دی۔ یہ طلبہ کالج سے سیدھے میرے پاس آئے تھے۔ ان کے ہاتھوں میں نصاب کی کتابیں بھی تھیں۔ اچانک میری نگاہ ان کی تاریخ کی کتاب پر پڑی میں نے ٹیپو سلطان کے متعلق باب کا مطالعہ شروع کیا۔ تو مجھے جس جملے نے بہت زیادہ حیرت میں ڈالدیا وہ یہ تھا۔

" تین ہزار برہمنوں نے خودکشی کرلی، کیونکہ ٹیپو انھیں زبردستی مسلمان بنانا چاہتا تھا"

اس نصابی کتاب کے مصنف مہامہوپادھیائے ڈاکٹر ہرپرساد شاستری تھے جو کلکتہ یونیورسٹی میں صدر شعبۂ سنسکرت تھے۔ میں نے فوراً ڈاکٹر شاستری کو خط لکھا کہ انہوں نے سلطان ٹیپو کے متعلق مندرجہ بالا جملہ کس بنیاد اور حوالے سے لکھا ہے؟ کئی خط لکھنے کے بعد ان کا جواب ملا کہ انہوں نے یہ "واقعہ" میسور گزیٹیر Mysore Gazetteer سے حاصل کیا ہے۔" میسور گزیٹیر" نہ تو دہلی (الٰہ آباد) میں اور نہ ہی امپیریل لائبریری کلکتہ سے حاصل ہو سکا — پھر میں نے میسور یونیورسٹی کے موجودہ چانسلر (شیخ الجامعہ) سر برجیندر ناتھ سیل SIR BIRGENDRANATH SEAL کو (خط) لکھا کہ ڈاکٹر شاستری نے جو بات لکھی ہے اس کے بارے میں مجھے معلومات فراہم کرائیں۔ انھوں نے میرا خط پروفیسر شری کنٹیاؔ کے پاس بھیج دیا، جو اس وقت میسور گزیٹیر کی اشاعت نو کی تیاری کر رہے تھے۔

پروفیسر شری کنٹیاؔ نے مجھے لکھا کہ "تین ہزار برہمنوں کی خودکشی کا واقعہ میسور گزیٹیر میں کہیں بھی نہیں ہے (یعنی یہ واقعہ ڈاکٹر شاستری کا خود ساختہ اور من گھڑت ہے)۔" تاریخ میسور کا ایک طالب علم ہونے کی حیثیت سے ہمیں اس کا پورا یقین ہے کہ "ایسا واقعہ (پورے ریاست میسور میں) کہیں بھی واقع پذیر نہیں ہوا ہے۔ انھوں نے (پروفیسر کنٹیاؔ نے) مجھے (ڈاکٹر پانڈے کو) مطلع کیا کہ ٹیپو سلطان کے وزیر اعظم پورنیاؔ (PURNAIYA) جن کا نام تھا وہ برہمن تھا۔[1]

[1] سلطان ٹیپو شیر میسور کا وزیر اعظم پورنیا بھی میر صادق کی طرح سلطان سے غداری کرتے ہوئے انگریزوں سے مل گیا تھا۔ علامہ اقبال کا یہ شعر ؎

جعفر از بنگال صادق از دکن ننگ ملت ننگ دین ننگ وطن

تو بہت مشہور اور زبان زد عام ہے لیکن پورنیا کی غداری اسکی بدعہدی اور بدکرداری سے بہت کم کم لوگ واقف ہیں۔ ایسا کیوں؟ غیر مسلم مورخین نے مسلمانوں کی چھوٹی چھوٹی غلطیوں کو بھی رائی کا پہاڑ بنا کے اچھالا۔ لیکن غیر مسلموں کی غداریوں اور بدکرداریوں پہ اپنی حکمت و دانائی کے ساتھ (باقی اگلے صفحہ پر)

اور ان کے سپہ سالار جن کا نام کرشن راؤ تھا وہ بھی برہمن تھے انھوں نے مجھے ۱۵۶ ایسے مندروں کی ایک فہرست روانہ کی جنھیں سلطان ٹیپو شیر میسور سالانہ امداد دیا کرتے تھے۔ انھوں نے سلطان ٹیپو کے تیس (۳۰) مکتوبات کے عکوس (Photo Stats) بھیجے جو انھوں نے شرنگیری مٹھ (Shringeri Math) کے جگت گرو شنکر اچاریہ کو لکھے تھے۔ جن کے ساتھ سلطان کے نہایت قریبی تعلقات تھے۔ راجگان میسور کے دستور کے مطابق سلطان ٹیپو بھی روزانہ ناشتہ کرنے سے پہلے رنگ ناتھ کے مندر میں (پجاریوں اور خداموں کی خیریت دریافت کرنے کے لئے) جاتے تھے یہ مندر شری رنگا پٹنم کے قلعہ میں تھا۔ پروفیسر شری کنٹیا کے خیال میں ڈاکٹر شاستری نے یہ "واقعہ" کرنل مائلس کی کتاب ہسٹری آف میسور (History of Mysore) سے لی ہوگی۔ اس کے مصنف کا دعویٰ تھا کہ اس نے اپنی کتاب "تاریخ ٹیپو سلطان" ایک قدیم فارسی مخطوطہ سے اخذ کیا ہے، جو رانی وکٹوریہ کے ذاتی کتب خانہ میں تھا۔ لیکن تفتیش و تحقیق سے یہ معلوم ہوا کہ رانی کے کتب خانہ میں ایسا کوئی مخطوطہ تھا ہی نہیں، کرنل مائلس کی کتاب کی بہت سی باتیں بالکل منگھڑت اور غلط ہیں۔

ڈاکٹر شاستری کی کتاب، مغربی بنگال، آسام، بہار، اڑیسہ، اتر پردیش (U.P) مدھیہ پردیش (M.P) اور راجستھان کے اعلیٰ تعلیمی اداروں میں داخل نصاب ہے میں نے کلکتہ یونیورسٹی کے موجودہ چانسلر سر آشوتوش چودھری کو ایک خط لکھا اور اس سلسلے میں کئے گئے اپنے سارے مراسلات کے نقول انھیں روانہ کیا اور

(باقی صفحہ ۲۳ کا) ایسا پڑھا لکھا اعلیٰ تعلیم یافتہ طبقہ بھی ان تاریخی حقائق سے باخبر نہیں ہے۔ (نوشاد عالم چشتی)

ان سے گذارش کیا کہ تاریخ کے اس نصابی کتاب میں سلطان ٹیپو کے متعلق جو غلط اور گمراہ کن جملے لکھے گئے ہیں ان کے خلاف مناسب کارروائی کی جائے۔

سر آشوتوش چودھری کا یہ جواب آگیا کہ ڈاکٹر شاستری کی مذکورہ کتاب کو یونیورسٹی کے نصاب سے خارج کر دیا گیا ہے لیکن میں یہ دیکھ کر مزید حیرت زدہ ہوا کہ "خودکشی" کا یہ "منگھڑت واقعہ" جونیئر ہائی اسکول Junior High School اتر پردیش (U.P.) کے ۷۲-۱۹۷۱ء کے نصاب تاریخ میں شامل کتابوں میں بالکل من و عن موجود ہے۔ اس سلسلے میں گاندھی جی کا یہ تبصرہ بھی پڑھنے کے قابل ہے جو انھوں نے اپنے اخبار ینگ انڈیا (Young India) میں مورخہ ۲۳ر جنوری ۱۹۳۰ء کے صفحہ ۳۱ پر کیا تھا۔ انھوں نے لکھا تھا ـــــ

"میسور کے فتح علی (ٹیپو سلطان) کو غیر ملکی (خاص کر یورپی) تاریخ نگاروں نے اس طرح بنا کے پیش کیا ہے کہ وہ گویا ایک متعصب مذہب پرستی کا شکار انسان تھے۔ ان تاریخ نویسوں نے لکھا ہے کہ اُس نے اپنے ہندو رعایا پر ظلم ڈھائے اور انھیں زبردستی مسلمان بنایا ـــــ جبکہ حقیقت اس کے بالکل ہی برعکس ہے۔ ہندو رعایا کے ساتھ ان کے بہت اچھے تعلقات تھے۔ ریاست میسور (اب کرناٹک) کے محکمۂ آثار قدیمہ (Archaeology Department) کے پاس تیس (۳۰) ایسے مکتوبات ہیں جو سلطان ٹیپو نے شرنگیری مٹھ کے جگت گرو شنکر آچاریہ کو ۱۷۹۳ء میں رقم کیا تھا۔ ان میں سے ایک خط میں سلطان ٹیپو نے شنکر آچاریہ کے ـــــ خط کی وصول یابی کا ذکر کرتے ہوئے ان سے گذارش کیا ہے کہ وہ اس کی اور ساری دنیا کی بھلائی کامیابی اور خوش حالی کے لئے عبادت و ریاضت اور دعا کریں ـــــ آخر میں انھوں (سلطان ٹیپو) نے شنکر آچاریہ سے یہ بھی گذارش کیا کہ وہ میسور لوٹ آئیں کیونکہ کسی دیش میں اچھے لوگوں کے

رہنے سے بارش ہوتی ہے، فصل اچھی ہوتی ہے اور خوش حالی آتی ہے :

یہ خط بھارت کی تاریخ میں سنہرے الفاظ میں لکھے جانے کے قابل ہے۔

ینگ انڈیا میں آگے کہا گیا ہے ـــــ

" سلطان ٹیپو نے ہندو مناد ر بطور خصوصی شری وینکٹ		شری نواس اور شری رنگناتھ مندروں کو زمین اور دیگر اشیار کے شکل میں قیمتی تحائف دیئے۔ کچھ مندر تو ان کے محلوں کے احاطے میں تھے یہ ان کے کھُلے ذہن اور وسیع القلبی کا بہترین مظاہرہ اور جیتا جاگتا ثبوت ہے۔ اس سے یہ حقیقت بھی اُجاگر ہوتی ہے کہ سلطان ٹیپو ایک عظیم شہید تھے جو کسی بھی نقطۂ نظر سے آزادی کی راہ کے حقیقی شہید مانے جائیں گے ـــ انھیں اپنی عبادت میں ہندو مناد ر کی گھنٹیوں کی آواز سے کوئی پریشانی نہیں ہوتی تھی [1] سلطان ٹیپو نے آزادی کے لئے لڑتے ہوئے جان دیدی اور دشمن کے سامنے ہتھیار ڈالنے کے مطالبہ کو سرے سے ٹھکرا دیا۔ جب سلطان ٹیپو کی لاش اُن نامعلوم فوجیوں کی لاشوں میں پائی گئی تو دیکھا گیا کہ موت کے بعد بھی ان کے ہاتھ میں تلوار تھی۔

[1] قلعہ میں سلطان کی رہائش گاہ منادر سے کافی دور تھی لہٰذا سلطان کی عبادت گاہ اور عبادت سے گھنٹیوں کی آواز سے کیا واسطہ؟ پریشانی تو تب ہوتی ہے جب فتنہ پرور لوگ عین عبادت کے وقت شر انگیزی شروع کر دیتے ہیں۔ اور جن کا مقصد ہی عبادت میں خلل ڈالنا، مسائل پیدا کرنا جذبات بھڑکا کر فساد کے لئے ماحول تیار کرنا ہوتا ہے۔ مسئلہ مندر کا ساتھ ہوتا نہیں بلکہ شر انگیزی ہے۔

(نوشاد عالم چشتی)

وہ تلوار جو آزادی حاصل کرنے کا ذریعہ تھی ان کے یہ تاریخی الفاظ آج بھی یاد رکھنے کے قابل ہیں کہ ـــــ " شیر کی ایک دن کی زندگی لومڑی کے سو سالہ زندگی سے بہتر ہے " ۔ ان کی شان میں کہی گئی منقبت کے وہ اشعار بھی قابل ذکر ہیں جن میں کہا گیا ہے کہ ـــــ " خدایا جنگ کے خون برساتے بادلوں کے نیچے مرجانا شرم اور بدنامی کی زندگی جینے سے بہتر ہے "

اسی طرح جب میں (ڈاکٹر پانڈے) بلدیۂ عظمیٰ الہ آباد کا چیرمین (Chairman) تھا (۱۹۴۸ء تا ۱۹۵۳ء) تو میرے سامنے داخل خارج کا ایک معاملہ لایا گیا یہ معاملہ سومیشور ناتھ مہادیو مندر سے متعلق جائداد کے بارے میں تھا۔ مندر کے مہنت (Priest) کی فوتگی کے بعد اس جائداد کے دو دعویدار کھڑے ہوگئے تھے۔ (بطور شہادت و ثبوت کے لئے) ایک دعویدار نے کچھ دستاویز داخل کئے جو اس کے خاندان میں بہت دنوں سے چلے آرہے تھے ان دستاویزوں میں شہنشاہ اورنگ زیب عالمگیر کے " فرمان " بھی تھے۔ اورنگ زیب نے اس مندر کو جاگیر اور نقد امداد دی تھی ـــ میں نے سوچا کہ یہ فرمان جعلی ہوں گے۔ مجھے حیرت ہوئی کہ یہ کیسے ہوسکتا ہے کہ اورنگ زیب جو مندروں کو توڑنے کے لئے مشہور ہے وہ ایک مندر کو یہ کہکر جاگیر (کیسے) دے سکتا ہے کہ یہ جاگیر " پوجا " اور " بھوگ " کے لئے دی جارہی ہے۔ آخر اورنگ زیب کیسے بت پرستی کے ساتھ اپنے کو شریک کرسکتا تھا ؟

مجھے یقین تھا کہ یہ دستاویز جعلی ہیں۔ لیکن کوئی فیصلہ لینے سے پہلے میں نے ڈاکٹر سر تیج بہادر سپرو (DR. SIR, TEJ BAHADUR SUPRU) سے رائے لینا مناسب سمجھا۔ وہ عربی اور فارسی کے بہت اچھے عالم تھے۔ میں نے

دستاویزیں ان کے سامنے پیش کرکے ان کی رائے معلوم کی۔ انھوں نے دستاویزوں کے مطالعے کے بعد کہا کہ اورنگ زیب کے یہ فرمان بالکل اصلی اور حقیقی ہیں۔ اس کے بعد انہوں نے اپنے منشی سے بنارس کے جنگم باڑی شیو مندر (کے مقدمے) کی فائل لانے کو کہا۔ یہ مقدمہ الہ آباد ہائی کورٹ میں ۱۵ سال سے زیر غور تھا۔ جنگم باڑی مندر کے مہنت کے پاس بھی اورنگ زیب کے کئی فرمان تھے جن میں مندر کو جاگیر دینے کا حکم جاری کیا گیا تھا۔

ان دستاویزوں نے اورنگ زیب کی ایک نئی تصویر میرے سامنے پیش کی اس صورت حال کے پیش نظر میں محو حیرت تھا۔ ڈاکٹر سپرو کی صلاح پر میں نے ہندوستان کے مختلف بڑے بڑے مندروں کے مہنتوں کے پاس خط لکھ کر ان سے گذارش کیا کہ اگر ان کے پاس اورنگ زیب کے کچھ فرمان ہوں جن میں مندروں کو جاگیریں دی گئیں ہوں تو براہ مہربانی ان کی فوٹو اسٹیٹ کاپیاں میرے پاس بھیج دیں۔ اب میرے پیش نظر ایک اور حیرت کی بات آئی ـــ اجین کے مہاکالیشور مندر، چترکوٹ کے بالاجی مندر، گوہاٹی کے اُمانند مندر، شترنجائی کے جین مندر اور شمالی ہند میں پھیلے دیگر اہم مندروں اور گرودواروں کو عطا کردہ جاگیروں کے متعلق اورنگ زیب کے فرمانوں کے نقول مجھے حاصل ہوئے یہ فرمان ۱۰۵۶ھ تا ۱۰۹۱ھ بمطابق ۱۶۵۹ء تا ۱۶۸۵ء کے بیچ جاری کئے گئے تھے ـــ جو ہندوؤں اوران کے مندروں کے متعلق اورنگ زیب کے اخلاق کریمانہ کی یہ بہترین مثال ہیں، جن سے یہ ثابت ہوجاتا ہے کہ متعصب مورخین نے ان کے متعلق جو کچھ لکھا ہے وہ سب کچھ بغض و حسد تعصب اور جانب دارانہ رویہ پہ مبنی ہے۔ جس سے انکی تصویر کے

ایک منفی رخ کو ہی سامنے لانے کی سازش کی گئی ہے۔ ہندوستان ایک وسیع و عریض ملک ہے جسمیں ہزاروں مندر چاروں طرف پھیلے ہوئے ہیں۔ اگر مناسب ڈھنگ سے کھوج بین کی جائے تو مجھے یقین ہے بہت سی ایسی مثالیں ہمیں مل جائینگی جن سے اورنگ زیب کا غیر مسلم رعایا پر مہربان ہونا اور ان کے ساتھ کئے گئے اخلاق کریمانہ کا پتہ چلے گا۔

اورنگ زیب کے "فرمانوں" کی جانچ پڑتال کے سلسلے میں میرا رابطہ جناب گیان چندر اور پٹنہ میوزیم کے سابق کیوریٹر ڈاکٹر پی سکے گپتا سے ہوا۔ یہ دونوں حضرات بھی اورنگ زیب کے بارے میں تاریخی نقطۂ نظر سے بہت اہم تحقیق کر رہے ہیں۔ مجھے (یہ جان کر) خوشی ہوئی کہ کچھ دیگر محققین بھی سچائی کی تلاش میں مشغول ہیں۔ اور کافی "بدنام" اورنگ زیب کی تصویر کو صاف کرنے میں اپنا اہم کردار ادا کر رہے ہیں۔ اورنگ زیب، جسے جانبدار متعصب مورخین نے ہندوستان میں مسلم حکومت کا نشان مانا ہے اس کے بارے میں وہ کیا خیال رکھتے ہیں اس کے متعلق شبلی جیسے وسیع المشرب مورخ کو بھی کہنا پڑا ہے

تمہیں لے دے کے ساری داستان میں یاد ہے اتنا
کہ اورنگ زیب ہندو کش تھا، ظالم تھا ستمگر تھا (جاری)

Furman of Aurangzeb, dated 1658 A.D

(اورنگ زیب کے فرمان کا ایک عکس)

قسط نمبر ۳

فلسطین کی ممتاز شاعرہ: فدوی طوقان

از: حقانی القاسمی، نئی دہلی

قلبي تفور به الحياة وقد
عمقت ومدت فيه كالأمد
فتهز أغواري نوازعه
ضماية ، رفاقة المدد
ويظل منتظراً على شغف
ويظل مرتقباً على وقد
أحلام محروم تساوره
متوحد في العيش منفرد
ويود لو تمضي الحياة به
للعب ، مصدر فيضها الأبدي

محبت کی اس راہ میں فدوی مابعدالطبیعاتی صورتحال کی طرف پلٹ جاتی ہیں اور کائنات کے بارے میں سوچتی اور سوالات کرتی ہیں تاکہ اسے جواب مل جائے۔ اور ان پوشیدہ سوالات کے جواب جو کسی گہرے فلسفیانہ مسئلے سے متعلق نہیں ہیں اس وقت دور ہو سکتے ہیں، جب فدوی کو کوئی دوست ہو جائے جو انہیں اپنی دونوں

باہوں میں لے کر سمندر کے پار دور حد نگاہ سے دور لے جائے۔

محبوب مل جانے کے بعد محبت کے دوسرے مرحلے میں "یادوں" کی منزل شروع ہو جاتی ہے۔ اس مرحلے میں وہ اپنی محبت میں پہلی ناکامی کا ذکر چھیڑ کر یہ تمنا کرتی ہیں، کہ اگر ان کا دل آزاد ہو جاتا تو فطرت میں کھو کر دل کو بہلا لیتیں اور پھر وہ پہلے سے کہیں زیادہ خستہ حال اور غمگین ہو جاتی ہیں [19] انکی عبارتوں میں گہرائی اور حدت پیدا ہوتی ہے اور ان کی تعبیرات پہلے سے زیادہ سچی نظر آنے لگتی ہیں:

لا لعد، فيم عدت لي؟ هل تبقى اليوم شئ من قلبي المحطوم
لم تدمره بالاكاذيب، لم تسحقه بالغدر، بالجحود الاثيم
كان قلبي يطير في ارفع الاجواء مغرى بالحالم المكتوم

سمجھا یہ جاتا ہے کہ فدوی محبوب کے مل جانے کے بعد جب ناکام ہو گئیں تو ان پر ایک طرح کی مایوسی اور خستہ حالی طاری ہو گئی۔ اور ناامیدی گہری ہوتی گئی لیکن انہوں نے ایسا نہیں کیا، بلکہ وہ خود سے لڑتی رہیں۔ اور اپنے بے وفا دوست، دل اور ان لمحوں پر لعنت بھیجتی رہیں جب ایک دوسرے سے شناسائی ہوئی تھی۔ لیکن جس وقت اس کی یادوں کو دہراتی ہیں تو خود کو خوش نصیب محسوس کرتی ہیں اور ان گزرے ہوئے لمحوں کو خوشگوار سمجھتی ہیں اور ان مقامات اور راستوں کو تلاش کرتی ہیں۔ جہاں وہ اپنے دوست کے ساتھ گھومتی پھرتی تھیں [20] بالکل روایتی شاعروں کے

---

[19] شاکر النابلسی: فدوی تشتبک مع الشعر۔ ص ۳۸، ۷۱۔

[20] شاکر النابلسی: فدوی تشتبک مع الشعر ص ۴۲

انداز میں اور خوبصورت یادوں کے نشے سے سرشار ہو کر کہتی ہیں۔ کہ اس جدائی میں میرا کوئی قصور نہیں۔ یہ تو سماج کی پابندیوں اور سختیوں کی وجہ سے ہوئی ہے:

هذا امكانك، اهنا محراب شوقي وحبي
كم جثة والدمع، دمع الشوق مختلج بهدبي
كم جثة والذكريات تفيض من روحي وقلبي۔
هذا امكانك عقل روحي فيه احساس كئيب
متعسر۔۔ يعيد الى الماضي، الى الامس الحبيب
ثم۔۔۔۔۔!
ذنبي؟ وما ذنبي الا ويلاه من ظلم الهيود
ماحيلتي والغل في عنقي على حبل الوريد

فدوی اپنے رومانوی احساسات کے سلسلے میں متضاد رویے کی حامل نظر آتی ہیں۔ وہ مکمل طور سے عجیب و غریب تصادم اور تخالف (schizophrenia) کی شکار ہیں۔ کبھی محبوب کے لوٹ کر نہ آنے کے بارے میں سوچتی ہیں۔ اور کہتی ہیں کہ اب لوٹ کر آنے سے کیا فائدہ۔ میرے شکستہ دل میں کیا رہ گیا ہے:

لا تعد، فيم عدت لي؟ هل تبقى اليوم شئ من قلبي المحطم
آه! دعني انشد سكينة روحي فوق مهد الطبيعة المسحور

دوسری طرف وہ چاہتی ہیں کہ وہ لوٹ کر آئے۔ بہت ہی شوق اور لگن کے ساتھ محبوب کے لوٹ آنے کا انتظار کرتی ہیں۔ نغمے بکھیرتی ہیں۔ بانسری بجاتی ہیں اور جدائی کے لمحوں اور وجود پر عتاب کرتی ہیں:

قلبي يلوب في الم، يسائل في شرود:

لم لا یعود؟ فلا یجیب سوی الصدی! "لم لا یعود"

والروح، فی شفق اشعار، وفی کفی عود

واعانیب الأیام.. والزمن المفرق.. والوجود

اوران شعروں میں آتش شوق کو اور تیز کرتی ہوئی کہتی ہیں:

لم لا تعود؟ اناھنا وحدی بھیکل ذکریاتی

وحدی، ولکنی أصدی فی دمی، فی عالمفاتی

اصغی لصوتک، للصدی المنغوم فی اغوار ذاتی

وارواک من حولی، وفی وملء آفاق الحیاۃ "

اس سے ان کے متضاد احساسات کا اندازہ ہوتا ہے لیکن بنیادی طور پر نہ تو وہ مردوں سے نفرت کرتی ہیں اور نہ ہی محبت کو ناپسند، بلکہ مردوں سے قریب ہونے کے لئے بھاگتی ہیں، اور محبت کی خاطر ہی نفرت کرتی ہیں۔

فدوی کے دوسرے دیوان "وجدتھا" میں محبت ایک نئی شکل اور نئے مفہوم کے ساتھ سامنے آتی ہے۔ اس دیوان میں شاعرہ پختہ شعور کی ہوگئی ہے اور اکثر سوچتی رہتی ہے اور اپنے دھڑکتے دل کی دھڑکنوں کو سنتی رہتی ہے۔ اس دیوان میں محبت ایک حتمی اور یقینی قدر کی حیثیت سے ہے جس سے بھاگ کر تنہائی، عزلت تاریکی، عذاب اور نفسیاتی شکست وریخت میں پناہ لینے کی کوئی سبیل نہیں ہے اور محبت کرنے والوں کو اس سے آزادی ممکن نہیں خواہ اسے بھولنے کی کوشش کریں یا بھلادیں [۲۱]:

---

۲۱ شاکر النابلسی: فدوی تشتبک مع الشعر، ص ۴۴۔

فکیف الفراق حبیب دایننا
ونحن ندور ونجزی ونهرب
منا الینا
سدی و محال

لا سدی لا الفتاق
لنا لا الفصال
محال حبیبی محال

"وجدتها" میں وہ کھلے طور پر محبت کا اظہار کرتی ہیں۔ اور سماج کی زنجیروں اور معاشرتی روایات توڑ ڈالنے پر ہر طرح سے آمادہ ہیں جبکہ "وحدی مع الایام" میں اپنے جذبات کا دبے دبے انداز سے اظہار کرتی تھیں۔ اور بار بار دائیں بائیں دیکھ کر " احبک " کہتی تھیں، اور پھر یہ سوچ کر کانپ جاتی تھیں کہ دوبارہ یہ لفظ دہرانے پر کوئی سن نہ لے۔ جبکہ "وجدتها" میں محبت کو اپنا حق سمجھتی ہیں، اور زندگی کے لئے انتہائی ضروری قرار دے کر اس کے مقابلے میں دنیا کی ساری چیزوں کو ہیچ گردانتی ہیں۔[۲۲]

"وحدی مع الایام" میں فدوی کلاسیکی اثر پیدا کرنے کے لئے روایتی لوگوں کی تقلید کرتی ہیں۔ اسی لئے اپنی محبت اور یادوں کے سلسلے میں اس بچی کا سا رویہ اختیار کرتی ہیں جو کسی بھی چیز پر بہت جلد روٹھ جاتی ہے۔ جب محبوب چیز سے دوری ہو یا جدا ہو جائے تو اسے کوسنے لگتی ہے۔ اور اس کے

۲۲؎ شاکر النابلسی؛ فدوی تشتبک مع الشعر، ص ۴۵۔

ساتھ گزارے ہوئے خوبصورت و خوشگوار لمحوں کے بارے میں سوچے بغیر یہ چاہنے لگتی ہیں، کہ وہ کبھی لوٹ کر نہ آئے۔ یہ اس بات کی دلیل ہے کہ وہ اپنے ہر کام پر خوفزدہ ہیں خواہ گفتگو ہو، یا ملاقات اور خوف زدہ انسان یہ کبھی یاد نہیں رکھ پاتا کہ اس نے کیا کیا، کیا کہا اور یہ کیسے ہوا؟ ... وہ تو دنیا سے غائب ہوتا ہے اس لئے فدوی ملاقات کے لمحوں کے بارے میں سوچنے کی کوشش نہیں کرتیں۔ ... اسکے برعکس "وجد تھا" میں ان خوبصورت لمحوں کو شعوری طور پر یاد کرتی ہیں "ذکریات" ایسا ایک قصیدہ ہے۔ جو گزرے لمحوں کی مکمل تصویر ہے:

وفی غمرة الحب (مرت) یدای۔

بلا فوق الحسنات

ودف الامان　　　علی رعشات الجبین الندی

(ووسدت) لا سلٹ قلبا قلبی سخی۔

"اعطنا حبا" میں فدوی کی محبت کا تیسرا مرحلہ شروع ہوتا ہے۔ یہ سابق دو مرحلوں سے زیادہ مختلف نہیں ہے۔ محبت کے وہی مفاہیم ہیں مگر یہ مرحلہ اس اعتبار سے مختلف ہے کہ فدوی محبت میں شک کرنے لگتی ہیں۔ اور اس شک و شبہ کے پیچھے یہ احساس بھی کارفرما ہے کہ گویا وہ خواب دیکھ رہی ہیں۔ اور یہ کہ وہ خوبصورت دن جن میں "وجد تھا" کے قصیدوں نے جنم لیا تھا حقیقی اور واقعی نہیں تھے وہ ایک بچی کے مجرد خواب کی مانند تھے، فدوی محبت کو دھوکہ اور فریب کہکر متہم کرتی ہیں۔ دراصل یہ شک اس تلخ تجربے کی دین ہے جس سے وہ "وحدی مع الایام" اور "اعطنا حبا" کے دوران گزری ہیں، اسی لئے کہتی ہیں:

اصحابك يوما؟ وكيف؟ ؛ ام كنت طيفا بحلم عبر
وهب كنت طيفا تعشقته ؛ فكيف تلاشى الهوى وانتثر

امامن بقايا؟ امامن اثر؟

اس میں شک اور خواب کا احساس اس قدر گہرا ہوا کہ وہ دوبارہ تاریکی تنہائی۔ عذاب اور الم کی طرف انفعالی کیفیت کے ساتھ لوٹ کر آگئیں۔ ایک قصیدہ "القصيدة الاخيرة" لکھ کر اس محبت کو الوداع کر دیا۔ جو اسے زندگی نہ بخش سکی[۲۳]

(۴)

معاصر عربی شاعری میں مرثیے کو وہ نمایاں حیثیت حاصل نہیں ہے جو سابقہ زمانوں میں تھی، قدیم زمانے میں اکثر معاشی خوش حالی کے حصول کے لئے شاعر مرثیہ کہہ دیا کرتا تھا۔ جو صداقت اور سچے فنی شعور سے عاری ہوا کرتا تھا۔ طٰہٰ حسین کی تعبیر کے مطابق یہ مرثیے "کراس الفراشین" کی طرح ہوتے ہیں جس میں ایک ہی مرثیہ ناموں کی تبدیلی کے ساتھ مختلف لوگوں کے لئے استعمال کرتے ہیں اور اس کی کوئی قدر و قیمت نہیں ہوتی ہے۔ عربی ادب میں ایسے بھی مرثیے ہیں جس میں جذباتی تاویل[۲۴] (Pathetic Fallacy) پائی جاتی ہے جیسے مطیع بن ایاس کا یہ شعر:

فسئى لى ابوالمقدام فاسود منظرى ؛ من الارض واستكمت على المسامع

"مجھ کو جب ابوالمقدام کی موت کی خبر سنائی گئی تو میری آنکھوں میں زمین سیاہ

---

[۲۳] شاکر النابلسی؛ فدوی تشتبک مع الشعر ص ۵۰ ۵۱۔
[۲۴] تفصیل کے لئے دیکھئے، سلام سندیلوی: مراثی انیس میں جذباتی تاویل۔

ہو گئی اور میرے کان بہرے ہو گئے۔"

ظاہر ہے کہ زمین سیاہ نہیں ہے مگر شاعر موت سے اس درجہ متأثر ہے کہ اسے سیاہ نظر آرہی ہے۔ اس طرح کے مرثیوں میں جذباتیت تو ہوتی ہے مگر صداقت نہیں۔ اور اس نوع کے قصیدے بہت ہیں۔ اس کے باوجود اس سے انکار ممکن نہیں کہ عربی میں مرثیے کے کچھ عمدہ شعری نمونے موجود ہیں۔ ان میں سب سے اچھے وہ ہیں جو ابن الرومی نے اپنے بچوں، متنبی (م ۳۵۴ھ) نے اپنے جدامجد اور نزار قبانی (۱۹۲۳ء) نے اپنی بیوی کی موت پر کہے ہیں۔ ابن الرومی اپنے فنی تجربے میں صادق ہیں اور نزار قبانی نے اپنی بیوی کی موت کو عام کائناتی مسئلے سے جوڑ کر مرثیہ کی ایک بہتر روایات کا آغاز کیا ہے انھوں نے اپنی رفیقۂ حیات "بلقیس" کی موت کو دنیا میں عموماً اور عالم عرب میں خصوصاً انسانی اقدار کی موت قرار دیا ہے[25]

مرثیے ہی کے ذریعہ بنی سلیم کی شاعرہ خنساء بنت تماضر (م ۶۴۶ء) اور فلسطینی شاعرہ فدوی طوقان ایک دوسرے کے بہت قریب نظر آتی ہیں۔ دونوں کی صورت حال بھی اس معنی میں یکساں ہے کہ خنساء کو اپنے دو بھائیوں (معاویہ و صخر) کی جدائی کا غم تھا، اور فدوی کو بھی اپنے دو بھائی (ابراہیم اور نمر) کے بچھڑ جانے کا رنج ہے۔

خنساء کے بارے میں بیشتر ناقدین فن کا اتفاق ہے کہ صخر کے بارے میں انکا لکھا ہوا مرثیہ عربی شاعرات کے مراثی میں سب سے بہتر ہے۔ جدید تنقید کی روشنی میں اگر اسے دیکھا جائے تو اس میں الفاظ، حزنیہ موسیقی، اور ردھن کے سوا کچھ بھی نہیں ہے۔ جہاں تک نفس مضمون کی بات ہے تو وہ صخر کی زندگی کے صفات اور

---

[25] شاکر النابلسی: فدوی تشتبک مع الشعر۔

فضائل کے اردگرد گھومتا ہے مرثیے میں نہ تو کامیابی ارتقاء ہے اور نہ ہی حرکت
وزمانے سے مملو اور اس میں سب سے بڑا عیب یہ ہے کہ اس کی ساری توجہات میت
پر مرکوز ہیں. خنسار نے اس عظیم سانحے کے تئیں اپنے جذبات و تموجات کی تصویر کشی
نہیں کی ہے. دوسری بات یہ ہے کہ خنسار نے اپنے بھائی کی موت پر حزن [illegible]
کا اظہار کیا ہے ایسے اپنے بھائی کی زندگی میں بھی ظاہر کر سکتی تھیں تو پھر ان کی [illegible]
کا خنسار پر کیا ردعمل ہوا؟ یہ ان کے مرثیے سے قطعی طور پر ظاہر نہیں ہوتا۔
بنی سلیم کی شاعرہ کا مرثیے میں جو انداز ہے وہ مضمون کے اعتبار سے نوحہ
کرنے والیوں سے ذرا بھی مختلف نہیں ہے۔ اور فدوی جنہیں بہت سے ناقدین
بیسویں صدی کی خنسار کے نام سے یاد کرتے ہیں. ہیئت اور مضمون دونوں
ہی لحاظ سے خنسار سے مغائر انداز رکھتی ہیں، ہیئتی اعتبار سے گو کہ انہوں نے بھی
نوحہ کرنے والیوں کا سا انداز اپنایا ہے، مگر موضوعاتی اعتبار سے ان سے مختلف
ہیں. کیونکہ انہوں نے حزنیاتی جذبات کی انتہائی حساسیت کے ساتھ تصویر کشی
کی ہے . . . . اور مرثیہ "حلم الذکری" میں تو اپنے بھائی کی موت کو وطنی مسئلے سے
مربوط کر دیا ہے۔ اور اس المیے کو قومی المیے کی طرف منتقل کر دیا ہے۔ اس میں
فنی بلندی بھی ہے اور انفرادی انداز بھی ہے لیکن اگر وہ اپنے بھائی کی موت
کو انسانی المیے سے مربوط کرتیں تو ان کے اشعار کی قدر و قیمت اور بڑھ جاتی
جس طرح کہ اندریہ بریتون (Andre Breton) نے شارل فوربیہ کی موت کو انسانیت
اور انسانی اقدار کی موت قرار دیا ہے۔ بلکہ ان کے جذبات اس انجام کی طرف مشیر ہیں
جس سے انسانیت ان کی موت کی وجہ سے دوچار ہو گئی ہے [26]۔

---

[26] شاکر النابلسی؛ فدوی تشتبک مع الشعر۔ ص ۵۸۔ ۶۶۔

فدوی نے اس عملی تحریک میں باضابطہ شریک ہوکر "لن ابکی" کے عنوان سے ایک قصیدہ مجلہ (الاتحاد) میں شائع کرایا۔ جو جون کی اسرائیلی جارحیت کے بعد پہلا قصیدہ تھا جس میں وہ منفی مرحلے سے ایجابی اور انفتاحی مرحلے میں آگئیں، یعنی وہ علیحدگی پسندی اور رومانوی روے (Isolationism and romantic) سے واقعیت (Realism) کے رویے کی طرف لوٹ گئیں، اسی لئے وہ فدائیانہ عمل پر مکمل ایقان کے ساتھ مقاومتی شعراء کو خطاب کرتے ہوئے کہتی ہیں:

" احبائی . حصان الشعب جاوز كبوة الامس
وهب الشهم منتفضا وراء النهر :: اصيخوا... هاحصان الشعب يصهل
واثق النهمة - ويفلت من حصار النحس والعتمة
ويعدو نحو مرفئة على الشمس :: وتلك مواكب الفرسان ملتمة
تباركه وتفديه " [۲۷]

طویل خاموشی کے بعد جو مثبت استقلال اور متحرک ساخت کے نمونے ان کی شاعری میں ملتے ہیں وہ ایسی حقیقی قوم کے وجدان کی نمائندگی کرتے ہیں جو فتح حاصل کرنے اور آزادی کے مقصد میں کامیاب ہونے کے لئے مصمم ارادہ کئے ہوئے ہے۔

جون سے قبل بھی فدوی نے بہت سے قصیدوں میں داخلی پریشان کن حالات کی تصویر کشی کی ہے اور اپنے حق خود ارادیت اور قومی تشخص کی بھی بات کہی ہے

---

۲۷ ممدوح السکاف: "رحلة فی عالم فدوی طوقان" شئون فلسطينية (اغسطس ۱۹۷۴)

فضائل کے ارد گرد گھومتا ہے مرثیے میں نہ تو نامیاتی ارتقاء ہے اور نہ ہی حرکت وزمانے سے مملو۔ اور اس میں سب سے بڑا عیب یہ ہے کہ اس کی ساری توجہات ہیئت پر مرکوز ہیں۔ خنسار نے اس عظیم سانحے کے تئیں اپنے جذبات و تموجات کی تصویر کشی نہیں کی ہے۔ دوسری بات یہ ہے کہ خنسار نے اپنے بھائی کی موت پر جن جذبات کا اظہار کیا ہے اسے اپنے بھائی کی زندگی میں بھی ظاہر کر سکتی تھیں تو پھر ان کی موت کا خنسار پر کیا ردعمل ہوا؟ یہ ان کے مرثیے سے قطعی طور پر ظاہر نہیں ہوتا!

بنی سلیم کی شاعرہ کا مرثیے میں جو انداز ہے وہ مضمون کے اعتبار سے نوحہ کرنے والیوں سے ذرا بھی مختلف نہیں ہے۔ اور فدوی جنہیں بہت سے ناقدین بیسویں صدی کی خنسار کے نام سے یاد کرتے ہیں۔ ہیئت اور مضمون دونوں ہی لحاظ سے خنسار سے مغائر انداز رکھتی ہیں، ہیئتی اعتبار سے گو کہ انہوں نے بھی نوحہ کرنے والیوں کا سا انداز اپنایا ہے، مگر موضوعاتی اعتبار سے ان سے مختلف ہیں۔ کیونکہ انہوں نے حزنیاتی جذبات کی انتہائی حساسیت کے ساتھ تصویر کشی کی ہے . . . . اور مرثیہ " علم الذکری " میں تو اپنے بھائی کی موت کو وطنی مسئلے سے مربوط کر دیا ہے۔ اور اس المیے کو قومی المیے کی طرف منتقل کر دیا ہے۔ اس میں فنی بلندی بھی ہے اور انفرادی انداز بھی ہے لیکن اگر وہ اپنے بھائی کی موت کو انسانی المیے سے مربوط کرتیں تو ان کے اشعار کی قدر و قیمت اور بڑھ جاتی جس طرح کہ اندریہ بریتون (Andre Breton) نے شارل فوربیہ کی موت کو انسانیت اور انسانی اقدار کی موت قرار دیا ہے۔ بلکہ ان کے جذبات اس انجام کی طرف مشیر ہیں جس سے انسانیت ان کی موت کی وجہ سے دوچار ہو گئی ہے[۲۶]۔

---

۲۶ شاکر النابلسی؛ فدوی تشتبک مع الشعر۔ ص ۵۸ - ۶۶۔

فدوی نے اس عملی تحریک میں باضابطہ شریک ہو کر "لن أبكي" کے عنوان سے ایک قصیدہ مجلہ (الاتحاد) میں شائع کرایا۔ جو جون کی اسرائیلی جارحیت کے بعد پہلا قصیدہ تھا جس میں وہ منفی مرحلے سے ایجابی اور انفتاحی مرحلے میں آگئیں، یعنی وہ علیحدگی پسندی اور رومانوی روے(Isolationism and romanticism) سے واقعیت (Realism) کے رویہ کی طرف لوٹ گئیں، اسی لئے وہ فدائیانہ عمل پر مکمل ایقان کے ساتھ مقاومتی شعراء کو خطاب کرتے ہوئے کہتی ہیں:

"احبائی - حصان الشعب جاوز کبوة الامس
وهب الشهم منتفضا وراء النهر؛ أصيخوا... هاحصان الشعب يصهل
واثق النهمة - ويفلت من حصار النحس والعتمة
ويعدو نحو مرفئة على الشمس؛ وتلك مواكب الفرسان ملتمه
تبارکه وتفدیه"[۲۷]

طویل خاموشی کے بعد جو مثبت استقلال اور متحرک ساخت کے نمونے ان کی شاعری میں ملتے ہیں وہ ایسی حقیقی قوم کے وجدان کی نمائندگی کرتے ہیں جو فتح حاصل کرنے اور آزادی کے مقصد میں کامیاب ہونے کے لئے مصمم ارادہ کئے ہوئے ہے۔

جون سے قبل بھی فدوی نے بہت سے قصیدوں میں داخلی پریشان کن حالات کی تصویر کشی کی ہے اور اپنے حق خود ارادیت اور قومی تشخص کی بھی بات کہی ہے

۲۷ ممدوح السکاف: "رحلة فی عالم فدوی طوقان" شئون فلسطینیہ (اغسطس ۱۹۷۴ء)

اس مسئلے میں فنی ساخت اور بنت کے لحاظ سے ایک عمدہ قصیدہ "ندا الارض"[28] ہے جس میں ایک پناہ گزین کے اپنے گم شدہ وطن پر تاسف کی عکاسی کی گئی ہے:

تمثل ارضا نمته وغذته ∴ من صدرها الثر شیئا وطفلا

تمثل وهو یلوب انتقاض ∴ ثراها اذا ما الربیع اطلا

وماج بعینیه کنز السنابل ∴ یحضنه الحقل خیرا مطلا

ولاح له شجر البرتقال ∴ وهو یرف عبیرا وظلا

وهاتت به فکرة کالعواصف لاتستقر ∵ تواکب تلك الطیوق تساءل تلك الصور

الغصب ارضی؟ ایسلب حقی وابقی انا؟ ∵ حلیف التشرد اصحب ذلة عاری هنا

أابقى هنا لاموت غریبا بارض غریبه ∵ أأبقى؟ ومن قالها؟ ساعود لارضی الحبیبه

" اسے اس سرزمین کی یاد آ رہی ہے جہاں وہ پلا بڑھا تھا، جس نے اسے غذا مہیا کی تھی، اپنے مامتا بھرے سینے سے بچپن سے لے کر ملک چھوڑنے تک وہ مچلتے ہوئے ان مناظر کو یاد کرتا ہے جو موسم بہار کی کھنکھناہٹ پیش کرتے ہیں، اور گیہوں کے ان کھیتوں کو بھی جو ہوا کے چلنے سے لہلہا رہے ہیں خوشی اور غم کے ملے جلے تأثر کے ساتھ یاد کرتا ہے۔ کیونکہ یہ ساری چیزیں اس کے لئے بیش بہا خزانہ تھیں۔ اس نے نارنگی کے ان درختوں کو دیکھا تھا جو چاروں طرف پھیلے ہوئے ہیں۔ جن کی مہک اور سائے میں وہ اپنا وقت گزارا کرتا تھا، تبھی اسکے ذہن میں ایک طوفانی خیال انگڑائی لیتا ہے جسے سوچ کر وہ بجھ سا جاتا ہے کہ کاش میں اپنی زمین دوبارہ دیکھ سکتا جو مجھ سے چھین لی گئی ہے اور جس کے چھن جانے

28. Khalid A. Sulaiman, Palestine and Modern Arab Poetry (London, 1984) pp 124-126.

کے سبب میں در در کی ٹھوکریں کھا رہا ہوں اور میرے پاس شرم و ندامت کے سوا کچھ بھی نہیں ہے۔ کیا میں یہیں پر اپنی سرزمین سے کوسوں دور ایک اجنبی مقام پر اجنبی کی طرح موت کی آغوش میں سو جاؤں گا۔ میں باقی رہوں گا؟ کس نے کہا یہ؟ میں اپنی زمین کی طرف ضرور لوٹوں گا"

ایسے ہی جذبے کے ساتھ پناہ گزیں بہار کی ایک رات میں اپنا کیمپ چھوڑ دیتا ہے، صاف آسمان میں ستاروں کے ذریعے اپنی زمین کی طرف بڑھنے لگتا ہے۔ دور ہی سے وہ "یافا" کی روشنیوں کو دیکھتا ہے۔ وہاں کی ہواؤں کی خوشبو محسوس کرتا ہے، سرحد کے قریب پہونچکر وہ رک جاتا ہے۔ وہ یہ جانتا ہے کہ اسے پار کرنا اپنی زندگی کی قیمت چکانا ہے۔ مگر یہ سوچ کر کہ اپنی زمین کی خاک میں مرنا سعادت کی بات ہے، کسی بات کی پرواکئے بغیر سرحد کو پار کرتا ہے، اور اپنے خواب کو حقیقت میں بدلنا محسوس کرتا ہے۔ ذیل کی چند سطریں اس قصیدے کی کلائمکس ہیں جس میں پناہ گزیں کو حد درجہ جذباتی دیکھایا گیا ہے۔

واهوی علی ارضه فی انفعال یلثم ثراها ☆ یعانق اشجارها ویضم لآلی حصاها

ومرّغ کالطفل فی صدرها الرجب خدا و فم ☆ والقی علی حضنها کل ثقل سنین الالم

وهزته انفاسها وهی ترتعش رعشة حب ☆ واصغی الی قلبها وهو یهمس همة عتب

رجعت لی؟!

رجعت الیک وهذی یدی

سابقی هنا، سا موت هنا؟ هیئی مرقدی

وکانت عیون الله والنیم علی خطوتین ☆ رمته بنظرة حقد ونقمة

اس مسئلے میں فنی ساخت اور بنت کے لحاظ سے ایک عمدہ قصیدہ "نداء الارض"[28] ہے جس میں ایک پناہ گزین کے اپنے گم شدہ وطن پر تأسف کی عکاسی کی گئی ہے:

تمثل ارضا نمته وغذته	⁘	من صدرها الثر شيخا وطفلا
تمثل وهو يلوب انتفاض	⁘	ثراها اذا ما الربيع اهلا
وماج بعينيه كنز السنابل	⁘	يحضنه الحقل خيراً مطلا
ولاح له شجر البرتقال	⁘	وهو يرف عبيرا وظلا

وهاتف به فكرة كالعواصف لا تستقر ⁘ تراكيف تملك الطيوق تساءنا تملك العوى، الغصب ارضى؟ ايسلب حقي وابقى انا ⁘ عليف التشرد اصحب ذلة عارى هنا ءابقى هنا لاموت غريبا بارض غريبة ⁘ ءابقى؟ ومن قالها؟ ساعود لارضي الحبيبة

" اسے اس سرزمین کی یاد آرہی ہے جہاں وہ پلا بڑھا تھا، جس نے اسے غذا مہیا کی تھی، اپنے ممتا بھرے سینے سے بچپن سے لے کر ملک چھوڑنے تک وہ مچلتے ہوئے ان مناظر کو یاد کرتا ہے جو موسم بہار کی کھنکھناہٹ پیش کرتے ہیں، اور گیہوں کے ان کھیتوں کو بھی جو ہوا کے چلنے سے لہلہا رہے ہیں خوشی اور غم کے ملے جلے تأثر کے ساتھ یاد کرتا ہے۔ کیونکہ یہ ساری چیزیں اس کے لئے بیش بہا خزانہ تھیں۔ اس نے تازگی کے ان درختوں کو دیکھا تھا جو چاروں طرف پھیلے ہوئے ہیں۔ جن کی مہک اور سائے میں وہ اپنا وقت گزارا کرتا تھا، تبھی اسکے ذہن میں ایک طوفانی خیال انگڑائی لیتا ہے جیسے سوچ کر وہ بجھ سا جاتا ہے کہ کاش میں اپنی زمین دوبارہ دیکھ سکتا جو مجھ سے چھین لی گئی ہے اور جس کے چھن جانے

28. Khalid A. Sulaiman, Palestine and Modern Arab Poetry (London, 1984) pp 124-126.

کے سبب میں در در کی ٹھوکریں کھا رہا ہوں اور میرے پاس شرم و ندامت کے سوا کچھ بھی نہیں ہے۔ کیا میں یہیں پر اپنی سرزمین سے کوسوں دور ایک اجنبی مقام پر اجنبی کی طرح موت کی آغوش میں سو جاؤں گا۔ میں باقی رہوں گا؟ کس نے کہا یہ؟ میں اپنی زمین کی طرف ضرور لوٹوں گا"

ایسے ہی جذبے کے ساتھ پناہ گزیں بہار کی ایک رات میں اپنا کیمپ چھوڑ دیتا ہے، صاف آسمان میں ستاروں کے ذریعے اپنی زمین کی طرف بڑھنے لگتا ہے۔ دور ہی سے وہ "یافا" کی روشنیوں کو دیکھتا ہے۔ وہاں کی ہواؤں کی خوشبو محسوس کرتا ہے، سرحد کے قریب پہونچکر وہ رک جاتا ہے۔ وہ یہ جانتا ہے کہ اسے پار کرنا اپنی زندگی کی قیمت چکانا ہے۔ مگر یہ سوچ کر کہ اپنی زمین کی خاک میں مرنا سعادت کی بات ہے، کسی بات کی پروا کئے بغیر سرحد کو پار کرتا ہے، اور اپنے خواب کو حقیقت میں بدلتا محسوس کرتا ہے۔ ذیل کی چند سطریں اس قصیدے کی کلائمکس ہیں جس میں پناہ گزیں کو حد درجہ جذباتی دیکھا یا گیا ہے۔

واهوى على ارضه في انفعال يشم ثراها ٭ يعانق اشجارها ويضم لآلي حصاها

ومرغ كالطفل في صدرها الرحب خدا وفم ٭ والقى على حضنها كل ثقل سنين الالم

وهزته انفاسها وهي ترتعش رعشة حب ٭ واصغى الى قلبها وهو يهمس همسة عتب

رجعت لي؟!

رجعت اليك وهذي يدي

سابقى هنا، ساموت هنا؟ هيئ مرقدي

وكانت عيون الله واللئيم على خطوتين ٭ رمته بنظرة حقد ونقمة

کما یرشق المتوحش سہمہ ٭ ومزق جوف الکون المہیب ملأ لقتین

"اپنی سرزمین کی سرحد پر پہونچتے ہی وہ جذباتی ہو جاتا ہے۔ اس پاس کے درختوں کو والہانہ دیوانہ وار بوسہ لیتا ہے اور وہاں کے چھوٹے چھوٹے اینٹ اور پتھر کے ٹکڑوں کو جو اس کے لئے انتہائی قیمتی ہیں سمیٹنے لگتا ہے اور وہ اپنی مٹی کی خوشبو سے بے چین ہو جاتا ہے اور بالکل اس معصوم بچہ کی طرح جو اپنی ماں کے پاس جاتا ہے تو دل سے خوف نکل جاتا ہے۔ اور وہ اپنی مٹی پر اپنے منہ اور گال کو رگڑتا ہے وہ اپنے دل کی دھڑکن کو سنتا ہے اور اس آواز کو جو اس کی سرزمین کے ذرے ذرے سے نکلتی ہے اور یہ پوچھتی ہے کہ کیا تم دوبارہ لوٹ آئے ہو؟ اور جواب دیتا ہے کہ ہاں! کیونکہ تم میری ماں ہو وہ اپنا ہاتھ اس پر رکھ دیتا ہے اور یہ کہتا ہے کہ اب میں یہیں رہوں گا اور یہیں مروں گا اور یہیں میری قبر بنے گی، دو قدم آگے لئیم دشمن اپنا منہ کھولے کھڑا ہے۔ ان کی آنکھوں میں نفرت کے تیروں کے سوا کچھ بھی نہیں ہے۔ اور اسی لمحے دو گولیوں کی آوازرات کے سناٹے کو توڑ دیتی ہے شاید اس کے دشمن نے اسے دیکھتے ہی ختم کر دیا"

اسی طرح فدوی نے "رقیہ" میں پناہ گزین عورت کی متحرک تصویر پیش کی ہے جو انسانی احساسات (Human sentiments) پر مبنی ہے جس میں نہ تو مذہبی جوش وولولہ (religious enthusian) ہے اور نہ ہی نسلی تعصب و تشدد (Racial Fanatici tism) اس قصیدے کے کچھ نمائندہ شعر پیش ہیں جو پناہ گزیں کی حالت زار کی وضاحت کرتے ہیں؛

تعلق شئ کفرخ مہیض ٭ علی صدرہا الواھن المرتعد

وقد وسدت راسہ ساعدا ٭ وسدت بآخر عرق الجسد

(باقی ص ۹ پر)

سرپرست اعلیٰ

عالیجناب حکیم عبدالحمید — چانسلر جامعہ ہمدرد

نگران اعلیٰ

حضرت مولانا حکیم محمد زماں حسینی

نومبر و دسمبر ۱۹۹۶ء

برہان

جلد ۱۱۸، ۱۱۹ — شمارہ ۱۲،۱۱

اس شمارے میں

مجلس ادارت [illegible]

دفتر رابطہ

Nadwatul-Musannefeen

4136, Urdu Bazar, Jama Masjid, Delhi-110006

نظرات

انسانی نفسیات کے اسباق میں ایک سبق یہ بھی ہے کہ کوئی شخص کسی سے انتقام لینے کی غرض سے اگر کسی کو "پالتا" ہے اس پر قیمتی سے قیمتی اشیاء خرچ کرتا ہے اس خیال سے کہ اس پر جتنا مال خرچ کیا جائے گا اسی شدت اور طاقت سے یہ دشمن سے انتقام لے سکے گا۔ مگر یہ بات خام خیالی ہی ہے "پالتو" موقع دیکھ کر اپنے مالک کو ہی ڈس لیتا ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ مالک کی بے جا ناز برداری اس کو اس قدر خود غرض اور بدست بنا چکی ہوتی ہے کہ وہ کسی دوسرے سے تو کیا نپٹے گا اپنے ہی مالک کو نشانۂ خود غرضی بنا ڈالتا ہے۔ کتّے کے سلسلے میں مشہور ہے کہ وہ مالک کا بڑا وفادار ہے۔ مگر جب کتّے کو کسی بھی وجہ سے ہڈی نہیں ملتی ہے تو پھر وہ اپنے مالک کو بری طرح سے کاٹ ڈالتا ہے ــــ دشمن سے انتقام لینے کے چکر میں بے چارہ شخص اپنی خیر منانے کی جستجو اور فکر میں لگ جاتا ہے۔ یہ انسانی نفسیات کا نہ بھولنے والا سبق جب کوئی بھول جاتا ہے تو پھر اس کی کم بختی کا علاج مشکل ہی سے ہو پاتا ہے

[illegible] کے عین وقت میں ایک [illegible]
[illegible] کرتا تھا [illegible] پر اس [illegible]
[illegible] کے ایک بہت ہی ذمہ دار اور [illegible]
[illegible] عام بھی اس کی [illegible]
[illegible] ہندوستان کا [illegible]

میں بمبئی میں پارلیمنٹ کی ایک سیٹ پر ضمنی انتخابات میں سابق وزیر دفاع مسٹر کرشنا مینن سے بدلہ چکانے کی خاطر مسٹر موڑ مے کو کامیاب کرانے اور کرشنا مینن کو ہرانے کے لئے اس کارٹونسٹ شخص کی مہم کوشش کامیاب ہو کر رہیں اور سابق وزیر دفاع کرشنا مینن اپنی عمر کے آخری دور میں اپنی زندگی کی پہلی اور آخری شکست سے دوچار ہو کر رہے۔

چونکہ اب ہم اس کارٹونسٹ شخص کے بارے میں مزید کچھ بتانا چاہتے ہیں تو یہاں بار بار اس کے لئے کارٹونسٹ شخص لکھنا نامناسب معلوم ہوتا ہے تو اس کی شخصیت کے مناسب حال کوئی نام ہمیں رکھنا ہوگا ڈکشنری میں جو بھی گندہ سے گندہ نام ہے وہ بھی اس مردود و ملعون کی شخصیت پر چسپاں کرنے کے لئے کم ہے۔ لیکن ہمیں اپنی تہذیب و شرافت کا بھی لحاظ ہے۔ اس لئے اس شیطان و ملعون کے لئے ہم ہلکے ہلکا اس کے حسب حال نام "بدبخت کم ظرف" رکھ رہے ہیں آگے اس کے ذکر کے ذیل میں "بدبخت کم ظرف" ہی اس کے نام کے طور پر ہم استعمال کریں گے۔

بمبئی کے باہر کے لوگوں کو بمبئی سے باہر نکالنے کی مہم بس اس حد تک کامیاب رہی کہ کرشنا مینن پارلیمنٹ کی ضمنی انتخاب میں ہار گئے۔ لیکن ہندوستان کے ذی علم حضرات اور نیشنل اخبارات نے اس "بدبخت کم ظرف" کی مذکورہ بالا مہم کی نہ صرف مذمت ہی کی بلکہ اس "بدبخت کم ظرف" کی اصلیت کو ظاہر کرکے اس کو کوئی اہمیت نہ دینے کی بات کہی۔

لیکن اس "بدبخت کم ظرف" کو حرام منہ لگ چکا تھا کارٹونسٹ کے پیشہ میں اسے بنا ہی کیا تھا چنانچہ اس نے ہندوستان کی سیاسی فضا کو بھانپ کر اور ہندوستان کے سادہ لوح عوام کے مزاج کو پہچان کر تاریخ ماضی کے من گھڑت واقعات کو سامنے رکھ کر مسلمانوں کی مخالفت کا بیڑہ اٹھایا۔ پس پھر کیا تھا وہی ہندوستان کا نیشنل پریس جو اس "بدبخت کم ظرف" کی

مذمت کرنے میں پیش پیش رہتا تھا اب وہ اسی کو مہربانی کی نظر سے دیکھنے لگا اور اس کا پلیس انسان چڑھانے کے تانے بانے بننے میں لگ گیا۔ اس "بد بخت کم ظرف" کا حوصلہ بلند ہوا۔ اس کو طاقت ملی اسلام سے بھی اس کی خاطر داری ہوئی اور آدمیوں کے جم غفیر کے تائیدی ہاتھوں کے ذریعہ اس بدبخت کم ظرف کی دل کھول کر ہمت افزائی کی گئی۔ دیکھتے ہی دیکھتے یہ "بد بخت کم ظرف" بمبئی سے باہر بھی پورے ہندوستان کے فرقہ پرست لوگوں کا "آقا و رہنما" بن کر ابھر کر سامنے آگیا ــــ اب شیر کی طرح نہیں گیدڑ کی ہی طرح یہ "بد بخت کم ظرف" انتہائی گھٹیا پن سے ملک کی اقلیتوں کے وجود اور ان کے کردار پر حملہ آور ہو رہا ہے۔ متواتر اس کے حملے ہندوستان کی ہر اقلیت کے دل و جگر کو چیر رہے ہیں مگر کبھی بھی ہندوستان کا کوئی بھی قانون اس کی لن ترانیوں کو بند یا ختم کرنے کے لئے حرکتِ عمل سے قاصر ہی رہا ــــ اقلیتوں کی وفاداری پر شک و شبہ کا اظہار یہ "بد بخت کم ظرف" بڑی دیدہ دلیری سے کرتا رہا۔ اقلیتوں کے نام و نمود کو مٹا دینے کا اظہار بھی یہ "بد بخت کم ظرف" بڑے زور و شور سے کرتا رہا۔ ملک کے سیکولر آئین کے لئے یہ "بد بخت کم ظرف" چیلنج بن کر سامنے آیا۔ سب کو للکارتا رہا۔ مگر کسی نے بھی اس پر ہاتھ ڈالنے کی زحمت گوارہ نہیں کی۔ بابری مسجد کے انہدام کے لئے کھلم کھلا اس "بد بخت کم ظرف" نے اپنے کو ذمہ دار بتایا۔ مگر تب بھی کسی کے کانوں پہ جوں نہ رینگی۔ کہ اس پر کچھ ایکشن لیا جائے۔ اقلیت دشمنی میں یہ کھلم کھلا قانون شکنی کے لئے عوام کو اکساتا رہا۔ قانون داں اور انتظامیہ اس کی ان سب حرکات پر خاموش تماشائی بنی رہیں ــــ لیکن چونکہ یہ "بد بخت کم ظرف" صرف اور صرف خود غرضی کی چھپی خواہش کی تکمیل کے لئے میدان سیاست میں اترا تھا اس لئے اس نے جب عوام کو قانون شکنی کے لئے اکسایا تو اس کے اپنے گھر کے لوگ بھی قانون شکن باتوں کی کارگذاری میں کسی سے کم کیسے رہ سکتے تھے اس "بد بخت کم ظرف" کے ایک بھتیجے پر کسی شخص کے قتل کے الزام کی تحقیقات کے

لیے عدلیہ کی طرف سے جب ہدایت کی گئی تو اس "بدبخت کم ظرف" نے عدلیہ پر الزام تراشی شروع کردی۔ ہندوستان کی تاریخ میں یہ پہلی مرتبہ ہوا ہے کہ کسی پبلک مین نے کھلے عام عدلیہ پر سنگین الزام لگایا ہو ـــ اس پر بھی یہ "بدبخت کم ظرف" کسی گرفت سے محفوظ ہی رہا ـــ ابھی کچھ عرصہ پہلے اس "بدبخت ملعون کم ظرف" نے اپنے اخبار میں محسن انسانیت رہبر اعظم حضور اکرم رحمۃ للعالمین صلی اللہ علیہ وسلم کی شانِ اقدس میں کچھ گستاخیاں لکھی ہیں جیساکہ سننے میں آیا ہے۔ مگر اس کے باوجود بھی یہ کسی قانونی گرفت سے بچا ہی ہوا ہے۔ نیشنل پریس اس کے بارے میں کیا لکھے گا اس کی امید بھی بیکار ہی ہے۔ ہندوستان کے ذی علم حضرات اس کی مذمت میں آگے آئیں گے یہ سوچنا بھی حماقت کی بات ہے ـــ آخر ہندوستانی اقلیتوں کی اہمیت ہی کیا ہے۔ وہ ہیں کس گنتی میں۔ ان کا حال پوچھنے کی زحمت کس کو گوارہ ہے ـــ ہائے رے! ہندوستان کی اقلیت کی کسمپرسی، بے بسی بے چارگی!۔

اس مضمون کے شروع میں ہم نے انسانی نفسیات کا "پالتو" کے بارے میں جس سبق کا ذکر کیا ہے اس کو ہم یہاں چسپاں کر رہے ہیں جس "پالتو" کو کسی کے لئے پالا گیا تھا وہ "پالتو" اب مالک ہی کو ڈسنے لگا ہے وہ کیسے؟ ابھی حال ہی میں بمبئی میں ایک عوامی اجتماع میں بڑی بھیڑ کے سامنے اس "بدبخت کم ظرف" نے راشٹر پتا مہاتما گاندھی کے بارے میں انتہائی شرمناک بدتمیزی کر ڈالی۔ اس نے کہا کہ "راشٹر پتا مہاتما گاندھی کا برہم چاریہ پر لوگ ایک ڈھونگ تھا انھیں آجو باجو دو عورتوں کی ہمیشہ ضرورت رہتی تھی"۔ ("نو بھارت ٹائمس" مورخہ ۲۸ ستمبر ۱۹۹۶ء)

"بدبخت کم ظرف" کی اس بات پر ملک کے سب ہی تو تلملا اُٹھے۔ اب ان کی

سمجھ میں آیا کہ یہ " بد بخت کم ظرف " اپنی حد سے تجاوز کرنے پر آمادہ ہو چکا ہے نیشنل پریس اور گیند ڈگل سے لیکر عرصے گوشہ نشین فریڈم فائٹر گووند بھلاٹ شراف سب ہی اس " بد بخت کم ظرف " کی مذمت کرنے میدان عمل میں کود پڑے جب یہ " بد بخت کم ظرف " کھلم کھلا اقلیتوں کے صفایا کرنے، اقلیتوں کی دل آزاری کرنے، بابری مسجد کے انہدام کی ذمہ داری بیانگ دہل اپنے اوپر لینے کی بات کہہ رہا تھا تو نیشنل پریس سے لیکر یہ سب ذی ہوش قسم کے لوگ کہاں تھے کسی کو نہیں معلوم مگر جب یہ " بد بخت کم ظرف " ان کی آئیڈیالوجی پر حملہ آور ہونا شروع ہو گیا تو اب یہ ایسے نکل کر سامنے آ رہے ہیں کہ جیسے ملک میں کوئی بہت بڑا طوفان آ گیا جس کی روک تھام کے لئے انہیں اپنے آرام کو تلا دینی پڑی ابھی اور سنیئے، اس " بد بخت کم ظرف " کے مہاتما گاندھی کے بارے میں کہی ہوئی بات پر گاندھی جی کے پڑ پوتے تو شار گاندھی نے ۱۸ گھنٹے کی بھوک ہڑتال بھی شروع کر دی۔ اس " بد بخت کم ظرف " نے ایک والد کے اپنی پوتی کے ساتھ تعلقات کی توہین کی ہے ایسا تو شار گاندھی کا خیال ہے۔ اس موقع پر آل انڈیا کانگریس کمیٹی کی جنرل سکریٹری میرا کمار نے کہا کہ اگر بھارت میں گاندھی کی عزت نہیں ہے تو کسی کی بھی عزت نہیں ہے!! لیکن یہ " بد بخت کم ظرف " تو ایک عرصہ سے اقلیت دشمنی کے اظہار میں گاندھی جی آئیڈیالوجی کی توہین و بے عزتی کر رہا تھا۔ مگر جب کسی کو بھی یہ خیال نہیں آیا کہ ہندوستان میں جب گاندھی جی کے خیال کی عزت نہیں تو کسی کے بھی خیال کی عزت نہیں ہے جب گاندھی جی کی شخصیت پر اس " بد بخت کم ظرف " نے سیدھا حملہ کیا تو اب انہیں گاندھی جی کی عزت کا خیال آ رہا ہے۔

اسے دیکھ کر ہم کیا کہیں کیا نہ کہیں۔ بس یہ ہی سوچ کر دل و دماغ الجھن میں ہے۔ کیا اسے ملک کے نیشنل پریس اور ذی علم لوگوں کی دو طرح کی پالیسیوں کی کمزوری کہنا ہمارے لئے صحیح و مناسب رہے گا ؟۔

اصل کانگریس شاید اب ختم ہو چکی ہے۔ اب جو کانگریس باقی بچی ہے اس کی نہ کوئی تھیوری ہے نہ کوئی آئیڈیالوجی ہے اور نہ ہی کوئی اصول و پالیسی ہی ہے۔ جب ہی تو وہ کانگریس، جسکے رہنما مہاتما گاندھی، پنڈت جواہر لال نہرو، مولانا ابوالکلام آزاد ہوا کرتے تھے ملک میں کہیں دکھائی ہی نہیں دیتی ہے اب جو کانگریس نام کی پارٹی ملک میں ہے۔ اس کا کوئی لیڈر و ممبر بھرشٹاچار کے الزامات میں عدالت کے چکر کاٹ رہا ہے۔ کوئی لیڈر مہاتما گاندھی کو گالیاں دینے والوں کو سنہ لگا رہا ہے ان سے دوستی و سمجھوتا کر رہا ہے۔ مسٹر کانشی رام اور مس مایاوتی کی ساری ہی سیاست مہاتما گاندھی کو گالیاں دینے سے شروع ہوئی برہمن واد پر نازیبا اور ناشائستہ حملہ کر کر کے ان دونوں نے اپنے نام کو خوب چمکایا۔ افسوس و شرم کا مقام ہے کہ موجودہ کانگریس کے لیڈروں نے حالیہ یوپی الیکشن کے موقع پر ان کی جماعت بہوجن سماج پارٹی سے انتخابی سمجھوتہ کر کے کیا ثابت کرنے کی کوشش کی ہے کہ ان دونوں کی گاندھی جی کے بارے میں توہین آمیز باتیں اور برہمن واد کے خلاف ناشائستہ جملے صحیح ہیں؟

اصولوں کو بالائے طاق رکھ کر موقع پرستی کا اپنا چہرہ ملک کے سامنے کانگریس نے جس طرح پیش کیا اس کے پیش نظر اب ملک کے سنجیدہ حضرات اصلی کانگریس کے بارے میں یہ کہنے پر مجبور ہیں کہ ؎　　اب اسے ڈھونڈ چراغ رخ زیبا لے کر!۔

بقیہ: مفتی صاحبؒ

بننا پڑا۔ اور دارالعلوم کے اس نئے دور میں ان دونوں بزرگوں کے ساتھ وہ سب کچھ ہوا، جو مذکورہ آیت کریمہ میں پہلے ہی بتا دیا گیا ہے۔ جس کے تذکرہ اور تلخ نوائی سے بھی اب کوئی فائدہ نہیں۔ فَصَبْرٌ جَمِیْلٌ وَاللّٰہُ الْمُسْتَعَانُ۔　(باقی آئندہ)

مفکرِ ملت مفتی عتیق الرحمٰن عثمانیؒ نمبر ۱۹۸۵ء میں شائع ہوا تھا اس کے بقایا مضمون ترتیب وار شائع کئے جا رہے ہیں

ہو حلقۂ یاراں میں بریشم کی طرح نرم
رزم حق و باطل ہو تو فولاد ہے مومن

کہا جا سکتا ہے کہ:۔

حضرت مفتی صاحب مرحوم کی شخصیت ـــــ اے روشنی طبع تو بر من بلا شدی۔ کا صحیح مصداق تھی۔ ان کے ذاتی محاسن۔ کمال علم وفضل اور ساتھ ہی بے مثال جذبۂ اخلاص وعمل نے اُن کو بیحد مصروف ومشغول زندگی کے آغوش میں دیدیا تھا۔ اُن کی ہمہ گیر ذمہ داریاں اور دلچسپیاں، اور تھکا دینے والے مشاغل دیکھ کر لیبا اوقات ترس آتا تھا۔ صبح سویرے فجر سے اُٹھ کر دیر گئے رات تک وہ احباب واقارب، آشنا وبیگانہ کے، عوام وخواص کے مختلف معاملات ومسائل میں اس طرح اُلجھے رہتے تھے کہ ان کے شب وروز میں آرام وعافیت کا خانہ کہیں نظر ہی نہ آتا تھا۔ دُور دُور تک پھیلے ہوئے مدارس اور تعلیم گاہیں ہوں یا علم وادب کی محفلیں۔ سیاسی اور سماجی سرگرمیاں ہوں یا ملّی ودینی اجتماعات۔ سیرت پاک کی کانفرنسیں ہوں یا دینی درسگاہوں کے جلسے اور ختم بخاری شریف کے بابرکت اجتماع ہر جگہ مفتی صاحب کی طلب تھی۔ مانگ تھی۔ ضرورت تھی، اور مفتی صاحب کی بے مثال مُروّت واخلاق میں سب کے لئے فراخ دِلی تھی اور رواداری۔ وہ اپنی صحت اور آرام کی قیمت پر بھی دوسروں کا دل رکھنا ضروری سمجھتے تھے اس طرح گویا ایک معمول بن گیا تھا کہ وہ ڈیڑھ دن دہلی میں رہتے تو چار دن دہلی سے باہر کسی سفر میں۔ بلا مبالغہ کہا جا سکتا ہے کہ مفتی صاحبؒ سینکڑوں دینی مدرسوں، اسکولوں۔ کالجوں۔ دانش گاہوں۔ انجمنوں۔ جماعتوں اور اداروں سے نہ صرف ذمہ دارانہ طور پر وابستہ تھے، بلکہ اپنی بہترین فکری وعملی صلاحیتوں سے اُن کی ساخت وپرداخت میں بھرپور حصہ لیتے تھے۔

انجمن تعمیر اُردو اور کل ہند انجمن ترقی اُردو کے وہ لائف ممبر تھے اور اُس کی ہر تحریک واقدام میں برابر کے شریک وسہیم۔ ۱۹۴۷ء کے بعد مسلم یونیورسٹی علی گڈھ کی بقا وبہبود میں انھوں نے دوسروں سے بڑھ چڑھ کر حصہ لیا۔ یونیورسٹی پچھلے ۳۵ سال میں جس نشیب وفراز اور جن مراحل سے گذری ہے۔ اُس کی تاریخ کے ہر صفحہ پر مفتی صاحب کی سرگرمیوں کے نقوش ثبت ہیں۔ وہ مدتوں یونیورسٹی کورٹ کے ممبر رہے۔ اور اس کی فیکلٹی آف دینیات کے تو مستقل ایڈوائزر تھے ـــــ جامعہ ملیہ (دہلی) اور ندوۃ العلمأ لکھنؤ سے بھی اُن کا گہرا ربط وتعلق تھا۔ اور اُن کی میٹنگوں اور مشوروں میں ہمیشہ شریک رہتے تھے۔ دارالعلوم دیوبند تو خود اُن کے مادر علمی تھا جس کے آغوش میں اُنکی شخصیت پروان چڑھی تھی۔ عمر بھر وہ مجلس شوریٰ کے رکن رکین رہے۔ اکثر وبیشتر شوریٰ کے جلسوں کی صدارت مفتی صاحب ہی فرماتے تھے۔ دہلی میں بیٹھے ہوئے بھی وہ دارالعلوم کے کتنے ہی اہم کام انجام دیتے رہتے تھے۔ ان کے علاوہ دہلی کی مقامی تعلیم گاہوں ـــ یعنی دہلی کالج۔ اینگلو عربک اسکول۔ فتحپوری مسلم ہائی اسکول شفیق میموریل ہائی اسکول مدرسہ امینیہ۔ جامعہ رحیمیہ۔ مدرسہ عالیہ فتحپوری۔ مدرسہ حسین بخش۔ مدرسہ عبدالرب وغیرہ کو بھی حضرت مفتی صاحب کے قیمتی مشوروں اور گہری دلچسپیوں سے ہمیشہ سہارا ملتا رہا۔ وہ ان تمام درسگاہوں کے رکن ومشیر تھے۔ اور برابر ان کی میٹنگوں میں شریک رہتے تھے۔

ــــــ ※ ــــــ

دانش کدوں سے اپنے گہرے تعلق کے علاوہ مسلم اوقاف اور حجاج کے معاملات میں بھی مفتی صاحب گہری دلچسپی لیتے تھے۔ مدتوں وہ سنٹرل حج کمیٹی کے رکن رہے۔ جو وزارت خارجہ حکومت ہند کی نگرانی میں حجاج کے مسائل ومشکلات کو حل کرنے اور ان کے لئے ضروری سہولتیں فراہم کرنے کی ذمہ دار ہے سنٹرل حج کمیٹی کی میٹنگ میں مفتی صاحب

ہی صدارت کے فرائض انجام دیا کرتے تھے۔ اسی طرح اوقاف کے تحفظ وبہبود سے مفتی صاحب کو گہری دلچسپی تھی۔ سنٹرل وقف کونسل ہو یا دہلی وقف بورڈ، مفتی صاحب کا بہت کچھ وقت ان کے معاملات پر صرف ہوتا تھا۔ خاص طور پر تقسیم ہند کے بعد مشرقی پنجاب۔ میوات۔ ہریانہ اور دہلی کی بے شمار مساجد۔ درگاہوں اور قبرستانوں کی بربادی۔ ایک مستقل مسئلہ بن گئی تھی۔ ان کی بحالی اور حفاظت کے لئے مرکزی اور مقامی حکومتوں اور سوشل کارکنوں کے ذریعہ بہت کچھ کام کرنے پڑے۔ ان تمام کوششوں میں مفتی صاحب کو بہت کچھ جان کھپانی پڑی۔ آخر عمر تک وہ ان سرگرمیوں میں حصہ لیتے رہے۔ دہلی کا مشہور اور مثالی دارالیتامیٰ (بچوں کا گھر) بھی اس سلسلہ کی ایک کڑی رہا ہے۔

بیرون ہند اور خاص طور پر مسلم ملکوں سے آنے والے وفود اور معزز مہمانوں کی پذیرائی۔ ہندوستان کے اسلامی و علمی آثار و دوائر سے اُن کو روشناس کرانا۔ دہلی میں مقیم مسلم ممالک کے سفراء کرام کی تقریبات، اعیاد و محافل میں شریک رہنا بھی مفتی صاحب کے معمولات کا ایک اہم جز تھا۔ اور ان تمام حلقوں میں مفتی صاحب کی قدر و قیمت کو برابر ملحوظ رکھا جاتا تھا۔

آزاد ہند کے پہلے وزیر اعظم جواہر لال نہرو۔ اور ان کے رفقاء وزارت۔ مولانا ابوالکلام آزاد۔ رفیع احمد قدوائی۔ حافظ محمد ابراہیم۔ ہمایوں کبیر۔ شفیع قریشی۔ اور ان کے بعد ہندوستان کے صدر جمہوریہ ڈاکٹر ذاکر حسین۔ فخرالدین علی احمد۔ لیڈر کشمیر شیخ محمد عبداللہ مرحوم اور پھر اندرا گاندھی سے مفتی صاحب کے ذاتی مراسم تھے۔ اور اپنی زندگی بھر ان شخصیتوں نے ملک کے اہم ترین معاملات و مسائل میں مفتی صاحب کے اخلاص، بصیرت آموز مشوروں اور رفاقت کار کی پوری اہمیت محسوس کی۔

مفتی صاحب کا سینۂ پُر نور جس طرح علوم دینیہ۔ فقہ اسلامی تفسیر و حدیث کے انوار و برکات سے معمور و منور تھا، اسی طرح وہ زبان و قلم کے بھی شہسوار تھے۔

ان کی تحریر بھی غضب کی شیرینی اور دلآویزی لئے ہوتی تھی۔ اور تقریر بھی نہایت مؤثر، فاضلانہ و دلپذیر۔ وہ بڑی اداو انداز کے انشاء پرداز بھی تھے اور بے مثال خطیب بھی ندوۃ المصنفین کی شائع کردہ کتنی ہی رفیع تالیفات پر خود مفتی صاحبؒ نے تعارف اور مقدمات تحریر کئے ہیں۔ برہان میں بھی بسا اوقات اداریئے لکھے۔ مختلف موضوعات پر آل انڈیا ریڈیو سے اُن کی جو تقریریں براڈکاسٹ ہوئیں "منارصدا" کے نام سے کتابی شکل میں شائع ہو چکی ہیں۔ یہ سب مفتی صاحب کے قلم کی شگفتہ بیانی اور دلآویزی کی گواہ ہیں۔ اس مجموعہ میں مفتی صاحب کی چند ریڈیائی تقریریں بطور نمونہ شامل اشاعت بھی کی جارہی ہیں۔ دہلی۔ میرٹھ۔ بھوپال۔ اُجین۔ احمد آباد۔ بڑودہ۔ ناگپور۔ حیدرآباد۔ سورت (گجرات) بمبئی وغیرہ میں مفتی صاحب کی سینکڑوں تقریریں سننے کا اتفاق ہوا۔ سیرت پاک ہو یا ختم بخاری شریف۔ کوئی سیاسی اور سماجی موضوع ہو یا خالص علمی و ادبی عنوان۔ ان کے خزانۂ دل و دماغ سے ہر بار نئے نئے جواہر پارے اُبلتے تھے اور سننے والوں کے سینوں میں اُترجاتے تھے۔ بلکہ اپنے موضوع سے متعلق نہایت کارآمد، جچی تُلی باتیں بڑے ہی مؤثر اور دل نشیں انداز میں پیش کرتے تھے۔ باستثنار محترم مولانا علی میاں مدظلہٗ آج اس پایہ کا کوئی مقرر دور دور تک نظر نہیں آتا۔ اپنے محاسن و کمالات کے لحاظ سے بلاشبہ اپنے معاصرین میں ان کو صدر نشین کا مقام حاصل تھا۔

آزادیٔ وطن کے بعد جب جمعیۃ علماء کی تحریک پر جب دینی تعلیم کا چرچا ملک بھر میں پھیلا تو سب سے پہلی دینی تعلیمی کانفرنس ۱۹۵۲ء میں احمد آباد میں ہوئی تھی، اس کی صدارت مفتی صاحب ہی نے فرمائی تھی۔ اس کانفرنس میں مفتی صاحب کا خطبۂ صدارت اپنے موضوع پر ایک شاہکار کا درجہ رکھتا تھا۔ اس کے بعد الٰہ آباد میں بھی

تعلیمی کانفرنس کی صدارت مفتی صاحب ہی نے فرمائی۔ پھر ۱۹۵۸ء میں بمبئی کا یادگار اور دُور آفریں کل ہند دینی تعلیمی کنونشن بھی مفتی صاحب اور مولانا حفظ الرحمٰن صاحب کی جانفشانیوں ہی کا ثمرہ تھا۔ پھر ٹھیک اسی عروس البلاد میں۔ مفتی صاحب کی۔ قاری محمد طیب صاحبؒ اور مولانا حامد الانصاری غازی وغیرہ کی انتھک کوششوں سے ۱۹۷۲ء میں مسلم پرسنل لا پر وہ کامیاب اور تاریخی اجتماع منعقد ہوا جس میں ہندوستان کے تمام مسلم زعمار اور مکاتب فکر وحدت کلمہ کے سایہ میں اپنے پرسنل لا کے تحفظ کے لئے سر جوڑ کر بیٹھ گئے تھے اور مسلم پرسنل لا بورڈ کی تشکیل عمل میں آئی تھی۔ ملت اسلامیہ ہند کے حال و مستقبل کے حق میں ان عظیم تعمیری اور نتیجہ خیز کوششوں کو پروان چڑھانے میں مفتی صاحب کی بھاگ دوڑ۔ سوجھ بوجھ اور اثر و رسوخ نے بڑا اہم پارٹ ادا کیا۔ اپنے افتاد طبع و مزاج کے لحاظ سے مفتی صاحب، ہنگامہ و ہٹر لونگ کی بجائے ٹھوس اور تعمیری سرگرمیوں سے ہمیشہ مانوس رہتے تھے اور ایسے ہی کام ان کی دلچسپیوں کا محور ہوتے تھے۔ کشادہ دلی۔ وضعداری۔ خوش خُلقی۔ وسعت نظر اور دُور اندیشی، ان کی فطرت تھی جو ان کے اعمال و کردار میں ہمیشہ نمایاں رہی۔ وہ رسول امن و رحمت صلعم کے وفادار اُمتی اور پیغامِ رسالتؐ کے راز دار تھے۔ وہ جزئیات و فروعات میں اُمت کی گروہ بندی۔ تحزب اور تنگدلی کے کبھی روادار نہ ہو سکے۔ بلکہ ہمیشہ اُس کے شکوہ مند رہے۔

تو برائے وصل کردن آمدی ۔:۔ نے برائے فصل کردن آمدی

وہ سچے دل سے یہ چاہتے تھے کہ توحید الٰہی اور رسالت خاتم الانبیاء (صلی اللہ علیہ وسلم) پر ایمان رکھنے والے اُمت مسلمہ کے تمام افراد کم از کم اجتماعی ملی اُمور میں وحدت کلمہ کے جذبہ سے سرشار۔ باہم شیر و شکر اور ایک دوسرے کا دست و بازو بن کر دنیا میں رہیں اور اپنا مقام بلند حاصل کریں۔

اب سے لگ بھگ آٹھ سال پہلے لکھنؤ میں شیعہ، سُنّی کشمکش نے ۱۹۷۹ء میں بڑی افسوسناک حد تک ہنگامی صورت اختیار کر لی تھی۔ مفتی صاحب بے چین ہو گئے۔ کرنل بشیر حسن صاحب زیدی۔ اور امیر جماعت اسلامی ہند کو ساتھ لے کر لکھنؤ پہونچے اور بھڑکتی ہوئی آگ کو ٹھنڈا کرنے کی دیرپا کوشش کرتے رہے۔ اسماعیلی بوہرہ جماعت میں تفریق و انتشار کے فتنوں نے سر اُٹھایا تو مفتی صاحب ہی تھے۔ جن کی صلح جوئی اور دلداری نے سب کو سہارا دیا۔ دیوبندی مکتبۂ فکر اور جماعت اسلامی ہند میں افکار و نظریات کا اختلاف بڑھتے بڑھتے جب میدانِ جنگ میں اُترنے لگا، تو مفتی صاحب کی دردمندی اور وسعت اخلاق نے فریقین کے بڑھتے ہوئے قدموں کو بتدریج نقطۂ اعتدال تک واپس لوٹنے میں اہم پارٹ ادا کیا۔ واضح رہے کہ مفتی صاحب بجائے خود دیوبندی مکتبۂ فکر کے بڑے ستون تھے اور ان کے پائے ثبات و استقامت میں کبھی لغزش نہ آسکی لیکن ان کی عالی ظرفی اور وسعتِ قلب و نظر نے دلوں کی بیگانگی اور درمیان کے بہت سے مغالطوں کو دُور کرنے میں بڑی مدد کی۔ اور خدا خدا کر کے دست و گریبان کا وہ ماحول ختم ہوا۔

مسلم مجلس مشاورت کی تشکیل

مفتی صاحب مرحوم اور ان کے ہم خیال دوسرے اکابر و اعیان کے یہی جذبات تھے جو ہندوستان میں پھیلے ہوئے آئے دن کے فرقہ وارانہ فسادات اور ہندو مسلم کشمکش کی چلتی ہوئی آندھیوں کے مستقل تدارک و اصلاح کی تلاش میں "کل ہند مسلم مجلس مشاورت" کی تشکیل (۱۹۶۴ء) کا سبب بنے۔ مجلس کے پہلے صدر انڈین پولیٹیکس کے آزمودہ کار بزرگ رہنما اور انڈین نیشنل کانگریس کے رفیق قدیم ڈاکٹر سید محمود منتخب ہوئے۔ اور ان کے بعد تادمِ حیات مفتی صاحب نے نہ صرف اس کی صدارت کا بوجھ سنبھالا، بلکہ راہ کی ہزاروں مشکلات اور رقیبوں کی فتنہ انگیزیوں کے باوجود مجلس کی آواز کو برقرار رکھنے کی کوشش انجام دیتے رہے۔

مجلس مشاورت کی تاسیس کے بعد مرحوم ڈاکٹر سید محمود ۔ مفتی صاحب ۔ مولانا ابوالحسن علی میاں ۔ مولانا ابواللیث ۔ پنڈت سندر لال ۔ مُلا جان محمد سلیمان سیٹھ ۔ ڈاکٹر عبدالجلیل فریدی اور دوسرے رفقار مجلس نے جس تندہی ۔ دردمندی اور جفاکشی کے ساتھ ہندوستان کے ایک سرے سے دوسرے سرے تک ۔ دہلی ۔ یوپی ۔ بہار ۔ اڑلیہ ۔ مدھیہ پردیش ۔ راجستھان ۔ مہاراشٹر ۔ گجرات ۔ آندھرا ۔ کرناٹک کی خاک چھانی ۔ ہندو مسلمان کے دلوں پر دستک دی ۔ انسانیت کا سبق یاد دلایا ۔ اپنی اثر انگیز تقریروں اور دوروں سے فرقہ وارانہ رواداری اور ہم آہنگی کے جھنڈے لہرائے ۔ بلاشبہ ان مخلصانہ کوششوں نے اس حد تک کامیابی حاصل کی کہ تحریک خلافت کا زمانہ لوگوں کو یاد آنے لگا ۔ اور جبلپور ۔ ساگر ۔ کٹنی اور بھرپور ۔ کیلا ۔ جمشید پور ۔ رانچی ۔ احمد آباد ۔ بھیونڈی وغیرہ کے ہولناک اور لرزہ خیز مسلم کش فسادات کی جھلسی ہوئی فضاؤں پر اَبرِ رحمت کا کام کیا ۔

ان ہی صفحات میں کہیں اور ہم مرحوم ڈاکٹر سید محمود کا وہ خط بھی شریک اشاعت کر رہے ہیں ۔ جو انھوں نے ۱۹۶۸ء میں مجلس مشاورت کی صدارت اور ذمہ داریوں سے سبکدوش ہوتے ہوئے مفتی صاحب کو لکھا تھا ۔ ڈاکٹر صاحب کا یہ مکتوب دلسوزی اور ملک وملت کی خیر اندیشی کا ایک مرقع ہے ۔ اور اس میں مجلس مشاورت کی تاسیس ۔ اس کے مقاصد اور کارگذاری کا پس منظر بڑے اثر انگیز انداز میں پیش کیا گیا ہے ۔

جمعیۃ علمار ہند میں مفتی صاحب کا رول

علمار ہند کی تنظیم اور جمعیۃ کی تشکیل شیخ الہند مولانا محمود حسن قدس سرہ ، مولانا عبدالباری فرنگی محلی ، مفتی اعظم مولانا محمد کفایت اللہ ؒ ، مولانا شبیر احمد عثمانی ؒ اور اور سحبان الہند مولانا احمد سعید صاحب کے ہاتھوں عمل میں آئی تھی ۔ شیخ الہند کے وصال کے بعد عرصہ تک حضرت مفتی اعظم اُس کے صدر اور مولانا احمد سعید صاحب ناظم اعلیٰ رہے ۔ اگلے دَور میں مولانا حسین احمد صاحب مدنی ؒ کو صدر اور

مولانا حفظ الرحمٰن صاحب کو جنرل سکریٹری بنایا گیا۔ ان دنوں ہندوستان کی تحریک آزادی اپنی آخری منزلوں میں تھی اور مفتی عتیق الرحمٰن صاحب بھی ڈابھیل اور کلکتہ سے فارغ ہو کر دہلی آچکے تھے۔ مولانا حفظ الرحمٰن صاحب نے جمعیۃ کی باگ ڈور سنبھالی تو قدرتی طور پر مفتی صاحب بھی جو مولانا کے لئے حقیقی بھائیوں سے زیادہ تھے۔ جمعیۃ کے ہائی کمانڈ میں شامل ہو گئے۔ اور اس طرح شامل ہوئے کہ پھر دو دہائیوں تک اُن ہی کو جمعیۃ کا فکر و دماغ قرار دیا گیا۔ اور اس دور میں جمعیۃ کی کوئی میٹنگ۔ کوئی اجلاس' کوئی اقدام مفتی صاحب کے بغیر انجام نہ پا سکا جمعیۃ کا ترجمان روزنامہ الجمعیۃ جاری کیا گیا۔ اس کا پریس اور بکڈپو قائم کیا گیا۔ انگریزی ہفت روزہ میسیج نکالا گیا۔ اور خود جماعت کی تبلیغ و تنظیم کا کام دُور دُور تک پھیلا۔ غرض ہر گوشۂ عمل میں مفتی صاحب کے فکر و بصیرت سے جمعیۃ کو بہت کچھ توانائی حاصل ہوئی۔ ۱۹۴۷ء میں تقسیم ہند کی قیامت سروں سے گذری۔ دہلی' پنجاب اور گرد و نواح کی ہولناک بربادیوں کی داستان بہت طویل ہے۔ ان دنوں خود مفتی صاحب کا ادارہ ندوۃ المصنفین اور ان کی ..... رہائش گاہ بھی (قرول باغ۔ دہلی میں) اپنے بیش قیمت علمی اثاثہ کے ساتھ تباہ و برباد ہو گئے۔ پھر مظلوموں کی داد رسی۔ لاکھوں پناہ گزینوں کی تسکین و آبادکاری۔ ان کے لئے وسائل معاش کی فراہمی۔ نکاسی جائیدادوں کا معاملہ اور کسٹوڈین ڈپارٹمنٹ کی بے پناہ چیرہ دستیوں اور اندھی یلغار سے بے گناہوں کا تحفظ۔ مساجد۔ مزارات اور اوقاف اسلامی کی بحالی اور بازیابی جیسے پیچیدہ اور صبر آزما مسائل کا ایک طوفان تھا۔ جس سے جمعیۃ کے رہنماؤں کو برسوں کبھی سر اُٹھانے کی فرصت نہ مل سکی۔ ہر صبح جواہر لال نہرو۔ مولانا آزاد۔ رفیع احمد قدوائی اور دوسرے ذمہ داروں سے ملنا۔ اور ہر شام کو جمعیۃ کے دفتر میں بیٹھ کر دن بھر کی داستانِ حوادث و مظالم کو سننا اور اُن کی چارہ جوئی کے لئے پھر اگلی صبح دوڑنا۔ برسوں ان بزرگوں کا معمول رہا۔ آج کی کاغذی جمعیۃ کا

صدر سکریٹری اور سب کچھ بننا بچوں کا کھیل ہے۔ مگر وہ بھیانک دور، دودھ پینے والے نہیں، خون جگر کھپانے اور جان پر کھیلنے والے مجنونوں کا طلبگار تھا۔

مجاہد ملت کی وفات اور جمعیۃ کا دم واپسیں

اگست ۱۹۶۲ء میں مجاہد ملت مولانا حفظ الرحمٰن صاحبؒ زندگی بھر کی تھکن ساتھ لیکر آسودۂ رحمت ہو گئے۔ شیخ الاسلام اور سحبان الہند پہلے ہی واصل بحق ہو چکے تھے۔ اب جمعیۃ کے دامن میں مفتی صاحب کے ہم پلّہ کوئی دوسری شخصیت نہ تھی۔ چنانچہ ملک بھر کے باشعور حلقوں نے جمعیۃ کی قیادت مفتی صاحب کے سپرد کرنے کا دو ٹوک فیصلہ کیا۔ لیکن ایک حلقہ جو بڑے بزرگوں کی قربانیوں اور محنتوں کے پھل چننے اور ان کی قیمت دنیا ہی میں حاصل کرنے کے لئے بیتاب و منتظر تھا، اچھل کر سامنے آگیا۔ اس حلقہ کو یقین تھا کہ مفتی صاحب کی صدارت اور قیادت میں ان کے ڈھکے چھپے مقاصد پورے نہ ہو سکیں گے۔ میرٹھ میں جمعیۃ کا اجلاس بلایا گیا جو تقدس کی عبائیں میں لپٹے ہوئے علماء، کی باہم آویزش اور تصادم کا ایک مضحکہ خیز ڈرامہ بن کر رہ گیا۔ اس کشمکش اور تلخ کامیوں کا سلسلہ دیر تک قائم رہا۔ مگر مفتی صاحب کی شرافتِ نفس نے اپنے چھوٹوں اور عزیزوں سے الجھنا گوارا نہ کیا۔ اور رفتہ رفتہ وہ جمعیۃ سے یکسو ہوتے چلے گئے۔ لیکن ان کے یکسو ہو جانے کے بعد جمعیۃ کی ساکھ اور وقار ہی کیا، خود اس کے وجود کا جو حشر ہوا اور عوام و خواص کی نظروں میں اس کا جو بھی وزن رہا اس پر کچھ لکھنے کی ضرورت نہیں۔

دارالعلوم دیوبند اور مفتی صاحب

قصبہ دیوبند میں علوم اسلامیہ و نبویہ کے سدا بہار مرکز انوار و برکات کی تاسیس میں حضرت مولانا محمد قاسم نانوتوی رحؒ کے ساتھ جن خوش نصیب ہستیوں نے حصہ لیا ان میں سب سے نمایاں مفتی صاحب کے دادا جان حضرت مولانا فضل الرحمٰن عثمانیؒ تھے۔

اس مقدس مہم میں وہ حضرت نانوتوی کے دست راست اور معتمد رفیق کار تھے۔ پھر پوری صدی تک قاسمی اور عثمانی خاندانوں کی یہ رفاقت کار دارالعلوم کی تاریخ پر سایہ فگن رہی۔ حضرت گنگوہی قدس سرہٗ کے ارشاد کے مطابق مفتی صاحب کے والد محترم مفتی عزیز الرحمٰن صاحب عثمانی اپنی آخر عمر تک دارالعلوم کے صفوف علیا کے استاذ اور مفتی اعظم رہے۔ ادھر مولانا رفیع الدین رح کے بعد مفتی صاحب کے چچا جان مولانا حبیب الرحمٰن عثمانی اور پھر مولانا شبیر احمد عثمانی رح دارالعلوم کے مہتمم رہے۔ ان کے بعد ہی حضرت قاری محمد طیب صاحب رح نے اہتمام کی پوری ذمہ داری سنبھالی تھی۔ خود مفتی صاحب کی تمامتر تعلیم و تربیت اسی دارالعلوم میں اور دارالعلوم کے بھی خیر القرون میں مکمل ہوئی۔ پھر کئی برس وہ دارالعلوم کے صف اول کے استاذ اور مفتی بھی رہے۔ اور ڈابھیل و کلکتہ سے لوٹنے کے بعد مدت العمر دارالعلوم کی مجلس شوریٰ کے رکن صدر نشین رہے۔ اس پس منظر میں آسانی سے اندازہ کیا جاسکتا ہے۔ کہ دارالعلوم سے ان کو کتنا قلبی تعلق تھا اور اس مرکز علم و انوار الٰہیہ کی ساخت و پرداخت اور فلاح و بہبود انھیں اپنے تمام کاموں سے زیادہ کیوں عزیز تھی۔ دارالعلوم نے جس طرح شفقت و کرم کے ساتھ اپنی آغوش میں پال پوس کر مفتی صاحب کو بنایا تھا، مفتی صاحب نے بھی مدت العمر اس مادر علمی کا حق پہچاننے اور اس کے بنانے سنوارنے میں اپنے مقدور بھر کوئی کسر باقی نہیں چھوڑی۔

مگر یہ سب تذکرہ ہے اس دارالعلوم کا جو ولی اللہ محدث دہلوی رح اور حاجی امداد اللہ مہاجر مکّی کے ارمانوں کا پیکر مجسم تھا جس کی ساخت و پرداخت کے لئے گنگوہی اور نانوتوی پیکروں میں مقدس روحیں اتاری گئی تھیں۔ جو ان بوریہ نشین اللہ والوں کا مسکن و ماوی تھا۔ جن کی راہوں میں فرشتے اپنا دامن بچھاتے تھے۔ جہاں کے چراغوں کی مدھم روشنی سے چہرہ و دل منور ہوتے تھے۔ جہاں کے خس پوش حجروں سے قال اللہ و

قال الرسولؐ کے غلغلے بلند ہوتے تھے۔ زہد و تقویٰ کی لپٹیں اٹھتی اور فضاؤں کو معطر کر دیتی تھیں جہاں سے انوار وحی الٰہی اور علوم نبوت کے چشمے اُبلے اور ان کی موجیں محمود حسن۔ انور شاہ۔ حسین احمد۔ اشرف علی۔ شبیر احمد۔ کفایت اللہ۔ حفظ الرحمٰن۔ بدر عالم۔ یوسف بنوری۔ محمد شفیع۔ عتیق الرحمٰن۔ محمد طیب۔ سعید احمد بنکر دُنیا جہاں تک پھیلیں اور خلق خدا کو سیراب کر گئیں۔

یہ تذکرہ ہے اُس دارالعلوم کا جو درحقیقت صدائے بازگشت تھی۔ غار حرا کی مقدس سرگوشیوں کی، گنبدِ خضرا و فاران کی چوٹیوں سے اُٹھنے والی سدا بہار صداؤں کی۔ جس کی پشت تھی حکومت کے خزانوں اور امراء و سلاطین کی داد و دہش کی طرف، اور رُخ تھا استغنار۔ ایثار اور توکل علی اللہ کی طرف۔

آج کے دارالعلوم کا نہیں، جو اپنے منتہا رکمال کو پہونچکر فطرت کے لازوال قانون عروج و زوال کے سامنے سر جھکائے کھڑا ہے۔ گردشِ لیل و نہار کے ہاتھوں جس کی کایا پلٹ ہو چکی ہے اور جو اپنی شاندار بلڈنگوں اور محلاتی چمک دمک کے ساتھ ایک اسٹیٹ بنتا جا رہا ہے۔ اور جہاں جا کر آج قرآن حکیم کے بتائے ہوئے اس درسِ عبرت و موعظت کا پورا پورا مشاہدہ ہو جاتا ہے کہ "اِنَّ الملوک اذا دخلوا قریۃ افسدوھا وجعلوا اعزۃ اھلھا اذلۃ وکذالک یفعلون۔

جہاں تیزی سے اسلاف کے آثار و نشانات مٹانے کی مہم برپا ہے ——— اور آرڈر یہ ہے کہ ؎ جو نقشِ کہن تم کو نظر آئے مٹا دو۔

فخلف من بعد ھم خلف اضاعوا الصلاۃ واتبعوا الشھوات۔

اتفاق کی بات ہے کہ دارالعلوم کے اس نئے ہنگامی دور میں اسلاف کی روایات کی امین اور یادگار دو ہی شخصیتیں رہ گئی تھیں۔ قاری محمد طیب صاحب، اور مفتی عتیق الرحمٰن صاحب ——— انقلاب کی سر یورش و یلغار کا نشانہ ان ہی کو

تاریخ کے ساتھ یہ ناانصافی کیوں؟

دوسری و آخری قسط

ہندی تحریر: پروفیسر ڈاکٹر بی۔ این پانڈے مورخ و سابق گورنر اڑیسہ

مترجم: محمد نوشاد عالم چشتی، کوروکشیتر یونیورسٹی، ہریانہ

اورنگ زیب پر ہندو دشمنی کا الزام لگانے کے حوالے میں جس فرمان کو بہت اچھالا گیا ہے وہ "فرمانِ بنارس" کے نام مشہور ایک دستاویز ہے یہ فرمان بنارس کے محلہ گوری کے ایک برہمن خاندان سے متعلق ہے۔ ۱۹۰۵ء میں اسے گوپی اُپادھیائے کے نواسے منگل پانڈے نے سٹی مجسٹریٹ کے سامنے پیش کیا تھا۔ پہلی ایشیاٹک سوسائٹی بنگال کے جرنل (جریدہ) نے ۱۹۱۱ء میں شائع کیا تھا۔ جس کے نتیجہ میں تحقیق کرنے والوں کی توجہ ادھر مبذول ہوئی۔ اسی وقت سے مورخین اکثر اس کا حوالہ دیتے آرہے ہیں اور وہ اس بنیاد پر اورنگ زیب پر یہ الزام لگاتے ہیں کہ اُس نے ہندو مندروں کے تعمیر پہ پابندی لگادی تھی۔ جبکہ حقیقت یہ ہے کہ اس فرمان کی اصل اہمیت ان (مورخین) کے عصبیت زدہ نگاہوں سے اب بھی اوجھل رہ جاتی ہے۔

یہ تحریری فرمان اورنگ زیب نے ۱۵ جمادی الاول ۱۰۶۵ھ مطابق ۱۰ مارچ ۱۶۵۹ء کو بنارس کے مقامی حاکم کے نام بھیجا تھا جو ایک برہمن کے شکایت

کے سلسلے میں جاری کیا گیا تھا۔ وہ برہمن ایک مندر کا مہنت تھا اور کچھ لوگ اسے پریشان کر رہے تھے۔ فرمان میں کہا گیا ہے۔

" ابوالحسن کو ہماری شاہی فیاضی کا قائل رہتے ہوئے یہ جاننا چاہیئے کہ ہماری جبلّی مہربانی اور فطری جذبۂ انصاف کے مطابق ہمارا مسلسل جد وجہد اور منصفانہ ارادوں کا مقصد عوام کے فلاح وبہبود کو بڑھاوا دینا ہے۔ اور تمام ادنیٰ واعلیٰ طبقے کے حالات کو بہتر بنانا ہے اپنے پاک قانون کے مطابق ہم نے فیصلہ کیا ہے کہ قدیم مندروں کو تباہ اور برباد نہیں کیا جائے۔ البتہ نئے مندر نہ بنائیں جائیں۔"

ہمارے اس منصفانہ دور میں ہمارے دربار عالیہ میں یہ اطلاع موصول ہوئی ہے کہ کچھ لوگ بنارس شہر کے ہندو باشندگانوں اور ان کے مندروں کے برہمنوں و پجاریوں کو پریشان کر رہے ہیں نیز ان کے معاملے میں دخل اندازی کے مرتکب ہو رہے ہیں۔ حالانکہ یہ قدیم منادر انہیں کی دیکھ بھال میں ہیں۔ اس کے علاوہ وہ لوگ چاہتے ہیں کہ ان (آبائی) برہمنوں کو ان کے قدیم عہدوں سے ہٹا دیں۔ یہ دخل اندازی اس طبقے کے افراد میں باعث پریشانی وتفکر ہے۔

اس لئے ہمارا یہ فرمان ہے کہ ہمارا شاہی حکم پہونچتے ہی تم یہ ہدایت جاری کردو کہ کوئی بھی شخص غیر قانونی طور پہ دخل اندازی نہ کرے اور ان جگہوں کے برہمنوں نیز دیگر ہندو باشندوں کو پریشان نہ کرے۔ تاکہ ان افراد کا پہلے کی طرح ان تمام مقامات پہ قبضہ برقرار رہے اور وہ لوگ پورے دلجمعی کے ساتھ ہماری سلطنت خداداد کے لئے عبادت کرتے رہیں۔ اس حکم کی تعمیل میں قطعاً تاخیر نہ کی جائے۔"

اس فرمان سے بالکل واضح ہے کہ اورنگ زیب نے مندروں کی تعمیر جدید کے خلاف قطعاً کوئی نیا حکم نہیں جاری کیا بلکہ انہوں نے فقط پہلے سے جاری دستور

کا حوالہ دیا اور اسی دستور کی پابندی پر زور دیا پہلے سے موجود مندروں کو منہدم کرنے کو اس نے سختی سے منع کیا۔ اس فرمان سے یہ بھی واضح ہوتا ہے کہ اورنگ زیب اپنے ہندو رعایا کو امن وسکون اور خوشحالی کے ساتھ گذر بسر کرنے کے لیے مواقع فراہم کرنے کا دل سے متمنی تھا۔ اورنگ زیب کے جاری کردہ فرامین میں سے یہ فرمان ہی منفرد حیثیت کا حامل نہیں بلکہ ان خیالوں کا اظہار اس نے اپنے دیگر اور فرامین میں بھی کیا ہے۔ مثال کے طور پر بنارس میں ہی اُس کا ایک اور فرمان ملتا ہے جس سے یقیناً واضح ہوتا ہے کہ اورنگ زیب فی الحقیقت یہ دل سے چاہتے تھے کہ ان کے دور حکومت میں اُن کے ہندو رعایا بھی امن وسکون کے ساتھ اپنی زندگی گذاریں۔ یہ فرمان بھی اس طرح ہے۔

" رام نگر (بنارس) کے مہاراج راجہ رام سنگھ نے ہمارے دربار عالیہ میں یہ عرضی پیش کی ہے کہ ان کے باپ نے گنگا ندی کے کنارے اپنے مذہبی گرو (مرشد) بھگوت گوسائیں کے رہائش کے لئے ایک مکان بنوایا تھا۔ اب کچھ لوگ گوسائیں کو پریشان کر رہے ہیں۔ اس لئے یہ شاہی فرمان جاری کیا جاتا ہے کہ اس (تحریری) حکم کے پہونچتے ہی تمام موجودہ اور آئندہ آنے والے سرکاری افسران اس کا بخوبی اور یقینی بندوبست کریں کہ کوئی بھی شخص گوسائیں کو پریشان اور ڈرا دھمکا نہ سکے۔ اور نہ ان کے عمل دخل میں کسی بھی طرح کی کوئی دخل اندازی کرے تاکہ وہ پوری دل جمعی کے ساتھ ہماری سلطنت خدا داد کی دوام وبقا کے لئے دعا کرتے رہیں۔ اس فرمان پر فوری عمل کیا جائے"۔ بتاریخ ۱۷ ربیع الثانی ۱۰۹۱ھ

اسی طرح جنگم باڑی مٹھ کے (MATH - ہندو خانقاہ) مہنت کے پاس موجود

کچھ فرمانوں سے پتہ چلتا ہے کہ اورنگ زیب عالمگیر یہ قطعاً برداشت نہ کرسکتے تھے کہ اُن کے کسی بھی رعایا کا کوئی حقوق غصب کرے۔ خواہ وہ ہندو ہو یا مسلمان ان موجودہ فرامین میں سے ایک فرمان (کا تعلق) جنگم لوگوں (شیو فرقے کے لوگ SHAiv SECt) کی طرف سے ایک مسلمان باشندہ نظیر بیگ کے خلاف شکایت کے سلسلے میں ہے یہ معاملہ اورنگ زیب کے دربار میں جب لایا گیا، جس پہ شاہی حکم دیا گیا کہ ـــــ بنارس صوبہ الہ آباد کے افسروں کو مطلع کیا جاتا ہے پرگنہ بنارس کے باشندگان ارجن مل اور جنگمیوں نے یہ شکایت کی ہے کہ بنارس کا ایک باشندہ نظیر بیگ نے قصبہ بنارس میں ان کی پانچ حویلیوں پر قبضہ کر لیا ہے۔ انھیں یہ حکم دیا جاتا ہے کہ اگر یہ شکایت درست پایا جائے اور مذکورہ جائداد پر حق ملکیت (ان کا) ثابت ہو جائے تو نظیر بیگ کو ان حویلیوں میں داخل نہ ہونے دیا جائے ـــ تاکہ جنگمیوں کو مستقبل میں اپنی شکایت دور کروانے کے لئے ہمارے دربار میں (دوبارہ) نہ آنا پڑے ـ اس فرمان پہ ۱۱ شعبان ۱۳ جلوس ۱۰۸۲ھ بمطابق ۱۶۷۲ء کی تاریخ درج ہے ـ

اسی مٹھ کے پاس موجود ایک دیگر فرمان میں جس پہ یکم ربیع الاول ۱۰۷۸ھ کی تاریخ درج ہے ـــــ یہ رقم کیا گیا ہے کہ "زمین کا قبضہ جنگمیوں کو دیا گیا۔ فرمان میں ہے ـ

" پرگنہ حویلی بنارس کے تمام موجودہ اور آئندہ کے جاگیرداروں و کروڑیوں کو مطلع کیا جاتا ہے کہ شہنشاہ کے حکم سے ۱۷۸ بیگھہ زمین جنگمیوں کو دی گئی ـــ جسکی قدیم افسران (بالا) نے تصدیق کی تھی اور اس دور کے "حاکم پرگنہ" کی مہر کے ساتھ یہ ثبوت پیش کیا گیا ہے کہ زمین پر انھیں (جنگمیوں) کا حق ہے۔

اس لئے شہنشاہ کی جان کے صدقے کے بطور یہ زمین انھیں دے دی گئی۔ خریف کی فصل کی شروعات سے زمین پران کا قبضہ بحال کیا جائے ۔۔۔ اور پھر سے کسی بھی طرح کی دخل اندازی نہ ہونے دی جائے۔ تاکہ جنگمی لوگ اس کی آمدنی سے اپنی دیکھ بھال کر سکیں۔"

اس فرمان سے صرف یہ واضح نہیں ہوتا کہ اورنگ زیب بنیادی طور پر اپنی طبیعت کے لحاظ سے فطرتاً منصف مزاج واقع ہوئے تھے بلکہ اس سے اسکی بھی وضاحت ہوتی ہے کہ وہ اس طرح کی جائدادوں کی تقسیم میں ہندو مذہبی اداروں کے ساتھ کسی بھی طرح سے مذہبی عصبیت اور تنگ نظری کا مظاہرہ نہیں کرتے تھے۔ جنگمیوں کو ۱۷۸ بیگھہ زمین غالباً خود اورنگ زیب عالمگیر نے ہی عطا کیا تھا۔ کیونکہ ایک دوسرے فرمان (مورخہ ۵ رمضان ۱۰۷۱ھ) میں اس کی وضاحت کی گئی ہے کہ یہ زمین مال گذاری سے آزاد ہے۔

اورنگ زیب نے ایک دوسرے فرمان (۱۰۹۸ھ) کے ذریعہ ایک دوسرے (ہندو) مذہبی ادارہ کو بھی جاگیر عطا کیا تھا۔ فرمان میں کہا گیا ہے۔

"بنارس میں گنگا ندی کے کنارے بے نی مادھو (BAiNiMADHO) گھاٹ پر دو پلاٹ خالی ہیں۔ ایک مرکزی مسجد کے کنارے رام جیون گوسائیں کے گھر کے سامنے اور دوسرا اُس سے پہلے۔ یہ پلاٹ بیت المال کی ملکیت ہے ہم نے یہ پلاٹ رام جیون گوسائیں اور اُس کے لڑکے کو بطور انعام کی شکل میں دیا ۔۔۔ تاکہ مذکورہ پلاٹوں پر برہمنوں اور فقیروں کے لئے رہائشی مکان بنوانے کے بعد وہ خدا کی عبادت اور ہماری سلطنت خداداد کی دوام و بقا کے لئے التجا و دعا میں لگ جائیں ۔۔۔ ہمارے فرزندوں، وزیروں، امیروں دیگر حکام اعلیٰ، نیز داروغہ اور موجودہ و آئندہ کے تمام کوتوالوں کے لئے

یہ اہم ہدایت ہے کہ وہ اس حکم کی تعمیل میں خصوصی توجہ دیں اور مذکورہ پلاٹ کو مذکورہ بالا اشخاص و ان کے وارثان کے قبضہ میں ہی رہنے دیں نیز ان سے نہ کوئی مال گذاری یا ٹیکس لیا جائے اور نہ ان سے ہر سال تجدید سند کے لئے مطالبہ کیا جائے۔"

ایسا لگتا ہے کہ اورنگ زیب عالمگیر کو اپنی رعایا کے مذہبی جذبات کے احترام کا نہایت درجہ خیال تھا۔ ہمارے پاس اورنگ زیب کا ایک اور فرمان (۲ صفر ۹ جلوس) ہے جو آسام کے شہر گوہاٹی کے اُما نند مندر کے پجاری سُدامن برہمن کے نام ہے۔ آسام کے ہندو راجاؤں کی طرف سے اس مندر اور اس کے پجاری کو زمین کا ایک حصہ اور کچھ جنگلوں کی آمدنی جاگیر کے شکل میں دی گئی تھی۔ تاکہ بھوگ (ایک مذہبی رسم) کا خرچہ پورا کیا جا سکے اور پجاری بھی اپنا گذر بسر کر سکے جب یہ صوبہ اورنگ زیب کے عمل داری میں آیا تو انھوں نے بلا تاخیر ایک فرمان کے ذریعہ اس جاگیر کو حسب سابق رکھنے کا حکم جاری کیا۔

اورنگ زیب کا اہل ہنود اور ان کے مذہب کے ساتھ عالی ظرفی، فراخدلی اور احترام باہمی کا ایک اور ثبوت اُجین کے مہاکالیشور مندر کے پجاریوں سے (حاصل ایک فرمان سے) ملتا ہے۔ یہ شیو جی (Shive) کے ایک اہم مندروں میں سے ہے جہاں دن رات دیپ (چراغ) جلتا رہتا ہے۔ اس کے لئے کافی دنوں سے روزانہ چار سیر گھی وہاں کی سرکار کی جانب سے مہیا کرایا جاتا تھا۔ پجاریوں کا کہنا ہے کہ یہ سلسلہ مغل دور حکومت میں بھی جاری رہا۔ نیز اورنگ زیب عالمگیر نے بھی اس رسم کو باقی رکھنے میں کسی بھی طرح سے تنگ نظری کا مظاہرہ نہیں کیا۔ اس سلسلے میں پجاریوں کے پاس بدقسمتی سے کوئی فرمان تو موجود نہیں ہے [1] لیکن اس حکم نامے کا نقل ضرور

---

[1] فرمان کے عدم موجودگی کے متعلق راقم اپنی معلومات اور شواہد کی بنیاد پر دعا تی لکھ رہا

موجود ہے جو اورنگ زیب کے دور حکومت میں شہزادہ مراد بخش کی طرف سے جاری کیا گیا تھا۔ (مورخہ ۵ شوال ۱۰۶۱ھ) کو یہ حکم نامہ شہنشاہ کی طرف سے شہزادہ نے مندر کے پجاری دیو نرائن کی درخواست پر جاری کیا تھا۔ حقائق کی تصدیق کے بعد اس حکم نامہ میں کہا گیا ہے کہ مندر کے دیپک کے لئے چبوترا کوتوال کے تحصیل دار چار سیر (اکبری) گھی روزانہ کے حساب سے مہیا کرائیں۔ اس کی نقل اصل حکم نامہ کے جاری ہونے کے ۹۳ سال بعد (۱۱۵۴ھ) محمد سعد اللہ نے دوبارہ جاری کیا۔

(حاشیہ صہ ۷) ڈاکٹر پانڈے سے اختلاف کرتا ہے۔ ڈاکٹر صاحب نے فرمان کے پس منظر کو سمجھنے میں غلطی کی ہے یا انھیں صحیح معلومات فراہم نہیں کی گئی ہے۔ میری معلومات کے مطابق مالوہ کا قلعہ مانڈو میں سند دسمبر ۱۹۸۱ء تک قلعہ وغیرہ کے متعلق رہنمائی کرنے والے جناب وشنو ناتھ شرما کے پاس موجود تھی (پانڈے جی نے یہ تقریر ۲۹ جولائی ۱۹۷۷ء کو راجیہ سبھا (صوبائی اسمبلی میں کی تھی) شرما جی کے پاس اس سند کے موجود ہونے اور خود اس کا مشاہدہ کرنے کا اعتراف ڈاکٹر دھرم ویر بھارتی سابق مدیر ہندی ہفتہ روزہ دھرم یگ (Dharm Youg) نے کیا ہے۔ ڈاکٹر بھارتی اپنے چند احباب کے ساتھ جب مالوہ کے قلعہ مانڈو میں شرما جی سے ملاقات کی تھی۔ اسکی تمام تفصیلات انہوں نے اپنے ہفتہ روزہ میں شائع کیا تھا۔ ملاحظہ کریں بالمصافہ گفتگو کا ایک اہم حصہ یہ رپورٹ کیلاش نارد نے تیار کی تھی ــــ (واضح ہو کہ شرما جی سے ڈاکٹر بھارتی کی تمام گفتگو تحریری ہوئی تھی کیونکہ شرما جی کی قوت سماعت ضعیفی کے باعث متاثر ہو گئی تھی۔ اس بات کی بھی وضاحت ڈاکٹر بھارتی نے اپنے مضمون میں کیا ہے۔ راقم)

(بقیہ حاشیہ اگلے صفحہ پر ملاحظہ کریں)

عموماً مورخین اس کا ذکر بہت زیادہ کرتے ہیں کہ احمد آباد میں ناگرسیٹھ کے تعمیر کئے ہوئے چنتامنی مندر کو منہدم کیا گیا۔ لیکن اس حقیقت پر پردہ ڈال دیا جاتا ہے کہ اسی اورنگ زیب نے اسی ناگر سیٹھ کے بنوائے شترنجیا اور آبو مندروں کو کافی بڑی جاگیریں بھی عطا کی تھی۔

(حاشیہ صہ کا) کیلاش نارد ڈاکٹر بھارتی (مدیراعلیٰ "دھرم یگ") کا شرما جی سے ملاقات کا ذکر کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

" وشوناتھ شرما باہر آئے۔ ان کے ہاتھوں میں ایک پلندہ تھا۔ کچھ کتابیں کچھ دستاویز وہ کافی پلٹنے لگ رہے تھے، شرما جی بولے،

" میں آج آپ کو ان "جانکاریوں" سے متعارف کراؤں گا جو تاریخ (کی کتابوں) میں درج نہیں ہیں — اگر تاریخ میں لکھا گیا ہوتا یہ سب، تب نہ تو ہندو مسلم جھگڑے ہوتے اور نہ ہی ملک تقسیم ہو کر بنتا پاکستان"۔

میز پر رکھی سلیٹ کی سطح پر بھارتی جی نے لکھا۔ کیسی جانکاریاں ہیں، ہم جاننا چاہتے ہیں"

" اورنگ زیب نے اجین کے مہاکالیشور مندر کی پوجا وغیرہ اور آرتی کے لیے حکومت کے خرچ سے روزانہ چار سیر اصلی گھی دیا تھا۔ اور اس طرح ہندو مسلم اتحاد کی وہ مثال قائم کی تھی جس کا تاریخ میں ذکر ہی نہیں ہے" شرما جی نے کہا اور قدیم دستاویزوں میں سے کچھ کاغذات نکالے۔

میں سناٹے میں آگیا" لیکن اورنگ زیب تو ایک جنونی مذہب پرست تھا ہندوؤں اور ہندو تہذیب سے سخت نفرت کرنے والا ایک کٹر پنتھی "بت شکن" (تھا) میں نے سلیٹ پر لکھا۔

پڑھ کر شرما جی بپھرے" بولے: یہی سب تو انگریز صدیوں، سالوں میں پھیلا گئے

(باقی اگلے صفحہ پر)

بلاشبہ یہ تاریخ سے ثابت ہوتا ہے کہ اورنگ زیب نے بنارس کے شوناتھ مندر اور گولکنڈہ کی جامع مسجد کو منہدم کرنے کا حکم دیا تھا لیکن اس کے وجوہات کچھ اور ہی تھے (یعنی مذہبی تعصب کا جذبہ قطعاً کارفرما نہیں تھا) وشوناتھ مندر کے متعلق یہ واقعہ بیان کیا جاتا ہے کہ اورنگ زیب بنگال جاتے ہوئے (جب) بنارس کے پاس سے گذر رہے تھے تو ان کے قافلے میں شامل ہندو راجاؤں نے بادشاہ سے گذارش کیا کہ یہاں قافلہ ایک دن ٹھہر جائے تو ان کی رانیاں بنارس

(بقیہ حاشیہ پچھلے صفحہ کا) رہے، تاکہ ہندو اور مسلمان ایک نہ ہونے پائیں۔ آپس میں لڑ لڑ کر کٹتے مرتے رہیں۔ وہی (انگریزوں کا لکھوایا ہوا خود ساختہ اور من گھڑت) تاریخ جیسے کا تیسا (من وعن) آج تک موجود ہے۔ بے بنیاد بغض وحسد اور نفرت کی گڑھی ہوئی ایک فرسودہ کہانی۔ اسی نفرت انگیز کہانی کو آج تک جامعات (UNIVERSITIES) میں بھی پڑھایا جاتا ہے ـــــ اور پڑھایا جاتا رہے گا

کانپتے ہاتھوں سے بدرنگ ہو گئے اُن کاغذوں پر جمی دھول کو وہ صاف کرنے لگے میں نے اُس دستاویز کو پڑھا۔ ایک پرانی سند تھی وہ۔

"یادداشت بہ مہرے خوردا نکہ بتاریخ ......

۱۰۶۱ ہجری کا واقعہ ہے مہاکالیشور مندر اُجین کے موجودہ پجاری دیو نراین برہمن نے شہنشاہ عالمگیر سے گذارش کیا کہ زمانۂ قدیم سے ہی مہاکالیشور مندر پر جو نندہ دیپ جلا کرتا ہے، اس کے خرچ کے تمام انتظامات آپ سے قبل کے حکمرانوں کے ذریعہ کی جاتی رہی ہے۔ لہٰذا شہنشاہ عالمگیر کو بھی اس نندہ دیپ کو روشن رکھنے کا خرچ دینا چاہیئے۔

شہنشاہ عالمگیر کے واقعہ نویس حکیم محمد مہدی نے اس کی تصدیق کی کہ اس سے قبل

(باقی اگلے صفحہ پر)

جا کر گنگا ندی میں غسل کریں گی۔ اور وشو ناتھ جی کے مندر میں گلہائے عقیدت بھی پیش کرائیں گی۔ شہنشاہ اورنگ زیب نے اس گذارش کو بلا پس و پیش اور تاخیر کے شرف قبولیت سے نوازا اور قافلے کے پڑاؤ سے لے کر بنارس تک ۵ میل کی مسافت تک فوجی پہرے کا حفاظتی انتظام بھی کروا دیا۔ رانیاں پالکیوں میں سوار ہو کر گئیں اور غسل و پوجا کے بعد واپس آ گئیں لیکن ایک رانی (کچھ کی مہارانی) واپس نہیں آئیں۔ تو ان کی تلاش شروع ہوئی لیکن پتہ نہیں چل سکا۔ جب اورنگ زیب کو پتہ چلا تو انھیں بہت غصہ آیا اور انہوں نے اپنی فوج کے بڑے بڑے افسروں کو

(بقیہ حاشیہ پچھلے صفحہ کا) کے تحریری شہادت سے اس کا ثبوت ملتا ہے جس کے مطابق اس دیپ کے جلانے کا خرچ (حکومت سے) دیا جانا مناسب ہے۔ بعدہٗ شہنشاہ عالم گیر کے فرمان کے مطابق مہا کالیشور مندر کے لئے روزانہ چار سیر گھی بلا کسی اعتراض کے دیئے جانے کا حکم جاری کیا گیا۔ اور تحصیلدار چبوترے تحویل امین کو تاکید کی گئی۔ بادشاہ عالم گیر کے بھائی شہزادہ مراد بخش نے اس فرمان کو ۱۰۶۱ھ ہجری مطابق ۱۶۵۱ء میں دیونرائن برہمن کے حوالے کیا [۱]

مذکورہ بالا بیان سے واضح ہوتا ہے کہ یہ فرمان ضائع نہیں ہوا ہے بلکہ شرما جی کے پاس اس وقت تک محفوظ تھا۔ کیونکہ دھرم یگ میں اس فرمان کا عکس بھی شائع ہوا ہے۔ عکس کے نیچے یہ عبارت درج ہے۔

"اورنگ زیب کے ذریعہ مہا کالیشور مندر کو گھی دیئے جانے کا سند اور اس کا ہندی ترجمہ۔" [۲]

ہاں یہ مسئلہ غور طلب ہے کہ یہ فرمان اب شرما جی کی وفات کے بعد کس کے تحویل میں

(بقیہ حاشیہ اگلے صفحہ پر)

[۱] دھرم یگ (ہندی ہفتہ روزہ) دلی شمارہ ۲۰ دسمبر ۱۹۸۱ء ص ۱۳ کالم ۲ ، ۳

[۲] " " " " " ص ۱۳ کالم ۲۔

کو تلاش کرنے کے لئے بھیجا۔ آخر میں ان افسروں نے دیکھا کہ گنیش کی مورتی جو دیوار میں جڑی ہوئی ہے ہلتی ہوئی نظر آتی ہے۔ انھوں نے مورتی ہٹوا کر دیکھا تو تہ خانے کی سیڑھی ملی اور گمشدہ رانی اسی میں پڑی ہوئی رو رہی تھیں۔ ان کی عزت بھی لٹ گئی تھی۔ اور ان کے زیورات بھی چھین لئے گئے تھے۔ یہ تہ خانہ وشوناتھ جی کے مورتی کے ٹھیک نیچے تھا۔ (ہندو) راجاؤں نے (پجاریوں کے) اس حرکت پہ (سخت) ناراضگی جتائی اور نہایت غم و غصہ کا اظہار کیا۔ چونکہ یہ بہت گھناؤنا جرم تھا۔ اس لئے ان ہندو راجاؤں نے سخت سے سخت کارروائی کی مانگ کی۔ ان کے مطالبہ پر اورنگ زیب عالمگیر نے یہ حکم دیا کہ چونکہ اس پاک جگہ کو ناپاک کیا جا چکا ہے۔ اس لئے وشوناتھ جی کے مورتی کو کہیں اور لے جاکے قائم کیا جائے اور اس ناپاک مندر کو گرا کے زمین کے برابر کر دیا جائے اور مہنت کو گرفتار کر لیا جائے۔

ڈاکٹر پٹا بھ سیتا رمیا (Dr. Pattabhi Sita Ramaiya) نے اپنی مشہور کتاب (دفیدرس اینڈ اسٹونس) (The Feathers and Stones) میں اس واقعہ کو دستاویزی بنیاد پر صحیح ثابت کیا ہے۔ پٹنہ میوزیم کے سابق کیوریٹر

بقیہ حاشیہ پچھلے صفحہ کا

ہے۔ آیا اب بھی یہ محفوظ ہے یا زمانے کی دست تصرف کی نظر ہو گیا ہے مجھے ایسا لگتا ہے کہ غالباً پانڈے جی کو مندرجہ ذیل عبارت سے غلط فہمی ہوئی ہے۔ جو قابل غور ہے۔

"بادشاہ عالمگیر کے بھائی شہزادہ مراد بخش نے اس فرمان کو ۱۰۶۱ھ مطابق ۱۶۵۲ء میں دیونرائن برہمن کے حوالے کیا۔"

لفظ حوالے کیا سے پانڈے جی نے غالباً یہ سمجھا کہ خود مراد بخش نے ہی اس فرمان کو جاری کیا جبکہ ڈاکٹر بھارتی نے خود اورنگ زیب کے سند کا ذکر کیا ہے جس کا میں اوپر حوالہ دے چکا ہوں۔

ڈاکٹر پی۔ ایل۔ گپتا نے بھی اس واقعہ کی تصدیق کی ہے۔

گولکنڈہ کی جامع مسجد کا واقعہ یہ ہے کہ وہاں کے راجہ جو" تاناشاہ" کے نام سے مشہور تھا، ریاست کی مالگذاری وصول کرنے کے بعد تاناشاہ نے یہ خزانہ ایک زمین میں دفن کر اس پر مسجد بنوا دیا۔ جب اورنگ زیب کو اس کا پتہ چلا تو انھوں نے حکم دیا کہ یہ مسجد گرادی جائے۔ اس کے بعد دفن شدہ خزانے کو نکال کر رفاہ عام کے کام میں خرچ کیا گیا۔

یہ دونوں مثالیں ثابت کرنے کے لئے کافی ہیں کہ اورنگ زیب انصاف کے معاملے میں مندر اور مسجد میں کوئی فرق نہیں کرتے تھے۔

بدقسمتی سے دور وسطیٰ اور دور جدید کے بھارتی تاریخ کے واقعات اور کرداروں کو اس طرح توڑ مروڑ کر من گھڑت انداز میں پیش کیا جا رہا ہے کہ جھوٹ ہی الہامی حقیقت کی طرح بشکل سچ قبول کیا جانے لگا۔ اور ان لوگوں کو مجرم گردانا جانے لگا جو حق و باطل میں تمیز کرتے ہیں۔ آج بھی فرقہ واریت سے متأثر سماج دشمن عناصر اور مفاد پرست لوگ تواریخ کو توڑنے مروڑنے اور اسے غلط رنگ دینے میں لگے ہوئے ہیں۔

نوٹ:۔ قوسین کی وضاحتی عبارتیں مترجم کی ہیں ——— نوشاد عالم چشتی۔

دیوبند کا ادبی منظر نامہ

اکابر دیوبند و فضلاء کرام کی ادبی خدمات کے تنقیدی جائزے پر مشتمل ایک کتاب" دیوبند کا ادبی منظر نامہ" زیر ترتیب ہے۔

دارالعلوم دیوبند سے فارغ التحصیل ادیبوں/شاعروں/صحافیوں سے گذارش ہے کہ اپنی تصنیفات و مطبوعہ تخلیقات کی تفصیل سے مطلع فرمائیں عنایت ہوگی۔ (حقانی القاسمی معرفت محمود عالم، ۲۹۱۹ ترکمان گیٹ دہلی ۶)

فلسطین کی ممتاز شاعرہ

فدوی طوقان

از۔ حقانی القاسمی، نئی دہلی

پانچویں اور آخری قسط

(۵)

کسی بھی شاعر کی آواز اس کے اشکال اور ابعاد سے پہچانی جاتی ہے جب وہ اپنے قوم کے اجتماعی وجدان کی وضاحت یا تعبیر کرتا ہے۔ انفرادی شخصی حالت سے مجموعی انسانی حالات کی طرف منتقل ہوتا ہے۔ فدوی طوقان ایسی ہی شاعرہ ہیں جنہوں نے قومی احساسات کی ترجمانی کی، اور جدید شعری تحریک میں نہ صرف حصہ لیا بلکہ اس کے اصول اور فنی ستون وضع کئے۔

جون (۱۹۶۷ء) کی شکست سے قبل فدوی کی شاعری زیادہ تر ذاتی جذبات اور احساسات کے ارد گرد گھومتی تھی مگر جون کی شکست نے انہیں اپنی ذات کے حدود اور اپنے محدود دائرے سے باہر نکلنے پر مجبور کر دیا اور عربوں کی مجموعی زندگی

میں داخل کر دیا۔ جو استعماری اور استحصالی طاقتوں کی دہشت گردی اور تشدد سے جل رہی تھی، اب فدوی اپنے وجود کا پامردی اور استقلال کے ساتھ مقابلہ اور دفاع کرنے لگیں۔ یہیں سے شاعرہ کی زندگی میں ایک نئے روشن نقطے کا آغاز ہوا اور وہ صہیونی تسلط کے خلاف جاں باز فدائیین کے ساتھ اپنے سلگتے اشعار کے ذریعے محمود درویش، توفیق زیاد، اور سمیع القاسم کی عملی تحریک میں شامل ہو گئیں جن کی شاعری یہودیوں کے لئے صمود اور مزاحمت کا عنوان اور انسانی بغاوت کا اظہار تھی۔

" ایک پناہ گزین عورت اپنے کمزور اور لرزتے ہوئے سینے پر چوزے کی مانند ایک بچے کو کھلا رہی ہے، اس کا ایک ہاتھ بچے کے سر پہ ہے اور دوسرے ہاتھ سے اسے سینے سے چمٹائے ہوئے ہے۔ پھر اسے اپنے سینے پر لٹا لیتی ہے۔ اور اس طرح سے بھینچتی ہے۔ شاید وہ اپنی محبت کی تپش سے اس بچے کو ٹھٹھرتی ہوئی رات سے بچانا چاہتی ہے۔ بچہ اپنی ماں کی دھڑکن اور سانسوں کی خوشبو محسوس کرتا ہے اور اپنے دونوں ہاتھوں کو ماں کی گردن میں ڈال کر چمٹ جاتا ہے۔ اور پھر وہ "ماں" کہہ کر پکارتا ہے۔ بچے کے ہاتھ ماں کی گردن اور سینے پہ آہستہ آہستہ حرکت کرنے لگتے ہیں۔ اور وہ اپنے بچے کی خوشبو کو جو اس کے لئے ایک گم شدہ جنت کی مانند ہے، محسوس کرتی ہے اور تڑپ کر اس پر بوسوں کی بوچھار کرنے لگتی ہے۔"

فدوی طوقان کو اپنے جلاگانہ قومی اور وطنی تشخص کا احساس ہے جو قیام اسرائیل کے بعد انہیں اور پریشان کرتا رہتا ہے نظم " اردنیہ فلسطینیہ فی انکلترا" اسی احساس کی ترجمان ہے جس کے چند شعر یوں ہیں؛

س: طقس کئیب　＊　وسماؤها ابدا جنابیه
من این؟ اسبانیه؟ ـ: کلا
انا من الاردن　ـ: عفوا من الاردن؟ لا افهم

؎ انا من رباي القدس ✤ وطن السني والشمس

؎ يا، يا، عرفت، اذن يهوديه ✤ يا طعنة اهرت على كبدى

صماء وحشيه؛

"کیا سوگوار موسم ہے یہاں! آسمان ہمہ وقت ایک دھند میں لپٹا ہوا ہے تم کہاں کی رہنے والی ہو؟ اسپین کی؟ نہیں۔ میں اردن کی ہوں، معاف کرنا میں سمجھ نہیں پائی، میرا وطن قدس کی ہنستی پہاڑیاں ہیں؛ میرا وطن سراسر روشنی اور دھوپ ہے۔ اچھا، اچھا، اب میں سمجھی۔ تم یہودیہ ہو!" آہ! وہ گھاؤ جو میرے جگر تک چلا گیا، بھیانک، وحشیانہ"۔

انہیں احساسات کا ترجمان فدوی کا ایک مشہور قصیدہ "بنوۃ العرافۃ" بھی ہے جو فنی، فکری اور جذباتی اعتبار سے بہت پختہ ہے اس میں المیہ فلسطین اور فلسطینوں کی در بدری کی کیفیت کو بیان کیا ہے اور انہیں یونانی اسطورہ سسی فس (sisyphus) کی طرح قرار دیا ہے جو اپنی زندگی کے بوجھ کو اپنی پیٹھ پر لادے زندگی کے پہاڑ کو عبور کرتا ہے اور اپنی زندگی کی لایعنیت سے مقابلہ کرتا ہے اور جہد للبقاء کے جذبے سے سرشار ہو کر موت کو شکست دینے کی کوشش کرتا ہے یہ قصیدہ اردنی فوج اور تنظیم آزادی فلسطین کے فوجوں کے درمیان ۱۹۷۰ء کی غضبناک لڑائی سے براہ راست متأثر ہو کر لکھا گیا ہے جس کی اختتامی سطروں میں یہ بیان ہے کہ پیش گوئی کرنے والے نے کہا ہے کہ وہ تعویذ شر جو ۱۹۴۸ء میں باندھا گیا ہے اسے مستقبل قریب میں ایک شہسوار آئے گا اور مار بھگائے گا۔ جب عورت نے "غیب داں" سے دریافت کیا کہ وہ کب آئے گا اور وہ کون ہوگا؟ تو غیب داں نے جواب دیا:

حين يعصر الرفض   معرقة وجلجلة
لغظه اعشار هذى الارض   من جسمها بقسة

"جب مسلسل انکار ہماری سرزمین کو کھوکھلا کردے گا، اسے راکھ کا ڈھیر بنا دے گا، تو اس سرزمین کی بڑی بڑی کھائیاں اسے اس طرح کی تکلیف کا احساس دلائیں گی جو جسم کے گوشت والے حصوں سے گوشت کے ٹکڑوں کے نکالنے کے بعد ہوتی ہے۔"

اس وقت غیب داں نے عورت کو اس خطرے سے بھی آگاہ کیا کہ اس شہ سوار فوجی کی زندگی کو اپنے ہی بھائیوں سے خطرہ ہوگا۔ یہ واضح اشارہ ہے فلسطینی مزاحمتی تحریک کے خلاف عرب بادشاہوں کی مخالفت کا؛ کہتی ہے:

لكنما الرياح فى هبوبها   تقول حاذرى
الموت السبعة

(جب ہوا کا رخ بار بار یہ خوف دلائے گا کہ اپنے ان ساتوں بھائیوں سے ہوشیار رہو)

تب وہ عورت فوجی کو دیکھنے کی شدید خواہش محسوس کرتی ہے۔ اس میں امیج کے ذریعہ زرخیزی اسطورہ کے استعمال سے قوم کی نشأۃ ثانیہ پر اعتقاد کا اظہار کیا گیا ہے۔ فدوی اس خیال کو ذیل میں یوں پیش کرتی ہیں۔

وقفت عند الشرفة المغلقة   احلم بالتكوين
انتظر الآتى
اسمع نبض البذرة الملة فى
يخفق رحم الارض"

"میں اپنی ٹوٹی ہوئی کھڑکی کے پاس کھڑی ہوئی خیالات میں گم تھی بنایا

تیں کسی کا انتظار کر رہی تھی اور زمین میں دفن شدہ دانوں کی آواز جو مجھے قبل از وقت سنائی دے رہی تھی اسن رہی تھی، یہ دانے زمین کے پیٹ کو چیر کر نکلتے ہیں اور گیہوں کی بالیاں زمین کی ساری غذا کو چوس کر نکلتی ہیں۔"

یہ پیشین گوئی صحیح ثابت ہوتی ہے اور شہسوار پہونچ جاتا ہے جس کو وہ عورت خوش آمدید کہتی ہے مگر اس بہادر فوجی کو اس حقیقت کا احساس ہے کہ اس کی پشت غیر محفوظ ہے اور وہ اپنی زندگی کو خطرے میں سمجھتا ہے، اس لئے خود کو محفوظ رکھنے کے لئے اپنے محبوب کو پیچھے سوار کر لیتا ہے اس طرح اس کی پشت محفوظ رہ سکتی ہے، ان کے تمام بھائی پوری طاقت سمیت اس پر دوڑ پڑتے ہیں اور خنجر گھونپتے ہیں۔ اس بہادر کی موت کی صحیح اور بہترا امیج (Image) ان سطروں میں واضح ہوتی ہے:

" قابیل الاحمر منتصب فی کل مکان ÷ قابیل یدق علی الابواب
علی الشرفات ÷ علی الجدران
یتسلق، یقفز، یزحف ثعبانا مبینا ذو نفخ ÷ بالف لسان
قابیل یحرق بعربدہ فی الساحات ÷ قابیل الاہ مجنون یحرق روما"

" ذلیل قابیل اسے چاروں طرف سے گھیر لیتا ہے، اس کے دروازے کو کھٹکھٹاتا ہے، کھڑکی کے ذریعے اندر کود جاتا ہے، اس سانپ کی طرح جب سیدھا راستہ نہیں پاتا تو چھوٹے سوراخوں کے ذریعے اندر گھس جاتا ہے اور اپنی ہزاروں زبانوں سے پھنکارتا ہے۔ چاروں طرف فساد برپا کر دیتا ہے۔ اور یہ قابیل پاگل خدا ہے جو روم کو جلا ڈالتا ہے۔"

قصیدے کا اختتام اس پیشین گوئی کے ساتھ ہوتا ہے:

ولم تزل عرافة الریاح ﴿ تطرق بابی الحزین کلما تنفس الصباح

تقول لی! ـــــــ ﴿ حین تتم دورة الفصول

ترجعه مواسم الامطار ﴿ یطلعه آذار ـــــــ

قرمزیات الزھر والنوار ۔

" ہواؤں کا رخ جاننے والی ہر صبح میرے غمگین دروازے کو دستک دے کر مجھ سے کہتی ہے : "جب زمانہ اپنی گردش پوری کرلے گا تو موسم بارش اسے دوبارہ واپس لائے گی اور جب مارچ کا مہینہ آئے گا تو یہ پھول اور کلیاں دوبارہ کھلیں گے ۔

محولہ بالا قصیدے کے اشارات ذہن پر زور ڈالے بغیر آسانی سے سمجھ میں آجاتے ہیں، معاصر شاعروں کی طرح فدوی نے نامانوس رموز وکنایات کے استعمال سے گریز کیا ہے کیونکہ یہ عوامی شعر کے مزاج کے خلاف ہے ۔ اس میں مستعمل رموز واشارات آسانی سے اس طور پر سمجھ میں آتے ہیں کہ "الغارس" سے مراد مخلص مسیح وطن ہے "الریاح" وہ مجہول طلسم ہے جو روشنی کی لکیر کو ضیا بخشتا ہے تاکہ تاریکی کا خاتمہ ہو اور نئے مستقبل کی بشارت دیتا ہے "البیت" وہ فلسطین ہے جس پر ۱۹۴۸ء کے بعد یہودیوں کا قبضہ وتسلط ہے "ایلول" تباہی کی علامت ہے "قابیل" سے مراد برادرانہ منافقت وخیانت ہے ۔ یہ قصیدہ ان استعماری طاقتوں کے خلاف داخلی جوش واحساسات اور ولولے کا مظہر ہے جنہوں نے ایک قوم پر جلاوطنی الناکی اور دربدری کی زندگی مسلط کردی ہے ۔

فدوی طوقان دو شکستوں کی پروردہ ہیں ۔ لیکن دونوں کے اثرات کے درمیان بہت فرق ہے ۔ ۱۹۴۸ء کی پسپائی نے ان کے رنج والم میں ایک ایسی کیفیت

پیدا کر دی کہ مسئلہ وطن سے بے نیاز ہو کر اپنی ذات کی جستجو میں لگ گئیں اور ۱۹۶۷ء کی شکست نے ان پر یہ اثر ڈالا کہ وہ اپنے انفعالات یادوں اور خیالات کو چھوڑ کر ایسی شاعرہ بن گئیں جو صیہونی تسلط سے اپنے وطن کو آزاد کرانے کے لئے کوشاں ہو اور اپنے شعروں کے ذریعے آزادی کی جدو جہد کی داستان بیان کرنے لگیں۔ اور اپنی ذات اور داخلی انتقاضات کو بھول گئیں جس کی وجہ سے ان کی شعری آواز میں اصلیت (originality) اور فنی تخلیقیت پیدا ہوئی۔[29]

جون ۱۹۶۷ء کے بعد ان کے جو دو شعری مجموعے "اللیل والفرسان" اور "علی قمة الدنیا وحیدا" شائع ہوئے جو دراصل یہودی تسلط، قومی و وطنی ردعمل اور مزاحمت سے متعلق ہیں۔

اول الذکر شعری مجموعے میں شامل ایک نظم "کلمات من الضفة الغربیة" میں شاعرہ نے مغربی کنارے پر صیہونی تسلط کے نفسیاتی اور معاشرتی احوال وکوائف پر اثرات کی تصویر پیش کی ہے۔ اسی طرح "الطاعون" میں شاعرہ نے صیہونی قبضے کو طاعون کے مساوی قرار دیا ہے۔ "الطوفان والشجرة" میں شاعرہ نے جون کی لڑائی کے بارے میں غیر ملکی دشمن نشریات و اخبارات کی غلط بیانی اور جانبداری کے بارے میں لکھا ہے جس میں غیر ملکی ذرائع ابلاغ نے جون کی شکست کو عربی قوم کی انتہا قرار دیا ہے۔ شاعرہ نے اس صیہونی تسلط کو "طوفان" کے مشابہ قرار دیا ہے جبکہ درخت مقبوضہ زمین پر فلسطینی وجود کی طرف اشارہ کرتے ہیں:

---

[29] ممدوح السکاف: "رحلة فی عالم فدوی طوقان" "شئون فلسطینیة" (اغسطس ۱۹۷۴ء) ص ۸۸-۹۵۔

"ستقوم الشجرة ٭ ستقوم الشجرة والأغصان
ستنمو فی الشمس وتخضر ٭ وستورق ضحکات الشجرة
فی وجه الشمس سیاتی الطیر ٭ لابد سیاتی الطیر
سیاتی الطیر"

"یہ درخت عنقریب بڑھے گا اور اس کی شاخیں سورج کی روشنی میں دوبارہ نمو پاکر ہری بھری ہوں گی۔ جب درخت کو سورج کی روشنی ملے گی تو یہ مسکرائے گا۔ اس کی پتیاں مسکراہٹ سے پھوٹیں گی، ان درختوں اور شاخوں پر چڑیاں آکر بسیرا کریں گی مجھے یقین ہے کہ ایسا ضرور ہوگا"

اللیل و الفرسان میں مقاومت کا ایک نمونہ "قصیدۂ حمزہ" بھی ہے جس میں حمزہ صمود واستقلال کی ایک علامت بن چکا ہے وہ انتہائی صلابت کے ساتھ صہیونی تشدد کا مقابلہ کرتا ہے۔ اور مکانات کے منہدم کئے جانے کے باوجود کہتا ہے:

"یافلسطین اطمئنی ٭ انا والدار واولادی قرابین خلاصك
نحن من أجلك نحیا و نموت"

"اے فلسطین! میں، گھر اور میرے بچے تم سے چمٹے رہیں گے۔ ہم تمہارے خاطر زندہ رہیں گے اور مریں گے"

حمزہ کی شخصیت کے تعلق سے احسان عباس کی یہ رائے ہے کہ کوئی بھی انسان آج یہ محسوس کرسکتا ہے کہ حمزہ اس سرزمین میں مثبت واقعیت کا ایک نمونہ ہے جو حقیقی قوم کی نمائندگی کرتا ہے۔ اور وہ اس قابل ہے کہ اسے فن کا محور بنایا جائے"[30]

[30] احسان عباس: من الذی سرق النار، ص ۲۶۵ بحوالہ خیری منصور، "الکف والمخرز"

فدوی نے اور بہت سے قصیدوں میں فنی تجربے کئے ہیں اور یہیں تک محدود نہیں رہیں بلکہ مزید ترقی و تبدیلی کی کوشش کی اور فنی ساخت کے اعتبار سے ڈرامائی ہیئت پر قصیدے کہنے لگیں۔ اور اس فن کا استعمال کبھی متحرک گفتگو اور کبھی داخلی خود کلامی اور کبھی اخباری تضمینات اور نثری دستاویزات کے استعمال کے ذریعے کی۔ فدوی اپنی شعری اور شعوری تجربات کی کوشش میں برابر لگی رہیں اپنی فنی شخصیت کو نکھارتی اور اس میں موڑ اور تبدیلیاں پیدا کرتی رہیں۔''

فدوی کا شعری اسلوب نہ تو غموض وابہام لئے ہوئے ہے نہ حد درجہ سادگی وہ اپنی متضاد کیفیات کی وجہ سے مختلف ڈگر پر چلتی رہیں، اور مختلف انداز سے شعر کہتی رہیں۔ ان کے شعر مختلف رنگوں اور آوازوں کے ہیں، کسی ایک رنگ پر قدیم ناقدین کی طرح عمدگی کے احکام صادر کرنا ممکن نہیں ہے۔ ان کے شعری میدان کی تخصیص بھی محال ہے۔ بنت الشاطی کا خیال یہ ہے کہ "فدوی کے شعری میدان کے تعین کی کوشش میں ہم سطح کے توازن (تعادل المستوی) کے سامنے مجبور و متحیر ہو جاتے ہیں اور یہ وہ توازن ہے جو مشرقی شاعرات میں نہیں کے برابر ہے کیونکہ ان کے فکر و ذہن پر مزاج کی حدت اور جذبات کی انتہا پسندی غالب رہتی ہے"[۳۱] ان کی شاعری کا مجموعی کلی تاثر بہت گہرا ہے اسی لئے انکی ایک نظم کو پڑھ کر موشے دایان (Moshe Dayan) نے کہا تھا کہ یہ (نظم) بیس کمانڈوز کے برابر ہے۔"		(ختم شد)

۳۱۔ د۔ بنت الشاطی، "المجری الشعری للشاعرۃ فدوی طوقان"، مجلہ "الادب" القاہرہ (مایو، ۱۹۵۸)

تاخیر کے لئے معذرت

موجودہ شمارہ نومبر و دسمبر ۱۹۹۶ء کا مشترکہ شائع کیا جارہا ہے۔

ادھر کچھ عرصہ سے رسالہ "برہان" دہلی بعض ناگزیر وجوہات کی بناپر پابندیٔ وقت پر نہ شائع ہوکر دو ماہ کا ایک شمارہ بن کر ہی منظرِ عام پر آرہا ہے۔ یقیناً یہ ہم سب کارکنانِ ادارہ کی سخت ترین اور افسوسناک کوتاہی ہے جس کے لئے ہم کارکنانِ ادارہ سخت شرمندہ و مجوب ہیں۔

ہمارے ضمیر نے بار بار ہم کو ملامت کی جس کی وجہ سے ہم نے عہد کیا ہے کہ اب رسالہ "برہان" انشاء اللہ ہر ماہ پابندیٔ وقت کے ساتھ شائع کیا جائے۔ اور اس میں کسی بھی قسم کی کوئی ڈھیل و کمی نہ آنے دی جائے۔

جنوری ۱۹۹۷ء کا انشاء اللہ وقت پر شائع کرنے کا قصد ہے اور اس کے بعد ہر ماہ "برہان" ہر ماہ وقت ہی پر پابندی کے ساتھ قارئین کرام کی خدمت میں شائع ہوکر انشاء اللہ العزیز پہنچانے کا اہتمام رہے گا۔

معذرت خواہی و معافی کی درخواست کے ساتھ

محمود سعید بلالی غفرلہٗ

کارکن ادارہ ہذا

Nadwatul-Musannefeen
4136, Urdu Bazar, Jama Masjid Delhi-110 006

R.N.I. REGN. NO. 965/57
POSTAL REGN. NO. DL 11316/95
Phone 3262815

NOV-DEC 1996
Single Copy : Rs. 6
Annual Subscription Rs. 72.00

BURHAN MONTHLY

Edited by Amidur Rehman Usmani

4136, Urdu Bazar, Jama Masjid, Delhi-110006

عمیدالرحمٰن عثمانی ایڈیٹر، پرنٹر، پبلشر نے خواجہ پریس دہلی میں چھپوا کر دفتر برہان اردو بازار جامع مسجد دہلی سے شائع کیا